تاریخ ندوۃ العلماء

حصہ اول

ہندوستان کی تاریخ ساز تعلیمی واصلاحی تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے طریق فکر ومسلک کی مفصل تاریخ، جس میں اس کے پس منظر کے ساتھ اس کے مرتب کیے ہوئے تعلیمی [illegible] اور اس کی تعمیری واصلاحی خدمات کا تعارف کرایا گیا ہے، اور ندوۃ العلماء کے بانی اور اولین ناظم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے دور نظامت میں ہونے والے دس اجلاسہائے عام کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں

از

مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی

سابق مدیر تعمیر حیات

ناشر

مجلس صحافت ونشریات

پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

۱۴۳۸ھ ۲۰۱۷ء

کتابت : ظہیر احمد کاکوروی

صفحات : ۳۵۲ (تین سو باون)

طباعت : آزاد پرنٹنگ پریس نظیر آباد، لکھنؤ۔ 9415100085

قیمت : Rs. 210

فہرست عناوین

تاریخ ندوۃ العلماء

حصۂ اوّل

پیش لفظ۔ (از مولانا ابوالحسن علی ندوی) ۹ - ۱۶

پہلا باب تاریخی پس منظر ۱۷ - ۳۲

عہد وسطیٰ کا اختتام اور دور جدید کا آغاز ۱۷
نشأۃ ثانیہ ۱۸
ہندوستان میں یورپین اقوام کی آمد ۱۹
ایسٹ انڈیا کمپنی ۲۰
چند عبقری شخصیتیں ۲۱
ایک اہم سال ۲۴
حضرت سید احمد شہیدؒ ۲۵
خدنگ آخریں ۳۰

دوسرا باب ۱۸۵۷ء تا قیام ندوۃ العلماء ۱۸۹۲ء - ۳۳ - ۴۱

ملازمتوں سے بے دخل ۳۵
مقدمات اور سزائیں ۳۶
پسماندگی کے اسباب ۳۷
تجارت و صنعت ۳۹
عیسائیت کی تبلیغ ۴۰
ہندوستان کے اعلیٰ اخلاق کو تباہ کرنے کی کوشش ۴۱

تیسرا باب ردّ عمل ۴۲-۵۴

دو قیادتیں ۴۲
دارالعلوم دیوبند ۴۳
سرسید اور ان کا مکتب خیال ۴۵
ایک غلط فہمی کا ازالہ ۴۸
صاحب نظر طبقہ ۴۹
جدید تعلیم کی پہلی درسگاہ کا قیام ۵۰
نتائج ۵۱
علی گڑھ تحریک انقلابی اور ثبت دعوت کیوں نہ بن سکی ۵۲

چوتھا باب تحریک ندوۃ العلماء ۵۵-۳۸

اغراض و مقاصد ۵۵
نصاب تعلیم کی اہمیت ۵۶

قصۂ قدیم وجدید ۵۷
مسلم ممالک کا انتشار ۵۷
ندوۃ العلماء کی تحریک کی فکری اساس ۵۸
ندوۃ العلماء کے دو رہنما اندیش بانی ۶۰
علاج اس کا وہی آبِ نشاط ہے ساقی ۶۲
دینی مدارس کا حال ۶۳
ترکی ۷۴
مصر ۷۶
رفع نزاع باہمی ۸۶
مدرسۂ فیض عام کی چٹائی پر ۹۵
مولانا سید محمد علی مونگیری بانی و ناظم اول ندوۃ العلماء ۹۷
ندوۃ العلماء کا پہلا وفد ۱۰۰
پہلا اجلاس عام (منعقدہ کانپور) ۱۰۳
اجلاس ندوۃ العلماء ۱۰۴
تعارفی جد وجہد ۱۰۷
جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے استقبال و تائید ۱۰۸
نواب محسن الملک کی تقریر ۱۰۸
سرسید مرحوم کا خط ۱۱۳
ندوۃ العلماء کا عام استقبال ۱۱۵
دوسرا سالانہ اجلاس (منعقدہ لکھنؤ) ۱۱۷
نظم و شائستگی کا عجیب مظاہرہ ۱۱۸
جلسہ گاہ ۱۲۰
پہلی نشست ۱۲۱
کارروائی نشست دوم ۱۲۵
دارالافتاء کا قیام ۱۲۶
پانچویں نشست ۱۲۹
قانون حجاج ۱۳۱
شعراء کا نذرانۂ عقیدت ۱۳۲
دستور العمل کی منظوری ۱۳۲
آواز پھیل رہی تھی ۱۳۳
تجاویز کا عملی جامہ ۱۳۷
پانچواں باب ایک نئے تجربہ گاہ کی ضرورت ۱۳۹ - ۳۲۹
دارالعلوم کے بنیادی اصول ۱۴۲
عمارتوں کی تفصیل ۱۴۳
طلبہ کا نظام تربیت ۱۴۳
شرائط داخلہ ۱۴۵
نظام تعلیم و تدریس ۱۴۵
نصاب ۱۴۶
بحث و مباحثہ اور تقریر کی مشق ۱۴۸
وظائف ۱۴۹
امتحانات ۱۴۹
مذکورہ بالا تجاویز کا مقصد ۱۵۱
بجٹ ۱۵۱
مسودہ دارالعلوم اور تجاویز پر علماء اور اہل الرائے سے مشورہ ۱۵۲
مولانا حکیم عبدالحی صاحب کا بحیثیت مددگار ناظم تقرر ۱۵۳

ندوۃ العلماء کے عہدہ داران اور اراکین انتظامی	
کے تعین اوصاف	۱۵۴
سادگی اور اسلاف کی پیروی	۱۵۴
مالیات کمیٹی	۱۵۵
وفود کی روانگی	۱۵۵
بیرون ہند دعوت و تبلیغ	۱۵۷
تیسرا اجلاس (منعقدہ بریلی)	۱۵۸
نظم و انتظام	۱۵۹
اہم شرکاء اجلاس	۱۶۰
تقاریر صدر جلسہ و مندوبین اجلاس	۱۶۱
ایک اہم مقالہ	۱۶۶
مختلف انجمنوں کے سپاسنامے	۱۶۸
چند تحسینی اشعار	۱۶۸
خزانۂ محمدیہ	۱۶۹
یتیم خانہ اسلامیہ کانپور اور انجمن حمایت بیوگان	
بارہ بنکی کا انتظام	۱۷۱
دستور العمل ندوۃ العلماء	۱۷۱
ندوہ کی مخالفت	۱۷۲
ندوۃ العلماء کا چوتھا اجلاس (منعقدہ میرٹھ)	۱۷۹
خلاصہ رپورٹ ناظم ندوۃ العلماء	۱۸۰
ترتیب نصاب	۱۸۰
دارالافتاء	۱۸۱
فراہمی سرمایہ	۱۸۱
مخالفت کا بازار سرد	۱۸۲
ندوۃ العلماء کے مقاصد کی اشاعت	۱۸۳
ایثار کی ایک عجیب مثال	۱۸۳
دس لاکھ روپے	۱۸۴
یہ شادابی کی فکریں ہیں	۱۸۶
جلسۂ خاص اور اہم تجاویز	۱۸۶
سلف کی پیروی	۱۸۷
بنک اکاؤنٹ	۱۹۰
انگریزی مدارس میں مذہبی تعلیم	۱۹۱
انگریزی پڑھائی جائے	۱۹۳
دارالعلوم کہاں قائم ہو	۱۹۴
لکھنؤ میں فائدہ ہے	۱۹۴
طریق فراہمیِ سرمایہ	۱۹۶
پانچواں اجلاس (منعقدہ کانپور)	۱۹۸
اعتراضات کا جواب	۱۹۹
ندوہ کا کارنامہ	۲۰۰
دو انتہا پسند طبقے	۲۰۱
باہمی اختلافات میں کمی	۲۰۲
اجلاس میرٹھ کی تجاویز کا جائزہ	۲۰۳
بشری طاقتوں کا مجموعہ	۲۰۵
تجویز مقام دارالعلوم	۲۰۵
مدرسہ سرسبز و شاداب رہ سکے	۲۰۶
لکھنؤ کا فیصلہ	۲۰۷
تجویز افتتاح درجۂ ابتدائی	۲۰۷

علماء پر ایک الزام کا عملی جواب	۲۰۸
وفد کی لکھنؤ روانگی	۲۱۰
افتتاح دارالعلوم ندوۃ العلماء	۲۱۱
ندوۃ العلماء اور انگریز حکام	۲۱۴
دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مقصد	۲۱۸
درجۂ ادنیٰ	۲۱۸
درجۂ متوسط	۲۱۹
درجۂ تکمیل	۲۱۹
انتظام دارالاقامہ	۲۱۹
دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مدرسین اولین	۲۲۰
چھٹا اجلاس (منعقدہ شاہجہانپور)	۲۲۱
مختلف انجمنوں کے نمائندے	۲۲۱
صدارت	۲۲۲
سب سے اہم کام	۲۲۳
قحط اور طاعون	۲۲۴
جلسۂ خاص	۲۲۷
دارالعلوم قائم ہوگیا	۲۲۷
نظام تعلیم	۲۲۹
تباہی کا سبب	۲۳۱
سرسید کی شہادت	۲۳۲
تعلیم کا اہم مقصد	۲۳۳
ویسے علماء کیوں نہیں	۲۳۳
دہلی مرحوم کا آخری دور	۲۳۴
علماء کی بے اثری	۲۳۴
موجودہ نصاب اور ندوہ	۲۳۵
قوم میں پھر صحیح زندگی پیدا ہوگی	۲۳۵
روپیوں کا ڈھیر	۲۳۶
گاؤں، کھیت اور زمینیں	۲۳۷
جلسۂ عام	۲۳۷
اہم تجاویز	۲۳۹
شعراء کا خراج عقیدت	۲۳۹
کتب خانۂ ندوہ کے لئے پہلا گراں قدر عطیہ	۲۴۰
مجلس انتظامیہ کے جلسے	۲۴۱
ایک دعاگو سرپرست کی رحلت	۲۴۳
نتیجۂ امتحان	۲۴۳
آمد و خرچ	۲۴۵
گنگا اور سون کے سنگم پر	۲۴۵
ساتواں اجلاس (منعقدہ عظیم آباد پٹنہ)	۲۴۸
نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی صلح	۲۴۹
اہم شرکاء اجلاس	۲۵۰
اپنے مرکز سے باہر	۲۵۰
ندوی طلبہ کا امتحان	۲۵۲
تقریر مولوی نصیر الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا	۲۵۲
اپنی جان اور مال قربان کردوں	۲۵۳
کتب خانہ کی ضرورت و اہمیت	۲۵۴
دو انتہا پسند گروہ	۲۵۶
ندوۃ العلماء کا تجویز کردہ علاج	۲۵۶
تعاون کی اپیل	۲۵۷

حسرت آمیز گھڑی	۲۵۸
ندوہ کی طرف سے حکومت کی بدگمانی	۲۵۹
آٹھواں اجلاس (منعقدہ کلکتہ)	۲۶۱
بنگالی مسلمانوں کی پسماندگی	۲۶۱
ندوۃ العلماء کی صدا	۲۶۲
آغاز کارروائی جلسہ	۲۶۳
جلسۂ عام	۲۶۴
مختلف اجلاس اور اس کے صدر	۲۶۵
اہم تقریروں کی تلخیص	۲۶۶
مخالفین سے گذارش	۲۶۷
ندوہ کے مقاصد	۲۶۸
جلسۂ دوم	۲۶۹
دین وعلم لازم و ملزوم	۲۷۰
نونہالوں کا امتحان	۲۷۱
جلسۂ عام	۲۷۱
اہم تجاویز	۲۷۲
اجلاس پہارم	۲۷۲
تعجب خیز واقعہ	۲۷۳
ندوہ کا منشاء	۲۷۴
قواعد کتب خانہ ندوۃ العلماء اور ایک سالہ کے اجراء کی تجویز	۲۷۵
مولانا شبلی معتمد منتخب، مولانا مونگیری کے استعفیٰ کی نامنظوری	۲۷۶
ہیضہ کی وباء	۲۷۷
مولانا مونگیری کا استعفیٰ پر اصرار	۲۷۷
مولانا مسیح الزماں خاں صاحب کا قائم مقام ناظم اور مولانا خلیل الرحمٰن صاحب کا بحیثیت نائب ناظم انتخاب	۲۷۹
ماہوار رسالہ کے ایڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا شروانی	۲۷۹
نواں اجلاس (منعقدہ امرتسر)	۲۸۰
تیسرا اجلاس	۲۸۱
چوتھا اجلاس	۲۸۲
چھٹا اجلاس	۲۸۳
ساتواں اجلاس	۲۸۴
آٹھواں اجلاس	۲۸۴
نواں اجلاس	۲۸۴
زندہ دلان پنجاب کا شکریہ	۲۸۶
صرف غلط فہمی تھی	۲۸۷
دین و دنیا	۲۸۸
ہمارا اعتقاد	۲۸۹
مفید اصلاحات	۲۹۰
غنیمت ہے	۲۹۱
ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں	۲۹۲
دینی ضرورت	۲۹۳
ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کا احساس کیا	۲۹۵
نہ معجون مرکب نہ جدید فرقہ	۲۹۶
رسوم قبیحہ کی اصلاح	۲۹۷

رسوم نے اخلاق تباہ کر دیئے	۲۹۸	پنجاب کے مؤقر اخبارات کا تعاون	۳۱۴
مسلمانوں کی ترقی کا راز — اخوت	۲۹۸	دسواں اجلاس (منقد ۲۰ مارچ)	۳۱۵
اپنے سطحی علم کو بحر بے پایاں سمجھنا	۲۹۹	مخالفت کے طوفان سے گزرتے ہوئے	۳۱۵
ندوۃ العلماء کا وجود مقتضیات سے ہے	۳۰۰	سجادہ حضرت قطب دلپور کی ندوہ کی حمایت میں پیش کش	۳۱۷
ندوۃ العلماء پر قدیم و جدید کا اعتراض	۳۰۱	نئے علم کلام کی ضرورت	۳۱۷
انگریزی داں طبقہ میں ذوق علمی مفقود	۳۰۲	خواجہ حسن نظامی کی دلچسپ تقریر	۳۱۷
علماء سے گذارش	۳۰۳	اجلاس کا وقت و مقام	۳۱۸
جدید نوکری اور غلامی کا ذریعہ	۳۰۴	اہم شرکاء	۳۱۸
کاروباری گروہ	۳۰۵	اجلاس مدراس میں منظور شدہ تجاویز	۳۱۹
ہمیں بے برگ و نوا ہیں	۳۰۶	رپورٹ مولانا عبدالحی صاحب	۳۲۱
ریشم کے غلافوں میں طاق نسیاں پر دھرا	۳۰۷	خطرناک رجحان	۳۲۱
اہم تجاویز	۳۰۸	مقاصد خمسہ	۳۲۳
ماہنامہ "الندوہ"	۳۰۹	رسوم قبیحہ کی اصلاح	۳۲۴
"الندوہ" کے تیار کردہ نوجوان اہل قلم	۳۱۰	قحط رجال	۳۲۵
"الندوہ" کے مختلف ادوار	۳۱۲	ایسی بلندی ایسی پستی	۳۲۵
"الندوہ" کے علمی نتائج	۳۱۲	مختلف اجلاس	۳۲۷
اجلاس امرتسر میں دستور العمل میں ترمیم	۳۱۳	ندوۂ اعظم، علمائے عزیز	۳۲۸
		انڈکس (اشاریہ) محمد غیاث الدین ندوی	۳۳۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

(از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء)

چودھویں صدی ہجری کے آغاز اور انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں عالم اسلام تفرقہ وانتشار، پریشان خیالی اور فکری اضمحلال کی آخری منزل میں تھا، نئے تغیرات اور نئے حوادث کا سامنا کرنے اور نئے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت علمائے دین میں (جو ملت کے حقیقی قائد تھے) اور اس طریقۂ تعلیم سے جو ان کو پیدا کرنے کا واحد ذریعہ تھا، تیزی سے مفقود ہوتی جارہی تھی، مسلم معاشرہ دو متوازی طبقوں کے درمیان منقسم ہوگیا تھا، ایک طرف علمائے دین تھے، جو عربی مدارس سے قدیم طرز پر پڑھ کر نکلے تھے، دوسری طرف مغربی تعلیم یافتہ حضرات، جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ساختہ پرداختہ تھے، ان دونوں کے درمیان اجنبیت اور بیگانگی کی خلیج تھی، اور یہ خلیج دن بدن بڑھتی جارہی تھی، اندیشہ تھا کہ وہ اس حد تک پہونچ جائے کہ کسی ملانے والے پل کے بغیر ان کی ملاقات، اور کسی ترجمان کے بغیر افہام وتفہیم ممکن نہ ہو۔

معاملہ انھیں دونوں طبقوں پر منحصر نہ تھا، ملت کے مختلف مذہبی فرقے اور فقہی مسلک ایک دوسرے کو تحقیر یا خوف ونفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوگئے تھے، مناظروں اور

مجادلوں کا بازار گرم تھا، اور وہ کبھی کبھی سخت جارحانہ شکل اختیار کر لیتے تھے، معاملہ صرف اثبات و تردید تک محدود نہ تھا، بلکہ تفسیق و تکفیر تک کی گرم بازاری تھی، جہاں تک نصاب درس کا تعلق ہے، اس میں کسی کمی یا زیادتی کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی تھی، علمی حلقوں پر بالعموم "ذہنی عزلت" اور گوشہ نشینی کی فضا طاری تھی، اور جدید دنیا کے علوم و افکار اور علمی تحقیقات کے لئے کوئی روزن کھلا نہیں رہ گیا تھا، تیز رو اور تغیر پذیر زندگی سے صرف اسی وقت واسطہ پڑتا تھا، جب علماء سیاست کے راستہ پر گامزن ہوتے، مسلم معاشرہ کی پاسبانی و نگرانی اور مغربی علوم کے حملوں اور اس کے تشکیکی اثرات سے مسلمان نوجوانوں کی حفاظت کے فریضہ سے علماء کنارہ کش ہوتے جا رہے تھے، اور تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کے غاشیہ برداروں اور فکری و تہذیبی شکست کے نقیبوں کے رحم و کرم پر تھا۔

اس نازک بحرانی دور (۱۳۱۱ھ = ۱۸۹۲ء) میں وقت کے ایک روشن ضمیر، صاحب دل، ذی ہوش عالم مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی تحریک پر مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقعہ پر انجمن ندوۃ العلماء کے قیام کا فیصلہ ہوا، اور ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو اسی مدرسہ فیض عام کی دستار بندی کے موقعہ پر کانپور میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا، جس میں اہل نظر اور اہل درد، جن کو فراست ایمانی اور درد اسلامی کا حصہ وافر ملا تھا، سر جوڑ کر ایک جگہ بیٹھے، اور انھوں نے اس کا ایک حل تجویز کیا، یہ پہلا موقعہ تھا کہ جب اہل نظر اہل دل کے ساتھ، علمائے دین جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ مذہب حنفی کے علمبردار علمائے اہل حدیث کے ساتھ، زاہد و گوشہ نشین بزرگ امراء و رؤسا اور ماہرین تعلیم

کے ساتھ شانہ بشانہ اور صف بصف نظر آئے۔

اس انجمن کا نام "ندوۃ العلماء" اس لئے تجویز کیا گیا تھا کہ یہ انجمن دراصل جماعت علماء ہی کے غور و فکر اور انھیں کی دعوت پر قائم ہوئی تھی، اور وہی اس کے روح رواں تھے، اس انجمن نے جن بنیادوں پر اپنے سفر کا آغاز کیا، وہ تھیں مسلمانوں کا باہمی اتحاد، اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لئے مختلف اجتماعی اصلاحی و تعلیمی کوششوں میں ہم آہنگی، اعلیٰ سیرت و کردار کی تشکیل، رسوم قبیحہ کا استیصال، مسلمانوں کے مختلف امور و مسائل کے حل کے لئے مختلف مسلک و مشرب کے صحیح العقیدہ (اہل سنت والجماعت) علماء کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل، اسلامی اصولوں اور شریعت اسلامی کے مقاصد کو سامنے رکھ کر علوم دینیہ کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں جو عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں، علماء کی دینی سطح کو بلند اور ان کے فکر و معلومات کے افق کو وسیع کرنا، اور ایسے علماء تیار کرنا جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے اعتماد کے اہل اور احترام کے مستحق ہوں اور وہ مسلمانوں کی دینی، فکری، علمی قیادت کے اس منصب پر فائز ہو سکیں، جو عرصہ سے خالی چلا آرہا ہے۔

یہ حضرات کسی ایک علاقہ کے نمائندے نہ تھے، بلکہ مختلف مکاتب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ملت کے روز افزوں انحطاط نے ان سب کو بے چین کر دیا تھا، اور وہ آرزو مند تھے کہ یہ صورت حال تبدیل ہو، یہ وہ زمانہ ہے جب ایک طرف مغربی تہذیب پرانی روایات کو ختم کر رہی تھی، اور دوسری طرف برطانوی حکومت ملک کو اپنے شکنجہ میں زیادہ سے زیادہ کستی جارہی تھی، عیسائی مناظر بھی اسلام اور داعی اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کے خلاف اپنے خیالات کی علانیہ اشاعت میں مصروف تھے، علوم و فنون کے مرکز برباد ہو رہے تھے، کتب خانوں کو کیڑے کھا رہے تھے، اس پر طرہ یہ کہ مسلمان خود باہم دست و گریباں تھے،

ملک میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے اور مغربی تعلیم نے ذہن و دماغ کو جس طرح بدل دیا تھا، اس کی بناء پر مسلمان معاشرے پر پرانی تعلیم کی گرفت کمزور ہو گئی تھی۔

۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) سے جس تحریک کا عملاً آغاز ہوا، اور ندوۃ العلماء نے جو اصلاحی و تعمیری سفر شروع کیا، وہ کامیابی کے ساتھ جاری رہا، اس کے سالانہ اجلاس بڑی خوش اسلوبی اور بلند معیار کے ساتھ ہندوستان کے مرکزی شہروں میں منعقد ہوتے رہے اس کا آوازہ سارے ہندوستان میں بلند رہا، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ اس نے ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں لکھنؤ میں اپنے تخیل اور مقاصد کے مطابق ایک تعلیمی تجربہ گاہ اور دینی درسگاہ کا "دارالعلوم ندوۃ العلماء" کے نام سے آغاز کیا، جس نے ہر دور میں نامی گرامی فضلاء، عالم و محقق، مفکر و مصنف، ادیب و اہل قلم، اور شارح و داعی دین پیدا کئے جنھوں نے ندوہ کا نام دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہونچا دیا، اور اس کے لئے عزت و احترام کا ایک مقام محفوظ و مخصوص کرا دیا۔

ندوہ کی اس مقبولیت کے بہت سے اسباب تھے، ایک طرف وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق قوم کو شاہ راہ عمل دکھا رہا تھا، دوسری طرف اسے دینی و دنیاوی دونوں حلقوں کے سربرآوردہ اصحاب کی تائید و حمایت حاصل تھی، اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ، اور شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی دعائیں، استاد العلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھی، اور فخر المتاخرین مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگردوں کی تائید، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی پر اثر روحانی شخصیت اور علمی جد و جہد، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی موثر خطابت، مولانا شبلی کا وسیع مطالعہ، اور عالمانہ فکر و نظر، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب (استاذ نظام دکن) کی وجاہت و ہوش مندی، مولانا سید خلیل الرحمٰن صاحب

فتحپوری کی روحانیت، مولانا ابو محمد ابراہیم صاحب آروی کی دردمندی، مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی و مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی علمیت اور وسیع القلبی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) کی دل آویزی اور باوجاہت شخصیت، منشی اظہر علی صاحب رئیس کاکوری (وشیر قانونی انجمن تعلقداران اودھ) کی پختہ دینداری اور ایثار، منشی احتشام علی صاحب کاکوروی، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری کی محنت و سرگرمی، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا استقلال اور جامعیت، حسام الملک صمصام الدولہ نواب سید علی حسن خاں صاحب (فرزند والاجاہ امیر الملک نواب سید صدیق حسن خاں صاحب) کا اعتدال و دانشمندی، ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحبؒ کا واضح دینی رجحان، قدیم و جدید سے گہری واقفیت، اور ان کی دوررس اصلاحات (جنھوں نے تیئیس سال ندوۃ العلماء کی نظامت کے فرائض ادا کئے) مولوی سید ظہور احمد صاحب و مولوی محمد نسیم صاحب کی قانونی واقفیت، اور دستوری تجربہ، مولانا غلام محمد صاحب شملوی کی کامیاب و مؤثر سفارت و ترجمانی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ندوہ سے گہری وابستگی، دینی و علمی رہنمائی اور باعث عزت انتساب، مولانا مسعود علی صاحب ندوی کا عملی تعاون اور تجربہ کچھ اس طرح اس تحریک کے ساتھ تھا کہ اس کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا، اور یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ اسی ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔

لیکن ندوۃ العلماء کی تاریخ ساز تحریک کی خود تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی، اس کا قیمتی مواد، سالانہ جلسوں کی روئیدادوں، مجلس انتظامی کی کارروائی کے رجسٹروں، "حیات شبلی" "تذکرہ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ" اور "حیات عبدالحی" اور "صدر یار جنگ" کے اوراق میں منتشر تھا، ان منتشر معلومات کو جمع اور مرتب کرنے، ان نقطوں اور اشاروں، منتشر رنگوں، اور

متفرق کڑیوں سے ندوۃ العلماء کے تخیل کی پوری تصویر اور اس کی تاریخ کا پورا مرقع تیار کرنے کے لئے ایک ایسا ذہن، ایک سلیقہ مند طبیعت، ایک پُرمحبت دل، ایک مشاق قلم، اور ایک سخت کوش مصنف درکار تھا، جو اس ہفت خواں کو آسانی سے سر کر سکے، سب سے بڑی ضرورت اس کی تھی کہ وہ محض "حدیث دیگراں" کا ناقل اور کوئی ایسا پیشہ ور مصنف نہ ہو، جو اس تصنیف کے دوران عارضی طور پر اس کا لبادہ اوڑھ لیا کرتا ہے، پھر فارغ ہوتے ہی اس کو اتار کر رکھ دیتا ہے، یا کسی تمثیل کا ایکٹر جو مقررہ وقت تک کے لئے مفوّضہ کردار کامیابی کے ساتھ ادا کرتا ہے، پھر اس کو کوئی سروکار نہیں رہتا، ضرورت تھی کہ یہ کام کوئی ایسا شخص کرے جس کے ذہن نے ندوۃ العلماء کے تخیل کو جذب کر لیا ہو، اور وہ اس کے مزاج و مذاق سے ہم آہنگ بن گیا ہو۔

اس سلسلہ میں میری نظر عزیز گرامی مولوی اسحاق جلیس ندوی[1] پر پڑی جن کی ذہنی و تحریری صلاحیتوں، اور ندوۃ العلماء کی دعوت و مقاصد کی ترجمانی کے سلیقہ کا اندازہ اس کے ترجمان "تعمیر حیات" کی کامیاب ادارت اور ان کے طاقتور اور پراثر مضامین سے ہو گیا تھا، جو وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے تھے، اور جنھوں نے علمی و صحافتی دنیا میں قدردانوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔

مولوی اسحاق صاحب نے یہ کام شروع کر دیا، اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق، اپنی صحت

---

[1] مولوی اسحاق جلیس مرحوم کی ذہنی اور تحریری صلاحیتوں، ندوۃ العلماء کے ساتھ ان کے تعلق ان کی شخصیت اور زندگی کے حالات کے لئے راقم کی کتاب "پرانے چراغ" کے دوسرے حصہ کا وہ مضمون ملاحظہ ہو جو "مولوی اسحاق جلیس ندوی" کے عنوان سے ص ۲۰۱-۲۳۱ تک پھیلا ہوا ہے، افسوس ہے کہ ۸ جولائی ۱۹۶۹ء کو انھوں نے ایک مختصر علالت کے بعد چوالیس سال کی عمر میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور اپنی وصیت کے مطابق رائے بریلی میرے وطن شاہ علم اللہؒ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

وراحت کا خیال کئے بغیر اس میں سرتاپا منہمک ہوگئے، اس کے لئے انھوں نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں متعلق وغیر متعلق صفحات پڑھے، تحریک کا پس منظر تفصیل کے ساتھ دکھایا، اور ہندوستانی مسلمانوں کی کہانی ۱۸۵۷ء بلکہ اس سے پیشتر کی اصلاحی و تجدیدی تحریکوں سے شروع کی لیکن افسوس ہے کہ ان کا قلم مولانا محمد علیؒ کے دور نظامت، اور ان کی کنارہ کشی اور نئے دور کے آغاز تک پہونچا تھا کہ خود ان کی زندگی کا ورق الٹ گیا، اور یہ کام پہلی جلد پر ختم ہو کر نامکمل رہ گیا، لیکن ایک یہ جلد بھی ان کی محنت، حسن ترتیب، اور سلیقۂ تصنیف کی گواہ ہے، اور انشاء اللہ وہ ان کی ایک اچھی تصنیفی یادگار بن کر باقی رہے گی[1]

مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں متنوع اور وسیع مآخذ سے استفادہ کیا ہے، تبصرہ اور تاثر میں توازن اور اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے، جو ندوی فکر کا امتیاز ہے، ندوۃ العلماء سے پیشتر کی اور اس کی معاصر تعلیمی تحریکوں اور اداروں پر بھی جو کچھ لکھا ہے، وہ (ہمارے اندازہ کے مطابق) گروہی عصبیت اور جماعتی تعصب سے پاک ہے، تحریک ندوۃ العلماء کے آغاز کے بیان میں کسی ملک و تہذیب اور ذہن کی تعمیر کے سلسلہ میں نصاب تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے، اس کو اچھی طرح واضح کیا ہے، اور اس بارے میں قدیم نصاب کے تربیت یافتہ فضلاء کی قیمتی شہادتیں جمع کر دی ہیں، دوسرے اسلامی ممالک کے طریقۂ تعلیم اور نصاب درس کا بھی جائزہ لیا ہے، ندوۃ العلماء کے بانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کے خیالات و مقاصد کو اچھی طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی مزاجی خصوصیات اور "ترکیب ذہنی" کو ناظرین کے سامنے

---

[1] کتاب کی دوسری جلد کی ترتیب کا کام مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کے فاضل رفیق مولوی شمس تبریز خاں کے سپرد کیا گیا اور انھوں نے بھی اس کو محنت و خوش اسلوبی اور اپنی تحریری و تصنیفی مہارت کے ساتھ (جس کی شاہد ان کی متعدد کتابیں ہیں) انجام دیا۔

لانے کی حقیقت پسندانہ کوشش کی ہے، ندوۃ العلماء کی تحریک کی پیش رفت اس کے عام استقبال اور ملک میں اس کے اثرات پر روشنی ڈالی ہے، ندوۃ العلماء کی روئیداد وں اور دفتری کاغذات سے جو ہر ایک کی دسترس میں نہیں ہیں، اور جن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے، پورا فائدہ اٹھا کر اس کے ضروری حصہ کو محفوظ کر دیا ہے، اسی طرح ندوہ کے سالانہ جلسوں کی اہم تقریروں کے اہم اقتباسات دے کر ان کو بھی محفوظ اور تاریخ کا جزء بنا دیا ہے، ندوہ کی مخالفت اور اس کی تائید کے سلسلہ میں قیمتی دستاویزی مواد بھی اس کتاب میں آگیا ہے، اور "ندوۃ العلماء اور انگریز حکام" کے عنوان پر جو بہت سے ہمدردوں کے ذہن میں خلجان کا باعث ہوتا ہے، ایک مفید تشریحی نوٹ دے دیا ہے، غرض یہ کتاب (اس رقبۂ زمانی کے اندر جس پر یہ محیط ہے) ہر طرح سے جامع، معلومات افزا اور مورخانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ اور ایک وسیع اور جامع تحریک کی مستند روئیداد ہے، ندوۃ العلماء کے ایک خادم اور ذمہ دار کی حیثیت سے اس کو ملک کے سامنے پیش کرنے پر میرا دل مسرت و شکر کے جذبے سے معمور، اور جواں سال اور صاحبِ کمال مصنف اور ندوۃ العلماء کے ایک ہونہار خادم کی وفات کی یاد سے اور اس سے جو خلا پیدا ہوا اس کے خیال سے رنجور ہے، اور اس شعر کا اعادہ کرتا ہے، جو اپنی تصنیف "پرانے چراغ" حصہ دوم میں ان کے تذکرے کے آخر میں لکھا تھا ؎

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ حسنی
رائے بریلی

۱۳ رجب المرجب ۱۴۰۳ھ
۲۸ اپریل ۱۹۸۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

تاریخی پس منظر

عہد وسطیٰ کا اختتام اور دور جدید کا آغاز

پندرھویں صدی عیسوی ایک ایسا دور ہے، جس میں زمانۂ وسطیٰ کا اختتام اور عہد جدید کا آغاز ہوتا ہے، یہ تبدیلی کا دور ہے، اس صدی کے نصف اخیر میں جو مختلف تبدیلیاں ہوئیں آنے والے دور پر ان کا انقلاب انگیز اثر پڑا، اس صدی میں مشرق و مغرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا، لیکن ان دونوں کی تاریخ متضاد طریقے پر ڈھل رہی تھی، دونوں کا سمت سفر، پیش رفت اور منزل بالکل جدا جدا تھی، مغرب عروج و اقبال، ترقی و روشنی کی طرف گامزن تھا تو مشرق زوال و ادبار، پستی و تاریکی کی طرف رواں دواں، انسانی تہذیب کی یہ ایک ایسی منزل تھی، جہاں پہونچ کر پرانا نظام حیات دم توڑ دیتا ہے قدیم تہذیبی سرمایہ، روایات، طرز فکر اور قدریں وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں، اب کاروان حیات نئے انداز سے ترتیب دیا جانے لگا، ایک طرف یورپ کا صنعتی انقلاب سماج اور سیاست کی بنیادیں بدل دیتا ہے، تو دوسری طرف سائنس کی ترقیوں کے ذریعے زمان و مکان کی پنہائیاں سمٹ جاتی ہیں، قوانین فطرت کی تسخیر سے انسان کے قبضہ میں ایسی قوت آجاتی ہے جو گھر کی چہار دیواری سے لے کر میدان جنگ تک کے نقشے بدل دیتی ہے، فرانسیسی انقلاب کے زیر اثر قومیت، آزادی اور جمہوریت کے بیتاب عناصر متحرک ہو جاتے ہیں، علمی ترقی کی رفتار اس قدر

تیز ہو جاتی ہے کہ بقول ایک مفکر کے "کتاب پریس میں ہوتی ہے کہ نظریات بدل جاتے ہیں" مغرب اسی تیزی سے بدل رہا تھا، مگر مشرق عظمتِ گذشتہ کی داستان سرائی میں مشغول تھا۔

نشأۃ ثانیہ

نئی زندگی کے لئے یورپ میں لفظ (RENAISSANCE) استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں "زندگی کی طرف لوٹنا" یورپ میں نئی زندگی کب سے شروع ہوئی اس کے لئے کوئی قطعی حد مقرر نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کی لہریں عرصۂ دراز سے اٹھ رہی تھیں مگر سولہویں صدی میں یہ اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گئی، اس نئی روشنی کا اثر یورپ کے علم، صنعت و حرفت اور مذہبی خیالات پر پڑا، تاریخ انسانی کا یہ وہ اہم ترین زمانہ ہے جس کا اثر صدیوں پر نقش ہے اسی دور میں یورپ خوابِ غفلت سے بیدار ہوا، اور تیز رفتاری سے اس نے اپنی غفلت و لاعلمی کے طویل زمانہ کی تلافی کے لئے جد و جہد شروع کر دی، وہ ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کی طرف گامزن ہوا، وہ نئی دنیا کی دریافت، کائنات کے اسرار کے انکشاف اور طبعی قوتوں کی تسخیر میں رات دن مصروف تھا، اس نے مختصر سی مدت میں علم و فن کے ہر شعبہ میں محقق مجتہد اور موجد پیدا کئے ۱۴۵۰ء میں یورپ میں مطبع کی ایجاد نے کتابوں کی اشاعت اور خیالات و نظریات کے فروغ میں سہولت پیدا کی، جہازی قطب نما، (MARINER'S COMPASS) _____

_____ اور بارود کی ایجاد ہوئی کوپرنیکس (COPERNICUS) نے یہ دریافت کیا کہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں، گیلی لو (GALILEO) نے بھی اس دریافت میں حصہ لیا نیوٹن (NEWTON) نے زمین اور دوسرے سیاروں کی کشش دریافت کی، بارتھلمیو (BARTHOLOMEW) کولمبس (COLUMBUS) اور واسکوڈی گاما (VASCO DE GAMA) نے نئے نئے اقلیم اور بحری راستے دریافت کئے، اس دور میں اقوام عالم کی تاریخ از سر نو ڈھل رہی تھی، اس زمانہ کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا، یورپی اقوام

نے اس دور کے ایک ایک منٹ کی قدر کی اور صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کرلی مگر مشرق نے فرصت وتیاری کا طویل ترین زمانہ ضائع کردیا، علم وصنعت میں پسماندگی، نئی ایجادات اور ترقیوں سے بیگانگی اس کا طرۂ امتیاز تھا، یہ عمومی انحطاط اس قدر ہمہ گیر تھا کہ مشرق فنون جنگ میں بھی مغرب سے پچھڑ گیا، اس میدان میں بھی یورپ نے اپنی ایجادات، اجتہاد اور تنظیم کی بدولت غلبہ حاصل کرلیا، ۱۷۷۴ء میں عثمانی افواج اور ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں ہندوستانیوں کی شرمناک شکست اس تفوق کا روشن ثبوت ہے، یہ دو جنگیں فاتح اور مفتوح قوموں کے عروج وزوال کا نقطۂ آغاز تھا۔

ہندوستان میں یورپین اقوام کی آمد

سولہویں سترھویں اور اٹھارویں صدی میں مختلف یورپی اقوام نے دور دراز ممالک میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں اور اپنی سلطنت وتجارت کو وسیع کیا، اس زمانہ کو نوآبادیات کا زمانہ کہا جاتا ہے، نوآبادیاتی نظام دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس میں یورپ کی اقوام عالم اور دنیا کے دور دراز خطوں پر سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی بالادستی کا دور شروع ہوا، سولھویں صدی کے آغاز میں بہت سے سمندری راستے دریافت ہوئے، کولمبس نے امریکہ دریافت کیا، واسکوڈی گاما ہندوستان آیا، میگالن نے ساری دنیا کا چکر لگایا، پرتگیز، فرانسیسی، ڈچ اور انگریز نوآبادیات کی طرف متوجہ ہوئے، اہل اسپین اور پرتگیز جنوبی امریکہ گئے، انگریز اور فرانسیسی تعیلہ گئے، اہل پرتگال چین گئے، پرتگیز ڈچ فرانسیسی اور انگریز ہندوستان آئے، یورپی قوموں میں نوآبادیات کے لئے کشمکش پیدا ہوئی، ایک نے دوسرے کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی، باہمی جنگیں ہوئیں، اس سلسلے میں کرناٹک کی پہلی اور دوسری لڑائی ۱۷۵۰ء اور تیسری لڑائی ۱۷۵۶ء مشہور ہے، کرناٹک کی تیسری لڑائی کے بعد فرانس کا زوال شروع ہوگیا صرف پانڈیچری اور چند نگر کا علاقہ اس کے پاس رہ گیا، اور پورے ہندوستان پر انگریزوں کے غلبہ کی راہ ہموار ہوگئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

۲۴ ستمبر ۱۵۹۹ء انگلستان کے لئے ایک مبارک دن تھا، جبکہ لندن کے چند تاجروں نے ایک کمپنی قائم کی، ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ملکۂ الزبتھ نے شاہی فرمان کے ذریعہ اس کمپنی کو بلا شرکت غیرے مشرقی ممالک میں تجارتی حقوق عطا کئے، سترھویں صدی کے آغاز میں کمپنی کی طرف سے کچھ انگریز تاجر ہندوستان پہونچے اور ۱۶۱۲ء میں انھوں نے مغربی ساحل پر بمقام سورت کاروبار شروع کیا، شہنشاہ جہانگیر کا دورِ حکومت تھا، نو وارد تاجروں نے جن رعایتوں کی درخواست کی بارگاہِ سلطانی سے بخوشی عطا ہوئیں، ۱۶۱۶ء میں کمپنی نے سوتی پٹنم میں کارخانہ کھولا، ۱۶۴۰ء میں مقامی راجہ سے مدراس کی زمین لگان پر حاصل کی اور وہاں قلعہ تعمیر کیا، بنگال میں تجارت کرنے کی اجازت شہنشاہِ شاہجہاں سے ۱۶۳۴ء میں حاصل کی، ۱۶۴۷ء میں ہگلی میں کارخانہ قائم ہوا جو ۱۶۹۰ء میں کلکتہ منتقل ہوگیا، بمبئی کا غیر اہم جزیرہ نما کبھی پرتگال کے قبضہ میں تھا، چارلس دوم نے جب ایک پرتگالی شہزادی سے شادی کی تو پرتگال کی طرف سے ۱۶۶۲ء میں یہ جزیرہ دلہن کے جہیز میں ملا، چارلس نے آمدنی کے خیال سے ۱۶۶۸ء کو یہ اراضی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۰ پونڈ سالانہ لگان پر اٹھادی، اس طرح ہندوستان کی تینوں باموقع بندرگاہیں، کلکتہ، بمبئی، مدراس ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ آگئیں اور پھر ملک میں کمپنی جس طرح پھیلی وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب عالمگیر کے طویل عہدِ حکومت میں انگریز آہستہ آہستہ اپنی تجارت کو فروغ دیتے رہے، یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک انھوں نے ہندوستان کے ساحلی علاقہ پر اپنا اثر رسوخ جمالیا، مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں قلعوں کی تعمیر کرائی، ان پریسیڈنسیوں میں شہری حکومت بھی انگریزوں کی تھی، وہ ٹیکس وصول کرتے، مقدمات کا فیصلہ کرتے، غرض سات سمندر پار سے آئی ہوئی یہ قوم اس ملک میں اپنی بنیادیں مضبوط کر رہی تھی، اور دوسری طرف یہاں کے مسلمان اس خطرے

اور اس کے دور رس نتائج کے احساس و فکر سے بے نیاز اندرونی بدنظمی، انتشار، عیش و عشرت اور باہمی کشمکش کا شکار تھے۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء یعنی اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ہوئی، یہ زمانہ یورپ کی بیداری اور تعمیر و ترقی کا خاص دور ہے لیکن بدقسمتی سے اورنگ زیبؒ کے جانشین نااہل، پست ہمت اور عیش پسند نکلے، وہ یورپ کے خطرات کا مقابلہ اور امتِ اسلامیہ کی حفاظت کرنے کے اہل تو کیا ثابت ہوتے اپنے ملک و سلطنت کی حفاظت بھی نہ کر سکے اور بالآخر اپنی نااہلی، کمزوری اور نااتفاقی سے انگریزی حکومت کے قیام و استحکام، انگلستان کے ثروت و تمول اور صنعتی انقلاب کا باعث ہوئے اور بالواسطہ اکثر اسلامی ممالک کی غلامی کا سبب بنے۔

چند عبقری شخصیتیں

مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں بھی انفرادی عزیمت و عبقریت کا سراغ ان کی تاریخ میں ملتا ہے، انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے، مگر رفتہ رفتہ وہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرتے جا رہے ہیں اور اگر صورتِ حال یہی رہی تو ایک وقت وہ آسکتا ہے جب کہ انگریز پورے ملک پر قابض ہو جائیں گے، اس کو میسور کے حاکم حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان اور بنگال کے حکمراں سراج الدولہ کی دور بین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا، حیدر علی کی پوری زندگی انگریزوں سے جنگ میں گزری حیدر علی اور ٹیپو سلطان اٹھارویں صدی عیسوی کی اسلامی تاریخ کے آخری ابواب تھے، اس وقت یورپ کی سرزمین میں نپولین کی آتش فشانی زلزلہ برپا کر رہی تھی، انگریز یورپ اور ہندوستان دونوں اقلیموں میں فرانسیسیوں سے برسرپیکار تھے۔

حیدر آباد اور کرناٹک نے انگریزوں کا اور میسور نے فرانسیسیوں کا ساتھ دیا، باہم وہ

معرکۂ آرائیاں ہوئیں کہ اگر قسمت انگریزوں کے پرچم پر سایہ فگن نہ ہوتی تو اس ملک پر یونین جیک لہراتا نظر نہ آتا۔

ہندوستان کے نپولین سلطان ٹیپو کے فرانس کے نپولین سے براہِ راست تعلقات تھے، نپولین میدان سر کرتا ہوا یورپ سے مصر تک آچکا تھا خیال تھا کہ اب وہ ہندوستان میں داخل ہی ہونا چاہتا ہے کہ دفعتاً دونوں کے بخت و اقبال نے کنارہ کشی اختیار کرلی، شروع میں کامیابی بھی ہوئی، مگر اپنے بعض رفقاء کی غداری، لارڈ ولائیو کی حکمت عملی، انگریزوں کی تربیت یافتہ فوج اور اسلحہ کے مقابلہ میں ۱۷۵۷ء کی مشہور جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی، ہندوستان کی غلامی کا فیصلہ ہوگیا، انگریزی اقتدار کی رفتار روز بروز تیز سے تیز تر ہوگئی، برگ ایڈمیز لکھتا ہے:۔

(۱) جنگ پلاسی کے بعد بنگال کا مالِ غنیمت لندن میں آنا شروع ہوا اور اس کا نتیجہ بھی بہت جلد رونما ہوا، اتنا بڑا صنعتی انقلاب جس کے اثرات آج دنیا کے گوشے گوشے میں نمایاں ہیں، شاید وجود ہی میں نہ آتا، اگر پلاسی کی لڑائی نہ ہوئی ہوتی، کیونکہ ہندوستان ہی کا خزانہ اس کا محرک اور مدد معاون ہوا۔

(۲) جب ہندوستان کا خزانہ انگلستان میں امنڈ امنڈ کر آنا شروع ہوا تو ایجاد کی تحریک میں بہت جلد ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔

(۳) جب سے دنیا وجود میں آئی ہے، شاید کبھی روپے سے اتنا منافعہ حاصل نہیں ہوا جتنا ہندوستان کے مالِ غنیمت سے ہوا کیونکہ پچاس برس تک انگلستان کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا۔ سر ولیم ڈگبی لکھتا ہے۔

"پلاسی کی لڑائی سے پہلے جب تک ہندوستان کے خزانے ڈھل ڈھل کر انگلستان نہیں آئے تھے، ہمارے ملک کا ستارہ عروج پر نہیں تھا، یہ حقیقت ہے کہ انگلستان کی صنعتی ترقی بنگال کی بے شمار دولت اور کرناٹک کے خزانوں کی بدولت ہوئی، ہندوستان پر تصرف حاصل کرنے سے پہلے انگلستان کی حیثیت نہایت معمولی تھی، یہ سونے کی چڑیا

ہاتھ لگی اور پشتہا پشت کے خزانے انگلینڈ پہونچے تو کارخانوں کی بنیادیں شروع ہوگئیں،
چمنیاں دھواں اگلنے لگیں، ۱۸۰۰ء تک ہندوستان کی صنعت روبزوال ہوئی، اور
انگلستان میں کپڑے بننے کی صنعتی آسانیاں نکل آئیں، گھنٹوں کے کام منٹوں میں ہونے لگے۔

ہندوستان کو غیر ملکی خطرات سے پاک کرنے کی جس جرأت و حکمت سے سلطان ٹیپو نے جدوجہد کی وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے، حیدر علی اور سلطان ٹیپو دونوں باپ بیٹوں نے بمشکل ۳۵ سال حکومت کی لیکن ان ۳۵ برسوں میں ان کے لئے ہر برس کا ختم کرنا گویا رستم کا ہفت خواں طے کرنا تھا، ایک طرف کرناٹک، دوسری طرف حیدرآباد، تیسری طرف مرہٹے چوتھی طرف انگریز، ایک بہادر بیک وقت چار پہلوانوں سے نبرد آزما تھا، علاوہ ازیں اندرونی سازشوں کا جال الگ بچھا ہوا تھا، جس میں یہ اسلامی سلطنت پھنسی ہوئی تھی۔

سلطان ٹیپو نے اپنی بالغ نظری اور غیر معمولی ذہانت سے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ انگریز اس طرح ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست ہضم کرتے رہیں گے اور کوئی منظم طاقت ان کے مقابلہ میں نہ آئی تو آخر کار پورا ملک ان کا لقمۂ تر بن جائے گا، چنانچہ انھوں نے انگریزوں سے جنگ کا فیصلہ کیا اور پورے ساز و سامان، وسائل اور فوجی تیاریوں کے ساتھ ان کے مقابلہ میں میدان میں آگئے۔

سلطان ٹیپو نے ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں، نوابوں کو انگریزوں سے جنگ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، اس مقصد سے انھوں نے سلطان ترکی سلیم عثمانی اور دوسرے مسلمان بادشاہوں اور ہندوستان کے امراء سے خط و کتابت کی، زندگی بھر انگریزوں سے سخت معرکہ آرائیاں کیں، قریب تھا کہ انگریزوں کے سارے منصوبے پر پانی پھر جائے اور وہ اس ملک سے بے دخل ہو جائیں، مگر انگریزوں نے جنوبی ہند کے امراء کو اپنے ساتھ ملالیا، اور آخر کار اس مجاہد بادشاہ نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹنم کے معرکہ میں شہید ہو کر سرخروئی حاصل کی، انھوں نے انگریزوں کی غلامی اور اسیری

اور ان کے رحم و کرم پر زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دی اس کا مشہور تاریخی مقولہ ہے کہ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے" جب انگریز جنرل نل کو سلطان کی شہادت کی خبر ملی تو اس نے ان کی نعش پر کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے کہ "آج سے ہندوستان ہمارا ہے"۔

ایک اہم سال

حکیم مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ "دنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء کا سال بے حد اہم ہے، اسی سال سلطان ٹیپو کو شکست ہوئی، اسی سال جنگ تعرینوں ہوئی جس میں ترکی کا بحری بیڑہ تباہ ہو گیا، اور ایشیا میں اسلام کا انحطاط انتہا کو پہونچ گیا" وہ جوئے آب جو دریائے تند و تیز بن کر انگریزوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانے پر تلی تھی، اس کے سوتے اپنوں ہی کی ناقدر شناسی اور عدم تعاون کی وجہ سے خشک ہو گئے اور آنے والے ادوار میں یہ خطرہ حقیقت بن کر سامنے آگیا کہ اب اس ملک میں کوئی ایسی طاقت نہیں جو اس ملک میں انگریز استعمار کے روز بروز جمتے ہوئے قدموں کو متزلزل کر سکے، حصول اقتدار، استحصال دولت اور اقتصادی برتری کے لئے انگریزوں جو نفرت انگیز، انسانیت سوز مظالم کئے ان سفاکانہ مظالم نے عام مسلمانوں بالخصوص علماء میں آزادی کی عام تڑپ پیدا کر دی، پہلے یہ خیال تھا کہ بادشاہ، ریاستوں کے نواب و رؤساء اس بدیسی طاقت کا قلع قمع کر دیں گے، مگر پلاسی، بکسر اور روہیلکھنڈ، میسور، مدراس، دکن اور بمبئی وغیرہ کی لڑائیوں میں ناکامی نے مایوسی پیدا کر دی ۱۸۰۳ء میں جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ نے بادشاہ دہلی سے ملکی انتظام کا پروانہ بزور لکھوا کر ملک میں اعلان کرا دیا کہ: خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، حکم کمپنی بہادر کا تو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا فتویٰ دیا اور مسلمانوں کو آزادئ ہند کے لئے آمادہ کرنا ضروری سمجھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے بعد سراج الدولہ اور ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹنم کے معرکہ میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد ہندوستان کے حکمراں طبقہ میں کوئی ایسا بہادر نہ رہا جو وقت کے دھارے کو موڑ دیتا حضرت شاہ ولی اللہؒ اور پھر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے ارشاد و تربیت سے جس انقلابی جماعت کی بنیاد ڈالی تھی، آخر کار وہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے جاں نثار رفقاء کی صورت میں ظاہر ہوئی، ملک کے حالات کسی مرد غیب کے منتظر تھے، کیونکہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان سیاسی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے زوال کی آخری حد تک پہونچ گیا تھا، سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا، سارے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط تھا، بچا کھچا ملک رئیسوں اور سرداروں کے قبضہ میں تھا، جو یکے بعد دیگرے شکست کھا کر اپنے اپنے علاقے انگریزوں کے حوالے کرتے جارہے تھے، سلطنتِ مغلیہ کے فرمانروا شاہ عالم جن کے عہد میں حضرت سید احمد شہیدؒ پیدا ہوئے، صرف نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، دکن سے لے کر دہلی تک سارا علاقہ مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا، پنجاب سے لے کر افغانستان کی حدود تک سکھوں کا راج تھا جن کی دستبرد سے ہندوستان کا شمالی اور وسطی حصہ بھی محفوظ نہ تھا، مسلمانوں کی سیاسی ساکھ گر چکی تھی، ان کا کوئی قائد اور شیرازہ بند نہ تھا، مسلمانوں کی اخلاقی حالت اتنی گر چکی تھی کہ فسق و معصیت کی بہت سی باتیں آداب و تہذیب میں داخل ہوگئی تھیں، اربابِ نشاط کا ہر طرف دور دورہ تھا، امراء اور متوسط طبقہ سے لے کر غرباء تک اسی معاشرت کا شکار تھے، احکامِ شریعت کو بالائے طاق رکھ کر خود ساختہ رسوم اور بدعات کو دین کا جز بنا لیا گیا تھا، قرآن مجید پہیلیاں سمجھا جانے لگا، جس کا سمجھنا اور سمجھانا، اس پر غور و تدبر کرنا غیر علماء کے لئے ناممکن اور شجر ممنوع قرار دے دیا گیا تھا

شجاعت و دلیری، حوصلہ مندی، غیرت و حمیت، اور دوسری اعلیٰ صفات حقیر مقاصد میں صرف ہو رہی تھیں۔

ایسے وقت میں کسی ایسے شخص اور جماعت کی ضرورت تھی جو دین، علم اور صلاحیت کے اس سرمایہ سے وقت پر کام لے جو خانقاہوں کا حال اور درس گاہوں کا قال، وہاں کی حرارت اور یہاں کی روشنی سارے ملک میں عام کر دے جس کے جلو میں چلتی پھرتی خانقاہیں ہوں، اور دوڑتے بھاگتے مدرسے گھوڑوں کی پیٹھ پر عالم اور محرابوں میں مجاہد ہوں، جو شخص ان اوصاف کا جامع ہو اس کو دین کی اصطلاح میں "امام" کہتے ہیں، اور یہ مقام تیرھویں صدی ہجری کے تمام اہلِ کمال اور مشاہیر رجال کی موجودگی میں حضرت سید احمد شہیدؒ کو حاصل تھا۔"[1]

سید احمد شہیدؒ دائرۂ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں صفر ۱۲۰۱ھ مطابق نومبر ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے، ایام طفلی میں تحصیل علم سے آپ کو زیادہ رغبت نہ تھی، مکتب کی تعلیم کے بعد اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ تلاشِ روزگار میں لکھنؤ چلے گئے، اس کے بعد تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی خدمت میں دہلی پہونچے، انھوں نے اپنے بھائی شاہ عبدالقادرؒ کے پاس بھیجا کچھ عرصہ تک ان سے تعلیم حاصل کی، بائیس سال کی عمر میں شاہ عبدالعزیزؒ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی اور اجازت پائی اور اس کے کچھ عرصہ بعد رائے بریلی واپس تشریف لائے، ۱۸۱۰ء کے قریب آپ نے اپنی جنگی تربیت اور عملی تجربے نیز نواب امیر خان کو صحیح راہ پر لگانے کے خیال سے ان کی فوج میں شرکت کی اور چھ سات سال اس جنگی ماحول میں فوجی ترکتازیوں میں بسر کئے، ۱۸۱۶ء کو آپ دوبارہ دہلی تشریف لے گئے، یہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا، انہی دنوں مولانا عبدالحیؒ داماد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ مولانا شاہ اسماعیلؒ برادر زادہ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ صاحب کے مشورہ سے آپ سے

---

[1] "سیرت سید احمد شہیدؒ" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، باختصار۔

بیعت ہوئے۔

ان دونوں کی بیعت سے سید صاحبؒ کو بڑی تقویت پہونچی، حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک کا آغاز اصلاحی اور تبلیغی دوروں سے کیا، آپ کی اصلاحی کوششوں سے لاکھوں انسانوں کی زندگی بدل گئی، مساجد میں رونق آگئی، اللہ اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے نام کا چرچا ایمان میں تازگی، اتباعِ سنت کا شوق، اسلام کا جوش اور شرک و بدعت سے نفرت پیدا ہوگئی، آپ نے ایسے زمانہ میں حج کی زور شور سے تبلیغ کی، اور اس فرض کو زندہ کرنے کے لئے عملی قدم اٹھایا اور سات سو سے زائد رفقاء کے ہمراہ کلکتہ سے ۱۸۲۱ء میں حج بیت اللہ کا سفر کیا، جب کہ یہ اہم رکن علماء کے فقہی عذر کی بنا پر کیسر متروک یا غفلت کا شکار ہوگیا تھا۔

ہندوستان میں اسلام کی بے کسی اور اہل علم و دین کی بے بسی کا جو حال تھا، اس کا پورا نقشہ سید احمد شہیدؒ کی آنکھوں میں تھا، غیر اسلامی قوتوں کا غلبہ آپ دیکھ رہے تھے، خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی مظلومیت ناقابلِ برداشت حد تک پہونچ چکی تھی، وہ بے عزتی کا شکار تھے، لاہور کی مشہور شاہی مسجد کے حجروں میں شاہی اصطبل تھا، متعدد مقامات پر اذانوں پر پابندی تھی، مسلمانوں کی ذلت و محکومیت اور ایسی غیر مسلم طاقت کو جس کو مسلمانوں سے خصوصی عناد تھا، آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، یہ دہلی کے مرکز اور پورے شمالی مغربی ہندوستان کے لئے نیز صوبہ سرحد اور افغانستان کے لئے بھی ایک مستقل خطرہ تھا، سید صاحبؒ اور ان کے رفقاء کی یہ بڑی دور بینی اور سیاسی بصیرت تھی کہ انھوں نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں میں پنجاب کو اوّلیت دی[1]۔

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط، مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی اور انتشار اور اسلام کے

---

[1] "سیرت سید احمد شہیدؒ" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی باختصار۔

زوال کے مشاہدہ نے آپ کو بے چین کر دیا آپ کے نزدیک اعلائے کلمۃ اللہ اور ممالک اسلامیہ کے تحفظ کی ضرورت، غیور اور فرض شناس مسلمانوں سے جہاد کا مطالبہ کر رہی تھی، ان حقائق نے آپ کے دل میں جہاد کا عزم راسخ پیدا کر دیا، سید صاحبؒ کے نزدیک اگرچہ مقصود اصلی ہندوستان تھا، جیسا کہ آپ کے بہت سے خطوط سے ——— جو آپ نے ہندوستان کے والیانِ ریاست کو لکھے، سرحد سے ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراجہ دولت رائے سندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے ایک خط میں لکھا:۔

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاجدار اور سودا بیچنے والے تاجر، سلطنت کے مالک بن گئے ہیں، بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور عزت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے، جو حکومت و سیاست کے مرد میدان تھے، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اس لئے مجبوراً چند غریب و بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے، یہ اللہ کے بندے دنیا دار اور جاہ طلب نہیں ہیں، محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں، مال و دولت کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں ہے، جس وقت ہندوستان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر اپنے نشانہ تک پہونچ جائے گا، حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہوگی ہم کمزوروں کو والیانِ ریاست اور بڑے بڑے سرداروں سے صرف اسی بات کی خواہش ہے کہ جان و دل سے اسلام کی خدمت کریں اور مسندِ حکومت برقرار رکھیں"[1]

---

[1] ماخوذ از سیرت سید احمد شہید حصہ اول۔

آپ نے بیرون ہند کے مسلمان فرمانرواؤں کو جو خطوط لکھے ان سے بھی یہ مقصد واضح ہوتا ہے لیکن پنجاب میں جس پر رنجیت سنگھ کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی تھی اور مسلمان ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے ان کی فوری توجہ ضروری تھی، نیز فوجی مصالح اور سیاسی تدبر کا تقاضا تھا کہ یہ مہم ہندوستان کے شمالی مغربی سرحد سے شروع کی جائے۔

سید احمد شہیدؒ جس نتیجے پر پہونچے تھے، وہ وقت کے لحاظ سے بہت نازک تھا، قوم کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا، مایوسی دامن پکڑ چکی تھی، حرب و ضرب کی استطاعت رکھنے والے بازو مضمحل ہو گئے تھے، حیدر علی، ٹیپو سلطان اور نواب امیر خاں جیسے دلیر کوشش کے باوجود انگریز کی طاقت اور اس کے مکر کے حربوں سے ختم ہو گئے تھے، قوم کا بلند مقام عنصر دہلی اور لکھنؤ میں شاعرے کر رہا تھا، یا عیش پرستی کی داد دے رہا تھا، عوام رضا بقضا بیٹھ گئے تھے، بقول ڈپٹی نذیر احمد مرحوم "پیسہ گری کے وہ تمام فن اور کرتب جو کبھی سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ کیا کرتے تھے، اب تعزیہ داری کے جلوس کے سوا کسی اور مطلب کے نہ رہے تھے" بااثر طبقہ کو بالکل احساس نہ تھا کہ ہم کیا تھے، اور کیا ہو گئے ہیں، صرف ملک کا کوئی خاص حصہ اغیار کے تسلط میں نہ آیا تھا، بلکہ تمام ملک پر انگریز حاوی ہو چکے تھے، صرف پنجاب تھا، جو انگریزوں کے حلیف اور ان کے دست و بازو سکھوں کے قبضہ میں تھا، آپ نے یہی سوچ کر سکھوں سے ٹکرانا بہتر سمجھا ہوگا کہ سرحد کے مجاہدین سے کام لے کر پہلے سکھوں کو راستہ سے ہٹایا جائے، جو پنجاب کے مسلمانوں کو مٹا رہے ہیں اور انگریزوں کو سپاہی فراہم کرتے ہیں، پھر آگے قدم بڑھا کر انگریز سے ٹکریں، اس عمل طاقت بھی بڑھ جائے گی، اور تحریک کی کامیابی ملک کو جوش سے بھر دے گی، خواب نہ دیکھنے والے مسلمان بیدار ہو کر جہاد میں شریک ہو جائیں گے پھر انگریزوں سے نپٹنا مشکل نہ ہوگا، چار پانچ سال تحریک جہاد کو شمالی ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں اتار کر مسلمانوں کو بے مثل قربانی پر آمادہ کر کے آپ نے ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء میں اپنے وطن رائے بریلی سے ہندوستان کے شمالی مغربی سرحد پہونچنے کے لئے صوبجات متحدہ مالوہ کے علاقوں اور اجمیر

مارواڑ، سندھ، بلوچستان، افغانستان اور صوبہ سرحد کے ریگستانوں، میدانوں، پہاڑوں، دروں، جنگلوں دریاؤں اور دلدلی علاقوں کو طے کیا جن کو طے کرنا ایک مستقل جہاد تھا۔ صوبہ سرحد پہنچنے کے بعد لاہور کی سکھ حکومت کی فوج سے سب سے پہلے لڑائی "اکوڑہ کی جنگ" کے نام سے مشہور ہے اس معرکہ میں سید صاحب کے ساتھیوں کی تعداد سات سو تھی اور حریف لشکر سات ہزار مسلح افراد پر مشتمل تھا، ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو اس مٹھی بھر جماعت کا اپنے سے دس گنے حریف سے مقابلہ ہوا، مجاہدین بے جگری سے لڑے اور دشمن پسپا ہوا' اکوڑہ کی کامیاب جنگ کے بعد مقامی لوگوں کا اعتماد بڑھ گیا، اور انھوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعتِ امارت و خلافت کر لی، حضرت سید شہیدؒ کی اس کوشش و جہاد کا مقصد بہت اعلیٰ و ارفع تھا، آپ کے پیشِ نظر شریعتِ اسلامی کا نفاذ اور کتاب و سنت پر مبنی معاشرہ کا قیام تھا، جو مقامات آپ کے زیرِ اثر آئے وہاں آپ نے شرعی قوانین کا اجرا فرمایا، نظامِ شرعی کے قیام، عمّال و محصلین زکوٰۃ کے تقرر، احکامِ شرعی کے نفاذ سے سرداران قبائل بالخصوص سلطان محمد خاں والیٔ پشاور اور دنیادار علماء کو جن کے مالی و دنیوی مفادات پر اثر پڑتا تھا، اپنا صریح نقصان نظر آیا، انھوں نے سازش کر کے عوام و خواص کو مجاہدین کے عقائد و خیالات کے خلاف برانگیختہ کیا، پشاور اور سمہ کے پورے علاقے میں سید صاحب کے مقرر کردہ حکومتِ شرعیہ کے عمال و محصلین، قضاۃ، محتسبین، اور غازیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا گیا، سالہا سال کی تربیت کا نتیجہ عمر بھر کی کمائی اور ہندوستان کا عطر و انتخاب سرحد کی سرزمین پر اپنوں ہی کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔

خدنگِ آخریں

اس سفاکانہ قتلِ عام سے سید صاحب کا دل ٹوٹ گیا، مقامی لوگوں کی بے وفائی، احسان فراموشی اور ظلم و بربریت سے وہ اتنے دل شکستہ ہوئے کہ اس مقام سے ہجرت کا ارادہ کر لیا، اور اپنی آئندہ اصلاحی

وجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز بنانے کے لئے کشمیر کا انتخاب کیا اپنے بچے کچھے انسانی سرمائے اور ان جاں نثار وباوقار رفقاء کو لے کر جو اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی آپ کا ساتھ چھوڑنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے، کشمیر کا رخ کیا، کشمیر کی طرف بڑھنے کی تیاری کرنے کے لئے سب سے موزوں مقام بالاکوٹ تھا جو وادیٔ کاغان کے جنوبی دہانے پر واقع ہے آپ ۱۷ اپریل ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں داخل ہوئے رنجیت سنگھ کے بیٹے شیر سنگھ کو جب معلوم ہوا کہ سید صاحبؒ اپنے غازیوں کے ساتھ بالاکوٹ میں مقیم ہیں تو اس نے بڑی فوج لے کر بالاکوٹ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔

۶ مئی ۱۸۳۱ء کو جنگ ہوئی، بڑے بڑے علماء و مشائخ اور مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا، اس طرح بالاکوٹ کی اس سرزمین پر ان مبارک انسانوں کا وہ مبارک سفر تمام ہوا جس کی ابتدا جمادی الآخر ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کی صبح کو حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنے غازیوں کے ساتھ رائے بریلی سے کی تھی، اور ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو منزل مقصود پر پہونچ گئے[1]

۶ مئی ۱۸۳۱ء کو مسلمانوں کی اور اس ملک کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی، حکومت شرعی ایک عرصہ کے لئے خواب بے تعبیر ہو گئی، افق ہند پر غلامی کے آثار نمایاں ہو گئے اور ۱۸۵۷ء کی ایک صبح سلطنت مغلیہ کا چراغ گل تھا، آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر جلاوطن کئے گئے، شہزادوں کا قتل کیا گیا، علماء، مشائخ، شرفاء، عوام و خواص، انگریزوں کی بربریت اور انتقام کا شکار ہوئے، جا بجا پھانسیاں گاڑی گئیں، اور اسی پر لٹکی ہوئی لاشوں اور نیم جاں انسانوں کی کرب و تکلیف کو دیکھ کر وہ قوم لطف اندوز ہو رہی تھی، جو سات سمندر پار سے آج سے دو سو سال قبل انھیں ستم رسیدہ انسانوں کے آباء اجداد سے تجارت کی سہولت کی بھیک مانگ کر اس ملک میں داخل ہوئی تھی۔

تاہم حضرت سید احمد شہیدؒ کی لگائی ہوئی آگ سرد نہیں ہوئی وہی آگ تھی جس نے ۱۸۵۷ء

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہید"۔

میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو انگریزوں کے مقابل لا کھڑا کیا، وہی آگ تھی جس کی زیر خاک چنگاریوں نے ہوا کھا کر پھر یوپی کے میدانوں کو گرما دیا، وہی سینوں میں سلگتی ہوئی راکھ تھی جس نے لندن کے ایوانوں کو ہلا ڈالا، جہاں غدر کے اور اسباب تھے، وہاں حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے دبے ہوئے شعلوں نے بھی تاثیر دکھائی، دونوں مرتبہ نعرہ ایک ہی تھا "دینی حمیت" اور دونوں مرتبہ ناکامی کی بنیادی وجہ بھی ایک تھی، اپنوں کی بے رخی اور مخالفت، حضرت سید احمد شہیدؒ اور آپ کے رفقاء اپنی زندگی کا مقصد پورا کر گئے، راہِ خدا میں جانیں قربان کر کے سرخروئی حاصل کر لی، بجھے ہوئے دلوں میں ان کی صداقت کا شعلہ نہ بھڑکا تو ان کا کیا قصور۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک نے ہندوستان میں ایک علمی و فکری بیداری اور ایک نیا تحقیقی ذوق پیدا کیا، فقہی جمود کو ختم کیا اور ہندوستان کی مروّج زبان میں طاقتور دینی اور علمی لٹریچر تیار کیا، اردو زبان اور ادب پر بھی اس نے گہرا اثر پیدا کیا۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دوسرا باب

۱۸۵۷ء تا قیام ندوۃ العلماء ۱۸۹۲ء

ہندوستان کی تحریک آزادی میں جس کا بیج ۱۸۵۷ء میں پڑ چکا تھا، مسلمانوں کا حصہ قدرتی طور پر بہت ممتاز و نمایاں رہا ہے، انھوں نے جنگ آزادی میں قائد و رہنما کا کردار ادا کیا، انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کرنا شروع کیا تو اس وقت مسلمان ہی ہندوستان کے فرمانروا تھے، انگریزوں کے تکبر، ملک کی دولت کے استحصال اور اہل ملک کے مذہبی جذبات کی مسلسل تحقیر برداشت کرنے کے بعد ہندوستانی فوجوں نے مئی ۱۸۵۷ء میں ان کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا، ان سپاہیوں نے دہلی کی طرف کوچ کر کے (جو مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی قیام گاہ تھی) ان کو جنگ کا قائد و رہنما اور ہندوستان کا قانونی بادشاہ اور نامور مغل بادشاہوں کا وارث اور جانشین قرار دیا، ہندوستان کے کونہ کونہ میں ان کے نام پر اور ان کے جھنڈے کے نیچے جنگ کی گئی، لوگ ان کو قومی اور مذہبی جنگ کا ہیرو سمجھتے رہے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان سب شریک تھے، مگر قیادت و رہنمائی کے میدان میں مسلمانوں کا پلڑہ بھاری تھا۔

جنگ آزادی کی یہ کوشش جب ناکام ہوئی تو انگریزوں نے ہندوستانیوں سے انتقام لینا شروع کیا، اس کے نتیجے میں ایسی ہلاکت خیزی اور تباہی پھیلی اور ایسی سفاکی کا مظاہرہ کیا گیا جس نے چنگیز و ہلاکو کی یاد تازہ کر دی، جان لارنس نے انگریزی کمانڈر کو ۲ دسمبر ۱۸۵۷ء کو لکھا:۔

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریقے سے بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے اس کے لئے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی، اور یہ فعل حق بجانب ہوگا"

یہ ایک قتل عام تھا لیکن مسلمان خاص طور سے اس کا نشانہ تھے، اس لئے کہ بہت سے ذمہ دار انگریز یہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلامی جہاد تھا، اور مسلمان اس بغاوت کے بانی، قائد اور رہنما ہیں، ایک انگریز مصنف کہتا ہے:۔

"اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا تھا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہو گئی یعنی یہ اسلامی بغاوت تھی"[1]

ایک معاصر مؤرخ لکھتا ہے:۔

"ہر ایک انگریز کا شیوہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا، ہر ایک سے پوچھتا تو ہندو ہے یا مسلمان، جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا"[2]

ایک معاصر لکھتا ہے:۔

"ستائیس ہزار (۲۷۰۰۰) اہل اسلام نے پھانسی پائی اور سات دن برابر قتل عام رہا اس کا کوئی حساب نہیں، بچوں تک کو مار ڈالا گیا، عورتوں سے جو سلوک کیا گیا بیان سے باہر ہے جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے"[3]

غالب کی ایک ماتمی نظم "شہر آشوب" کے اشعار میں بھی اس کا تذکرہ ہے ؎

بسکہ فعّال مایرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا

---

[1] LIFE OF LORD LAWRENCE, BOSWORTH SMITH P. 158

[2] عروج سلطنت انگلشیہ ص ۷۱-۷۲ از منشی ذکاء اللہ صاحب مرحوم [3] قیصر التواریخ ص ۲۵۴

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زندان کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا[1]

غالب نے جو کچھ دیکھا تھا، دلی میں دیکھا تھا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں درحقیقت ملک کے اکثر حصوں کی تصویر کھنچ آئی ہے۔ غالب کے مجموعۂ خطوط "اردوئے معلیٰ" میں ان کی یہ عبارت بھی ہے کہ "واللہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا"۔

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس نے ۲۱ جون ۱۸۵۷ء کو اپنی والدہ کو لکھا:۔

"سزائے موت کی سب سے زیادہ مؤثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اڑا دیا جائے۔ یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے، لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے ہمارا مقصد ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے"[2]

ملازمتوں سے بے دخل

غرض ہماری حریت کی سب سے بڑی قیمت مسلمانوں کو ادا کرنا پڑی اور انگریزی حکومت کے ذمہ دار سیاستدان، حکمراں اور مفکرین اور مصنفین یہ سمجھتے رہے کہ دراصل مسلمان ہی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ذمہ دار ہیں اور ان کی آئندہ نسلوں تک کو اس کا خمیازہ بھگتنا چاہیئے۔ مسلمانوں سے انگریزی حکومت کا معاندانہ رویہ جاری رہا، ان کو حکومت کے کلیدی عہدوں سے علیحدہ رکھا گیا، معاش کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے، ان اوقاف اور جائدادوں کو ضبط کیا گیا جن سے ان کے مدارس چلتے تھے، ایسے تعلیمی ادارے کھو لے گئے اور ایسا تعلیمی نظام بنایا گیا جس سے مسلمان فائدہ

---

[1] اردوئے معلیٰ ص ۳۰۵　[2] EDWARD THOMPSON THE OTHER SIDE OF THE MEDAL, 1926. P 40

نہ اٹھا سکیں، بعض سرکاری اعلانات میں یہ وضاحت کر دی جاتی تھی کہ فلاں فلاں جگہوں کے لئے ہندو لئے جائیں گے، سر ولیم ہنٹر نے لکھا ہے :-

"مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں، تب بھی انھیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے، ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا، اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے ہیں"[1]

مقدمات اور سزائیں

مسلمانوں کے معاملہ میں انگریزوں کا غصہ اور انتقام بہت نمایاں تھا، معمولی الزام یا محض شبہ پر انھیں سخت سے سخت سزا دی جاتی، جس شخص کے متعلق شبہ ہوتا کہ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت سے تعلق رکھتا ہے اس پر مقدمہ چلایا جاتا، ۱۸۶۵ء میں پٹنہ تھانیسر اور لاہور کے متعدد علماء، اشراف اور تجار پر جو مقدمے قائم کئے گئے، اس سے اس بغض اور کینہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان میں سے بعض حضرات کو انگریزوں نے وہابی کے نام سے مشہور کیا ۱۸۶۵ء میں مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولانا عبدالرحیم صادقپوری اور مولانا محمد جعفر تھانیسری کو پورٹ انڈمان روانہ کیا گیا، ان میں سے بعض کا انتقال وہیں ہوا، پٹنہ میں خاندانِ صادقپور کی تمام جائدادیں ضبط کر لی گئیں، عمارتیں گرا دی گئیں اور ان پر ہل چلوا دیا گیا، مقبروں کو تباہ و برباد کیا گیا۔

پسماندگی کے اسباب

مسلمانوں میں تعلیم کی کمی اور ان کو سرکاری ملازمتیں نہ ملنے کا اہم سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کا

---

[1] INDIAN MUSALMANS —

وقت اپنا دفاع کرنے، الزامات کی تردید کرنے میں صرف ہو جاتا، ان کو اس کا موقعہ نہیں ملتا تھا کہ وہ قومی سیاسیات میں داخل ہوں اور قومی شعور اور بیداری میں ملک کے دوسرے باشندوں کے دوش بدوش حصہ لے سکیں، جو تیزی سے ترقی کر رہے تھے، ان کو حکومت کی حوصلہ افزائی اور اعتماد حاصل تھا، ہر حکومت کے اولین فرائض میں سے یہ ہے کہ وہ رعایا میں روشنی پھیلائے اور انسانی اخلاق اور معاشی استحکام کو ترقی دے اور جہالت و ناخواندگی دور کرے، انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام بغیر کسی فیس کے کیا جاتا تھا، بادشاہ، امراء اور اہل ثروت تعلیمی مصارف کے لئے بڑی بڑی جائدادیں وقف کرتے تھے، صوبہ بنگال کا چوتھائی حصہ تعلیم کے لئے وقف تھا، جس میں گرانٹ کے تخمینہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ:۔

"صرف اضلاع روہیلکھنڈ میں پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے اور نواب حافظ رحمت خاں کی سرکار سے تنخواہیں پاتے تھے"

کپتان الگزنڈر اسمتھ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ:۔

"اورنگ زیب کے دور میں صرف ٹھٹہ سندھ میں چار سو کالج مختلف علوم و فنون کے تھے"[1]

ہمایوں کبیر بارڈی بیکس مولر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:۔

"انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے، اور انگریزوں کے دور میں آنریبل الفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن کے اعتراف کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دئے، ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی اور ہمت افزائی کے تمام ذرائع ختم کر دیئے ہیں،

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۷۳

بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصل علوم بھی گم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

دہلی کالج جس سے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد حتیٰ کہ سرسید احمد اور مولانا نانوتوی کا تعلق رہ چکا تھا، اس کے بند کرنے کی المناک روداد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے الفاظ میں:۔

"قاعدہ ہے کہ غیر معمولی آندھی میں بہت سے پودے اور درخت تباہ ہو جاتے ہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نامراد اختتام پر حکومت وقت نے جس انتقامی جذبہ کا اظہار کیا اس کی یاد سے کلیجہ منہ کو آتا ہے، خوب دل کے بخار نکالے گئے، وہ جس نے کبھی ایک گال کو ہاتھ نہ لگایا تھا، اس کی گردن پھانسی کے پھندے کے نظر ہوئی، غرض یہ کہ کبھی کچھ ہوا جو نہ ہونا چاہیئے تھا، مگر فاتحوں کے دل ابھی تک ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے، چنانچہ دہلی کو یوپی سے نکال کر پنجاب میں شامل تو کر ہی دیا تھا، اب دہلی کالج کو بھی بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکا گیا، اس کی مجمل تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء دربار قیصری کے سلسلہ میں جب وائسرائے کلکتہ سے دہلی آئے تو شہر کے ہندوستانی نیتا ایک وفد لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس موقعہ پر جو میمورنڈم وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا گیا، اس میں پُرزور درخواست کی گئی تھی کہ دہلی کالج کو نہ توڑا جائے، اس کو ختم کرنے کا حکم واپس کر لیا جائے، مگر انگریز جو فیصلہ کر چکا تھا، اس پر اڑا رہا، جواب میں کہا گیا کہ لاہور پریسیڈنسی کالج کو اب یونیورسٹی کی حیثیت مل رہی ہے، اس واسطے دلی کالج کی ضرورت نہیں، اس طرح یہ فیض رساں تاریخی ادارہ ختم کیا گیا۔"[1]

نظام تعلیم کی تباہی نے ملک میں جہالت کو عام کر دیا، شاہ عالم کے معاہدے کے برخلاف حکومت کی زبان انگریزی قرار دے کر عربی اور فارسی کے تمام مکاتب کو ختم کر دیا گیا، اسکولوں اور کالجوں کا کورس وہ تجویز کیا گیا جو مسلمان بچوں کو عیسائی نہ بنا سکے تو کم از کم مسلمان نہ رہنے دے اور وہ

---

[1] دلی کالج میگزین۔

اپنے مذہب کو نہ بھیس انگریزوں نے جو نظام تعلیم اور جس نصاب کا جال ہندوستان میں پھیلایا وہ ان ہی کے الفاظ میں اس مقصد کے لئے تھا "ہمیں ایسی جماعت بنانی چاہئے، جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر مذاق، رائے اور الفاظ و سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو"[1]

تجارت و صنعت

زمانہ قدیم سے انگریزوں کی عملداری تک ہندوستان صنعت و حرفت میں خاص شہرت رکھتا تھا، بنگال و بنارس کے کپڑے، ڈھاکہ کی ململ، لکھنؤ کی چکن، قنوج کا عطر، مراد آباد کے برتن، امروہے کی ریشمی اور زردوزی، ٹوپیاں، یہاں کے مضبوط لوہے کے ڈھلے ہوئے ہتھیار، غرض ہر قسم کی صنعت و حرفت اور دستکاریوں سے ہزاروں کیا لاکھوں صناع جو کفاف سے بڑھ کر کماتے تھے، اور خوشحال گزارہ کرتے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز میں خود انگلینڈ ہندوستانی مال کی بہت بڑی منڈی تھا، آخر کار لندن کے کاریگروں نے شور مچایا کہ ہندوستان کے تجارتی سیلاب کو روکو، اہل حکومت نے کمپنی پر زور دیا کہ "ہندوستانی تجارت کی روک تھام ہونی چاہئے، ورنہ ہماری مصنوعات تباہ ہو جائیں گی" مسٹر شیلڈن کہتا ہے :-

"انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے برآمد ہوتا تھا، وہ بالکل بند ہو گیا ہے، اس لئے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی کے ریشمی کپڑوں سے آدھی قیمت پر انگلستان پہونچ جاتا ہے، اور دونوں سے بہتر بھی ہوتا ہے"

انگریز اب اس تاک میں تھا کہ ہندوستان کے مال کا نہ صرف بائیکاٹ کرے بلکہ سرے سے

---

[1] لارڈ میکالے کا مشہور مقولہ۔

اس صنعت ہی کو تباہ کر کے ہر چیز میں اسے اپنے ملک کا محتاج بنا دے انسانی صنعت اور قدرتی پیداوار میں یہی دو چیزیں ہیں جن پر کاروبار کی رونق موقوف ہے، صنعتوں کو انگریزوں نے تباہ کیا، تجارت بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی، سلطنت اجاڑ دیں، عزتیں یہ سب تو جا ہی چکی تھیں، صناعوں اور کارخانہ داروں کے طبقے کی تباہی نے قوم کی سوئی قسمت کی داستان کو مکمل کر دیا۔

عیسائیت کی تبلیغ

یورپین اقوام جب دنیا میں نو آبادیاتی نظام قائم کرنے مختلف مقامات پر پہنچیں تو پادریوں کو بھی تبلیغ عیسائیت کی دھن سوار ہوئی جس جس ملک میں ان کے قدم جمتے عیسائی مبلغین پیچھے پیچھے پہنچکر اسکول اور اسپتال بنا کر خلقت کو پرچانے لگتے تھے، ہندوستان کی صورتِ حال یہ تھی کہ اس ملک کے باشندوں کی نہاد اور رگ وریشہ میں اپنا مذہب خون کی جگہ دوڑ رہا تھا، خاص کر مسلمان جس مذہب کے پیرو تھے، وہ دنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن تھا، اور انھیں جان و دل سے عزیز تھا، ہندوستان میں پادریوں کی آمد کلائیو اور ہسٹنگز کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی، مدراس اور بنگال پر تسلط کے بعد یہ آمد بڑھ گئی، پادری اپنے مخصوص طرز تبلیغ میں لگ گئے، وہ برملا اپنی اس تمنا کا اظہار کرتے تھے "ہماری تمنا ہے کہ اس ملک میں گرجاؤں کو ہندوستانیوں سے بھرا ہوا دیکھیں چونکہ ہم نے خود اس سے برکتیں حاصل کی ہیں، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کو بھی ان کے حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے"

یورپ و امریکہ سے عیسائی انجمنوں اور اداروں کی طرف سے خاصی تعداد میں پادری اور تبلیغی وفود ہندوستان آئے، ۱۹۱۰ء سے قبل ہی ایک اندازہ کے مطابق بیالیس عیسائی مشن ہندوستان میں قائم ہو چکے تھے، عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے باہمی رضامندی سے ہندوستان کو اپنے دین کی اشاعت کے لئے تقسیم کر لیا تھا، مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا بریزی ٹرین چرچ، راجپوتانہ اور ہندوستانی ریاستوں میں آئرلینڈ کا رومن کیتھولک چرچ اور مغربی شمالی حصہ میں امریکہ کا میتھوڈیسٹ چرچ

ہندوستان میں کوئی قصبہ اور قریہ باقی نہیں رہا جہاں عیسائی مشن نہ پایا جاتا ہو، تنہا میتھوڈیسٹ چرچ کے ڈھائی سو مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔

ہندوستان کے اعلیٰ اخلاق کو تباہ کرنے کی کوشش

ہندوستان زمانۂ قدیم سے روحانی شخصیتوں کا مرکز رہا ہے، یہاں کے عام باشندے اعلیٰ اخلاق سے آراستہ تھے، سرتھامس منرو ہندوستانیوں کے اوصاف کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"ہر شخص میں مہمان نوازی اور خیر خواہی کا مبارک جذبہ موجود ہے، صنف نازک کی عزت و عصمت کا لحاظ رکھا جاتا ہے، ایسی صفات کی موجودگی میں ہندوستان کو یورپی اقوام سے کسی طرح کمتر قرار نہیں دیا جا سکتا، اگر انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تہذیب و تمدن کی تجارت کی جائے تو مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کی جو کچھ درآمد انگلستان میں ہوگی اس سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہونچے گا"

مگر افسوس ہے کہ انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں کی تمام خوبیوں کو تقریباً مٹا دیا، اور ان میں تمام بداخلاقیاں اور برائیاں پیدا کر دیں، لارڈ میکالے لکھتا ہے:-

"زمانۂ سابق میں جس طرح لوگوں کو زور دار اور با اثر افیون کے پوست پلا کر کاہل، پست ہمت اور بد عقل بنا دیا جاتا تھا، ہمارا نظام سلطنت اسی طرح اہل ہند کو بیکار کر دے گا"

تیسرا باب

ردِ عمل

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی (جس کی قیادت علماء اور دیندار طبقہ نے کی تھی) کی ناکامی پر مسلمانوں میں احساسِ شکست، احساسِ کمتری اور ایک عام مایوسی پھیلتی جا رہی تھی، ان کی عزت، خودداری پر کاری ضرب لگی تھی، ان کو نئے فاتح کا رعب، نئے حالات کی دہشت، ناکامی کی شرم اور مختلف شکوک و شبہات اور تہمتوں کا سامنا تھا، ان کے سامنے ایک ایسی فاتح قوم تھی، جو قوت و خود اعتمادی سے لبریز تھی، ایک ایسی تہذیب تھی، جو جدت و نشاط انگیزی اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھی، ان مشکلات اور مسائل کا پہاڑ تھا، جو فوری اور دور اندیشانہ حل اور فیصلہ کن اور واضح موقف کا طلب گار تھا۔

دو قیادتیں

"اس پیچیدہ کیفیت اور نازک حالت میں دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں، پہلی قیادت خالص دینی قیادت تھی جس کے علمبردار علمائے دین تھے، دوسری قیادت سرسید احمد خاں مرحوم اور جدید مکتبِ خیال کے افراد پر مشتمل تھی، علمائے دین نے اسلام کے دینی و علمی سرمایہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے دینی تعلق و احساس کو باقی رکھنے کے لئے ایسے دینی مدارس کا قیام ضروری سمجھا جو

سیاسی زوال کے بعد مسلمانوں کو دینی اخلاقی زوال سے حفاظت کے ضامن ہوں، اور ان مدارس سے ایسے علماء تیار ہو کر نکلیں جو اسلامی شریعت و فقہ سے گہری واقفیت رکھتے ہوں، اور ان میں داعیانہ روح، رضاکارانہ خدمت اور اشاعت علم کا جذبہ ہو، اور جو حکومت کی اعانت و سرپرستی کے بغیر اس میں اپنی خدمت اور رہنمائی اور علم کی اشاعت و حفاظت کا فرض انجام دے سکیں، ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کا بنیادی اور مرکزی حصہ ہے[1]"

بلاشبہ ان علماء کو رسوخ فی الدین، زہد و تقویٰ، ایثار و قربانی، دینی غیرت و حمیت اور اس راہ کی قربانی میں عالم اسلام کا طاقتور عنصر قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس ظلم و بربریت اور غیر معمولی سنگدلی اور بے رحمی کی وجہ سے جس کا مظاہرہ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے معاملہ میں کیا تھا جن کو وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کا اولین رہنما اور قائد تسلیم کرتی تھیں، نیز عیسائیت کی ترویج و اشاعت میں حکومت کی سرگرمی اور گرم جوشی اور مغربی تہذیب کی عوام میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد، اخلاق و معاشرت میں اس کے اثرات کی وجہ سے ان لوگوں کو اقدام کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، انھوں نے اس کی فکر شروع کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے پچھے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے، اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے لئے قلعہ بندیاں کر لی جائیں، اور پھر ان قلعوں میں (جن کو عربی مدارس کے نام سے پکارا گیا ہے) مبلغ اور داعی تیار کئے جائیں[2]۔

دارالعلوم دیوبند

اس عظیم اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے (جس کا آغاز ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا) سربراہ

---

[1] ہندوستانی مسلمان" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [2] "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۱۶۹

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے حضرت مولانا نانوتویؒ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں خود بھی شریک اور مسلمانوں کی شکست، ناکامی و پسماندگی کا داغ خود اپنے سینے پر کھائے ہوئے تھے، ان کی دینی و ملی غیرت و حمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی قیصر بنا کر دلی میں تاجپوشی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا گیا، اس زمانہ میں مولانا نانوتویؒ کا قیام دہلی میں تھا، جوں ہی اس جشن کے انعقاد کا ساز و سامان دیکھا تو دیوبند چلے آئے، اور فرمایا کہ مجھ سے ان کی (انگریزوں کی) شوکت دیکھی نہیں جاتی، اس لئے دہلی سے دیوبند چلا آیا، کہ نہ دیکھوں گا نہ کوفت ہوگی ــــ ان علمائے ربانیین کے پیش نظر تنہا تعلیم و تعلم کی درس گاہیں قائم کرنا نہیں تھا بلکہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ، ماضی کی تلافی اور بہترین مستقبل کی تلاش تھا۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ "حضرت نانوتویؒ" کے تذکرے "سوانح قاسمی" میں لکھتے ہیں۔

"۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال و آویزش کے لئے محاذوں اور میدانوں میں آپ کا دماغ مصروف ہو گیا، دار العلوم دیوبند کا تعلیمی نظام اس لائحہ عمل کا بہت زیادہ نمایاں اور مرکزی جوہری عنصر تھا، شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا چھوڑ دیا تھا، اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تھے، بلکہ بقائے اسلام اور تحفظ دین کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لئے ان کے دماغ بھی مصروف فکر و عمل تھے، اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لو لگائے غیبی لطیفے کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے"[1]

مولانا قاسم صاحبؒ کے شاگرد رشید اور جانشین شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی

---

[1] سوانح قاسمی دوم ص ۲۲۳

ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا تاکہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔[۱]

اس تحریک اور اس کے قائدین نے ہندوستانی مسلمانوں میں دین کی محبت، شریعت کا احترام، مغربی تہذیب کے مقابلہ میں استقامت و صلابت پیدا کر دی، دیوبند اس رجحان کا علمبردار اور ہندوستان کی قدیم اسلامی ثقافت و تہذیب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔[۲]

سرسید اور ان کا مکتب خیال

دوسری قیادت جس کا پرچم سرسید احمد خاں مرحوم نے بلند کیا وہ مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو اس کے عیوب و نقائص کے ساتھ بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کی داعی تھی۔[۳]

سرسید احمد خاں مرحوم جو اس تحریک کے علمبردار تھے، ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، سرسید کی تعلیم پرانے اصولوں پر ہوئی، مذہب کے آغوش میں انھوں نے پرورش پائی تھی، انھوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو سلطنت مغلیہ کا آفتاب لب بام آچکا تھا، ان کا خاندان عرصہ سے دربار مغلیہ سے متعلق تھا، وہ خود ابتدائی زمانہ میں دربار میں آتے جاتے تھے، اس طرح انھیں زوال پذیر سلطنت مغلیہ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، انھوں نے وہ ابتری اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی جس کا ہلکا سا نقشہ انھوں نے اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین خاں کے حالات "سیرت فریدیہ" میں کھینچا ہے، ان کے کانوں میں وہ آوازیں گونج رہی تھیں، جب مغل شہزادے محلات کی چھتوں پر چڑھ چڑھ کر چلاتے تھے "ہم بھوکے مرتے ہیں"

---

[۱] "سوانح قاسمی" ج ۱ ص ۲۲۶ [۲] اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ص ۱۵۷ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [۳] ایضاً

ہم بھوکے مرتے ہیں"۔ ان کی نظر اس اخلاقی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی بیماری پر تھی، جو گھن کی طرح مغلیہ سلطنت کو کھا رہی تھی۔

سید احمد خاں کی عمر ۱۳، ۱۴ سال کی ہوگی جس وقت حضرت سید احمد شہیدؒ نے اصلاح و حریت کا علم بلند کیا، اس تحریک کو انھوں نے قریب سے دیکھا تھا، شاہ عبدالعزیز دہلوی کا خاندان ان کی عقیدت کا مرکز تھا، شاہ اسماعیل شہیدؒ کے وعظوں میں انھوں نے شرکت کی تھی، اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں حضرت سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے حالات جس محبت اور جوش سے انھوں نے لکھے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان بزرگوں سے انھیں بڑی عقیدت و محبت کا تعلق تھا، سرسید احمد خاں دہلی کالج میں مولانا مملوک علی کے شاگرد رہ چکے تھے، جو مولانا محمد قاسمؒ صاحب نانوتویؒ (بانی دارالعلوم دیوبند) کے استاذ اور رشتے میں چچا ہوتے تھے، یہ عجیب واقعہ ہے کہ غدر کے طوفان نے ہندوستان کے سماجی اور سیاسی زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا، اور ایسے وقت دو متضاد تحریکیں یا مکتب خیال وجود میں آئے تو ان کا سرچشمہ ایک ہی تھا، دونوں تحریکوں کے بانی ایک درس گاہ اور ایک استاد کے فیضیاب، دہلی اجڑی، دلی کالج بند ہوا تو اس کے عوض دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے بقول شخصے:۔

"جس طرح مولانا محمد قاسمؒ دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اسی طرح سرسید احمد خاں نے دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہونچا دیا"[1]

سرسید نے لال قلعہ پر یونین جیک کا عروج، مغل سلطنت کا زوال، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اپنی آنکھوں سے دیکھی، سرسید نے ہر اچھے مسلمان خاندان کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر پر، افلاس اور نکبت کی پرچھائیاں دیکھی تھیں، انھوں نے ہندوستان کی ہزیمت اور دل شکستگی کا مشاہدہ کیا تھا، انھوں نے

---

[1] علی گڑھ میگزین ۱۹۴۷ء ص ۶۷

اپنی آنکھوں سے فارسی عربی پڑھے مسلمانوں کو صدر الصدور، صدر امین، ہیڈ قاضی اور منشی کے عہدوں پر دیکھا تھا، انھیں اونچی سے اونچی اور ذمہ دار جگہوں پر ہوشیاری اور دیانتداری، سلیقہ اور وقار، ہمدردی اور چابکدستی سے کام کرتے دیکھا تھا، مغربی سیاحوں نے جن کے عدل اور قوتِ فیصلہ کی تیزی کو سراہا تھا، مگر یہ قابل لوگ ملازمت کے لئے نااہل قرار دیئے جا رہے تھے، وہ قوم جو کل تک حاکم تھی، اس کی ذلت و پستی انگریزوں کی شان و شوکت ان کی حکومت اور ان کی ساحرانہ تہذیب کے مظاہر دیکھ کر سرسید متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، وہ ایک ذہین، ذکی الحس، سریع الانفعال اور دردمند انسان تھے، انھوں نے متوسط درجہ کی دینی تعلیم پائی تھی، دین کے مختلف علوم اور کتاب و سنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی، جلد رائے قائم کر کے جرأت کے ساتھ اس کے اعلان و اظہار کرنے کے عادی تھے، وہ انگریزوں سے اس طرح متاثر ہوئے جیسے کوئی مفتوح فاتح سے اور کمزور طاقتور سے مرعوب ہوتا ہے، انھوں نے پُرزور طریقہ سے انگریزی تہذیب اور معاشرت کو اختیار کرنے کی دعوت دی، چنانچہ "تہذیب الاخلاق" میں لکھتے ہیں:-

"ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپی کے بالکل یورپین ہے، سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے، میز و کرسی پر بیٹھتے ہیں، چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہیں، ان کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یورپینوں کا سا ہے، جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اور امید ہے کہ روز بروز اور زیادہ مہذب ہوتے جائیں گے، پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم چاہتے ہیں کہ اپنے مقتضیات اور خیالاتِ خام کو چھوڑ دیں اور تربیت و شائستگی میں قدم بڑھائیں"۔

سرسید نے ۱۸۶۹ء کو ولایت کا سفر کیا، اٹھارہ انیس ماہ قیام کے بعد اکتوبر ۱۸۷۰ء میں جب وہ ہندوستان واپس آئے تو سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجرا

تھا جس کا پہلا نمبر ان کی انگلستان سے واپسی کے دو مہینے بعد شائع ہوا، اس میں کئی ایسے مضامین ہوتے تھے، جن کا ناخوشگوار اثر پڑتا تھا، ان کی مخالفت شروع ہوئی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

جدید مکتب خیال کے افراد کو اس دور کے علماء سے آج تک یہ شکایت ہے کہ علماء نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے روکا، اور ان کی شاہراہِ ترقی کا روڑا بن گئے، حالانکہ حقائق و واقعات اس بات کی قطعاً تائید نہیں کرتے، اس دور میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے انگریزی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق فتویٰ لیا گیا تو انھوں نے زور دے کر کہا جاؤ انگریزی کالجوں میں پڑھو انگریزی زبان سیکھو، شرعاً ہر طرح جائز ہے[1]۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا تھا:۔

"آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے میرے بزرگوں نے کسی وقت انگریزی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا"

مدرسۃ العلوم کی مخالفت اور علی گڑھ کالج کے خلاف سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتویٰ میں یہ نہیں لکھا گیا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے، بلکہ یہی ہوتا تھا کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں، اور جو مدرسہ ایسا قائم کرنا چاہے اس کی اعانت جائز نہیں، علی گڑھ کالج کے افتتاح سے تقریباً آٹھ سال پہلے سرسید کی طرف انگریزی تعلیم کی ترویج سے نہیں، بلکہ اپنے معاشرتی اور مذہبی عقائد کی وجہ سے مسلمانوں میں انگشت نمائی ہونے لگی، اور ان کے عقائد و مسلک کو شک کی

---

[1] "اسباب بغاوت ہند" مصنفہ سرسید احمد خاں۔

نگاہ سے دیکھا جانے لگا، جن لوگوں نے سرسید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت ان علماء نے کی جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے اور سرکار انگلش اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے، حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے، اور دونوں معزز سرکاری ملازم تھے یعنی مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش صاحب، حالی لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں جس قدر مخالفین اطراف و جوانب سے ہوئے ان کا منبع انھیں دونوں صاحبوں کی تحریریں ہیں"

علی گڑھ تحریک اور سرسید پر سب سے زیادہ لطیف تنقید اکبر الہ آبادی نے کی، جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور خود ایک آئینی عہدے پر فائز تھے، ان کا سارا کلام سرسید کی تردید، تنقید اور طنز سے لبریز ہے۔

صاحب نظر طبقہ

علی گڑھ تحریک کے ذیل میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری تھا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سے ایک طبقہ نے علماء کو تاریک خیال، ضدی، حقیقت ناآشنا اور قومی فلاح و بہبود سے غافل کے روپ میں ہمیشہ پیش کیا ہے، علماء کے متعلق عوام میں اس تاثر کے عام ہونے سے علماء کی سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی، زمانہ شناسی، حد یہ کہ ان کے خلوص و سنجیدگی پر سے عوام کی ایک معتدبہ تعداد کا اعتماد اٹھ گیا ہے، اس طرح کے پروپیگنڈہ نے برصغیر کی ماضی قریب کی تاریخ میں جو زخم چھوڑے، جو تاریخ بنائی، اور جو نیا جغرافیہ ڈھالا، اس کی تلافی اب ممکن نہیں، علماء اور دیندار طبقہ کے پیش نظر اختلافی مسئلہ انگریزی تعلیم کے حصول کا نہیں تھا، بلکہ سوال ایمان و عقیدہ کی حفاظت اور تہذیب و ثقافت اور معاشرت میں مغربیت سے احتیاط کا تھا، طبقہ علماء کی اس موقف کی صحت کا آج اس طبقہ میں بھی

اعتراف ہے، جو سرسید اور ان کی تحریک کا سعادت مند مقلد اور مداح ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔

"سرسید جس طرح یا جس حد تک مغربیت سے متاثر تھے، اس سے نہ حالی کو اتفاق تھا نہ شبلی کو نہ نذیر احمد کو، یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے لیکن پچاس سال بعد معلوم یہی ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال تھا سرسید اور سید امیر علی دونوں سے یہ (مولوی) طبقہ زیادہ صاحب نظر نکلا"[1]

اکبر الہ آبادی سرسید اور ان کی تحریک کے بڑے ناقد تھے، ان کے متعلق پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔

"سرسید ہم کو ہر قیمت پر مغربی اقوام کے دوش بدوش لانا چاہتے تھے، اکبر ہر قیمت پر مغرب کا سودا نہیں کرنا چاہتے تھے، بایں ہمہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ اکبر سرسید سے زیادہ دیکھتے تھے اور سرسید سے زیادہ دور تک دیکھتے تھے"[2]

جدید تعلیم کی پہلی درس گاہ کا قیام

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو ایم۔اے۔او ہائی اسکول کا افتتاح سر ولیم میور نے کیا، سرسید اس زمانہ میں بنارس میں تھے، جولائی ۱۸۷۶ء میں پنشن پاکر وہ علی گڑھ میں مقیم ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں کالج کا افتتاح ہوا، اس تاریخ سے کالج نے دن بہ دن ترقی کرنی شروع کی، سرسید کا یورپین اسٹاف منتخب کرنے میں بڑی محنت کی، سرسید کی وفات کے بعد نواب محسن الملک نے علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی کوشش شروع کی تھی، ان کی زندگی میں سات آٹھ لاکھ روپے

---

[1] علی گڑھ میگزین ۱۹۴۷ء [2] ایضاً

جمع ہوئے ان کی وفات کے بعد ہز ہائنس سر آغا خاں نے اس کام کے لئے بڑی محنت کی، بیس لاکھ روپے جمع کئے، ۱۱ر جنوری ۱۹۲۱ء سے علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا۔

نتائج

"اس عظیم تعلیمی تحریک نے جس کی قیادت سرسید احمد خاں نے پوری نصف صدی تک خلوص اور قابلیت کے ساتھ کی تھی بعض قابل قدر نتائج پیدا کئے، اس نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں اس تعلیمی اور اقتصادی خلاء کو بڑی حد تک پُر کیا، جو انگریزی اقتدار اور انقلاب حکومت کے بعد پیدا ہوگیا تھا، ایک حد تک اس نے مسلمانوں سے مایوسی اور بددلی بھی کم کی، اس ادارے نے بڑے لائق نوجوان، صاحب فکر صحافی، اور اہل قلم اور ایسے لیڈر پیدا کئے جنھوں نے بعد میں تحریک خلافت اور تحریک آزادی ہند کی رہنمائی کی"[1]

سرسید نے جب اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا تو اس وقت مسلمان بکھرے ہوئے تھے، ان کا مرکز نہ تھا، سرسید کی آواز نے انھیں چونکا دیا، سرسید نے قوم کے سامنے علی گڑھ کا خواب پیش کیا، اور قوم نے اس خواب کو پورا کرنے کے لئے ان کا ساتھ دیا، قوم کے بہترین دماغوں اور لائق ترین فرزندوں، مولانا حالی، نواب محسن الملک، مولانا شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ذکاء اللہ نے سرسید کی صدا پر لبیک کہا[2]۔

مولانا شبلی نے اپنی مثنوی "صبح امید" میں سرسید کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے، اس نئی زندگی اور عام بیداری کا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

باتوں میں اثر تھا کس بلا کا ۔۔۔ ایک بار جو رخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز ۔۔۔ اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز

---

[1] اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش صـ۸۳-۸۴ [2] موج کوثر صـ۶۹

خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو بگل سنے تھے — آندھی ہوئے جو فرشتہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا — مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے — اخبار کہیں، کہیں رسالے
تعلیم کے جا بجا وہ جلسے — گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بے تاب ہر ایک جزو کل تھا — ہر بار بڑھے چلو کا غل تھا

علی گڑھ تحریک انقلابی اور مثبت دعوت کیوں نہ بن سکی

سرسید اور ان کی تعلیمی و اصلاحی تحریک دنیائے اسلام کے لئے کوئی انقلابی دعوت اور تعمیری اقدام ثابت نہ ہو سکی، پہلی بات یہ ہوئی کہ سرسید نے مغربی نظام تعلیم کو ہندوستان کے مسلم معاشرہ کے حالات اور تقاضوں پر ڈھالنے اور اسے اسلامی شکل دینے پر غور نہیں کیا، انھوں نے اس تمدن اور اس کی روح کے قبول کرنے پر بھی شدید اصرار کیا، اس دعوت میں مغربی تمدن سے کھلی ہوئی مرعوبیت مضمر تھی، اخلاق و عقائد پر اس کے کھلے مضر اثرات پڑ رہے تھے، انگریز پرنسپل اور اسٹاف کے غیر محدود اثر و نفوذ کا اثر ملت اسلامیہ کے منتخب اور ذہین نوجوانوں پر پڑ رہا تھا ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے خالص مغربی تھی، ہندوستانی مسلمانوں میں وہ ایسے طبقے پیدا ہو گئے جن میں باہم کوئی ہم آہنگی نہیں تھی، سرسید کے حلقے کے ایک مبصر لکھتے ہیں:-

"سرسید کی تحریرات کے مقابلہ میں علماء کی جماعت کے حملے سرسید اور علی گڑھ کے مجوزہ مدرسۃ العلوم پر ہوتے تھے، اس کشاکش نے ایک ایسا لٹریچر پیدا کر دیا جو

دونوں کے لئے شرمناک تھا، اس سے بظاہر فریقین کو اور دراصل کل قوم کو نہایت نقصان پہونچا، علماء کے اعتراضات سے سرسید کی تعلیمی تحریک عام مسلمانوں کے نزدیک مشتبہ ہوگئی اور سرسید کے اعتراضات سے علماء متقدمین اور متاخرین کی وقعت، سرسید کے متبعین کے دلوں سے اُٹھ گئی، مسلمانوں کا ماضی ان کی نظروں میں تاریک ہوگیا، ان امور سے علمائے دین کا اثر قوم پر سے اٹھ گیا، اور حکام وقت کو مسلمانوں کی کل جماعت سے اندیشہ کی کوئی بات باقی نہ رہی، جس کی انھیں عرصہ سے تمنا تھی"[1]

علوم میں ان کا سارا زور انگریزی زبان وادب کے حصول پر تھا، اور علمی علوم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں تھی، بلکہ انھوں نے صنعتی تعلیم کی تحریک و تجویز کی سخت مخالفت کی تھی، علمی معیار و اخلاقی پستی کا ذکر خود سرسید نے ۱۸۹۰ء کے ایک مضمون میں کیا ہے :-

"تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جارہے ہیں"

مولانا حالی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں :-

"جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے لیکن آخر عمر میں کالجوں کے طلباء کو دیکھ کر انھیں مایوسی ہونے لگی تھی"

مولانا شبلی جو عرصہ تک علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں اور سرسید کے رفیق کار کی حیثیت سے خدمت کرتے رہے لکھتے ہیں :-

"انگریزی خواں نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت بھی آزادی بلند حوصلگی نام نہیں بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے"

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱۹۲

غرض وہ نسل وجود میں نہیں آسکی جو عقیدہ اور اصول میں مضبوط و مستحکم اور جدید علوم اور مغربی ثقافت کے اچھے پہلوؤں سے آراستہ ہو کر خود اعتمادی کے ساتھ عالم اسلام کی قیادت کا خلاء پر کرتی، جس قیادت کا عالم اسلام بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ عرصہ سے منتظر اور چشم براہ تھا۔

چوتھا باب

تحریک ندوۃ العلماء

تحریک ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بعد وجود میں آئی، گویا ندوۃ العلماء کی تاسیس اس وقت ہوئی جب کہ قدیم و جدید مکتب خیال کی دونوں تحریکوں کی سرگرمیوں کو پرسوں بیت چکے تھے، دیوبند کے قیام کو ۲۶ سال ہو چکے تھے، اور علی گڑھ کا ایم اے او کالج اپنی عمر کی اٹھارویں منزل پوری کر رہا تھا، علی گڑھ اور دیوبند کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں کے عین عہد شباب میں اور ان کے ربع صدی کے تجربات کے بعد وہ کیا اسباب تھے جس نے ندوۃ العلماء کی تاسیس و تکمیل پر ملت اسلامیہ کے چند دردمند حضرات کو مجبور کیا۔؟

اغراض و مقاصد

ندوۃ العلماء کے قیام کے اسباب کے ادراک کے لئے اس مجلس کے اغراض و مقاصد کے جائزہ سے مدد ملے گی، اس تحریک کے پیش نظر ابتدا میں دو مقاصد تھے۔

(۱) علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) رفع نزاع باہمی یعنی اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

تحریک ندوۃ العلماء جوں جوں آگے بڑھتی رہی، اس نے اپنے دائرۂ کار اور بنیادی مقاصد

میں اضافہ کیا، اب گویا مندرجہ ذیل چار مقاصد تحریک ندوۃ العلماء کے بنیادی مقاصد قرار پائے:

(۱) علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

(۲) ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب و سنت کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کی نبض شناس ہوں۔

(۳) اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

(۴) اسلامی تعلیمات کی اشاعت، بالخصوص برادرانِ وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

نصاب تعلیم کی اہمیت

انسانی ذہن و فکر کی تعمیر، قول و فعل، فکر و عمل میں توازن، اور کردار سازی میں نصاب تعلیم اور نظام تربیت سب سے مؤثر کردار ادا کرتا ہے، قوموں کے عقیدے اور عمل اور معاشرے کا مزاج و رجحان، حکومت کی ساخت اور تنظیم یہ سب کچھ نظام تعلیم و تربیت کے تابع اور زیر اثر ہوتے ہیں۔

یورپ کی مادہ پرست تہذیب، سائنس و صنعت کے میدان میں اس کی برق رفتاری، اس کرۂ ارض کے وسیع رقبے پر اس کے سیاسی تسلط اور غلبے کے نتیجے میں اٹھارویں صدی عیسوی کے بعد پوری دنیا خاص طور پر عالم اسلام ایک نئی پیچیدہ صورت حال سے دوچار تھا، یورپ نے اپنے اقتدار، نوآبادیاتی نظام اور استعماری غلبے کی مدت دراز تر کرنے کے لئے ذہن و فکر کے بدلنے میں ان تمام ذرائع کو استعمال کیا، جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا تھا۔

نظام تعلیم وہ سانچہ ہوتا ہے، جس پر ڈھلنے والا دماغ خالق و مخلوق معاشرت و معیشت کے سلسلے میں مخصوص تصور رکھتا ہے، ہمارے ملک میں ذہنی و فکری دنیا میں نازک صورت حال اس وقت پیدا ہو گئی جب انگریزوں نے نظام تعلیم کی دوئی، ثنویت کا تصور یہاں کے عوام میں

عام کیا اور خواص کے دماغوں میں اسے جاگزیں کیا۔

قصۂ قدیم و جدید

یورپ میں مادی فکر اور مادیت کی علمبردار جماعت مذہب اور اس کے علمبرداروں کو شکست دے کر اقتدار پر متمکن ہوئی تھی، اس نے عیسائی مذہب کو جس نے اپنی افادیت کھو دی تھی "انسانی زندگی کا پرائیویٹ معاملہ" کہہ کر کلیسا میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا، اور دنیا میں یہ واقعہ مذہب کی شکست و ناکامی کی حیثیت سے مشہور کیا گیا ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

نظام تعلیم میں قدیم و جدید، دین و لادینیت یا دین و دنیا کا جو فتنہ کھڑا کیا گیا، ان میں سب سے زیادہ نقصان امتِ دعوت یعنی مسلمانوں کو پہونچا اور اس نقصان کا لامتناہی سلسلہ ہنوز عالم اسلام اور نتیجتاً پوری دنیا میں جاری ہے۔

مسلم ممالک کا انتشار

مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی وہ کثیر آبادی جس کے پاس قدرتی وسائل اور آسمانی نعمتوں کی بہتات ہے آج اپنے اندرونی نظام میں انتشار و بدنظمی کا شکار ہے، بیرونی دنیا میں ان کی کوئی وقعت و وزن نہیں، اس کا اہم سبب برآمد نظام تعلیم اور اس کی شنویت ہے جس نے گزشتہ سو سال میں اس نسل کو پیدا کیا جو برائے نام تو مسلمان ہے لیکن جسے اسلام سے خلوص و عقیدت کا

تعلق نہیں ہے، وہ خود اس اعلیٰ نظریۂ حیات سے (جس میں دنیا و دین، مادیت و روحانیت کا حسین امتزاج ہے) بے خبر اور نابلد رہ کر اپنے ملک و معاشرے کی اس اکثریت کے مزاج، رجحان، خواہش اور عقیدے کے برخلاف ایسے نظریات کو ملک و قوم پر مسلط کرتی ہے جس میں نہ انسانیت کے عزت و احترام کا کوئی سامان ہے اور نہ اس کی فطری نشوونما کی کوئی ضمانت ہے، مسلم ممالک کا برسر اقتدار طبقہ خالص دنیوی ترقی اور مادی فتوحات کے حرص میں وہ مغربی تعلیم پاتا رہا جس میں اس کی ایمانی، ملی، دینی، اور اخلاقی خودکشی کا بھرپور سامان تھا، وہ یورپ کی آئی ہوئی ہر چمکدار چیز کو سونا سمجھ کر اس کی طرف لپکتا ہے، مغرب کے مادہ پرست نظام تعلیم نے اس کی نگاہوں میں اخلاقی اقدار اور ماضی کی روایات کو بہت حقیر کر دیا ہے، یہ طبقہ گزشتہ دو سو سال کے خاص طور پر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے وسط تک منصوبہ بند طریقے سے مغربی سانچوں میں ڈھلتا رہا، عالم اسلام کے انتشار اور وہاں آئے دن برپا ہونے والے انقلابات اور سیاسی تبدیلیوں کا سب سے اہم سبب نئے نظام تعلیم کی پروردہ قیادت ہے۔

ندوۃ العلماء کی تحریک کی فکری اساس

ندوۃ العلماء کی تحریک کی فکری اساس کیا تھی، اس کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی وجہ سے وہ ملت کی (اس کے اصل مزاج اور بنیادی ساخت کے مطابق) رہنمائی، حفاظت اور اس کو وقت کے خطروں سے بچانے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی تھی، اس حقیقت کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے "حیات عبدالحی" میں بڑی خوبی اور ایجاز کے ساتھ بیان کیا ہے، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ نے ندوۃ العلماء کی تحریک کو شروع سے اپنی دلچسپی اور سرگرمی کا مرکز کیوں بنایا اور اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں اس پر کیوں مرکوز کر دیں اس کو بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:-

"۱۔ اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیم جدید اور تہذیب مغربی کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے برخلاف) خالص دینی تھی، یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا گیا تھا، اور اسی کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا تھا، یہ وہ عقیدہ اور طریق فکر تھا جو ان کے تمام مضامین اور خطبات میں جھلکتا ہے، اور اس خط میں جو سرسید کے نام لکھا گیا ہے، بہت صاف نظر آتا ہے۔

۲۔ اس تحریک میں طبقۂ علماء کو (جو شریعت اسلامی کا حامل و امین، کتاب و سنت کا شارح و ترجمان اور اسلام کا اصل نبض شناس ہے) مرکزی مقام دیا گیا ہے، اور اسی کو امت کی تعمیر و تخریب، ترقی و تنزل اور اصلاح و فساد کا اصل ذمہ دار قرار دے کر اپنی دعوت و جد و جہد کا محور بنایا گیا ہے کہ امت میں اصلاح حال کی کوئی کوشش حقیقی طور پر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی، جب تک علماء اس کے داعی و علمبردار نہ بنیں اور ان میں امت کی رہنمائی و قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو، اس کے لئے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت ہے، دوسری طرف حالات زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی۔[1] وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"۳۔ اس تحریک کا مزاج (سیاسی و ہنگامی کے بجائے) علمی و فکری تھا، اور یہی ان کا اصل مزاج تھا۔

۴۔ ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز ہی اصلاح و ترقیٔ نصاب کے کام سے ہوا تھا، اور یہ بات ان کے فکر و مطالعہ سے پوری مطابقت رکھتی تھی۔[2] مولانا مدظلہ مزید تحریر فرماتے ہیں:۔

"۵۔ ان کا جس خاندان اور جس ماحول میں نشو و نما ہوا وہ انگریزی تعلیم سے آشنا ہو رہا تھا، اور سرسید مرحوم کی تعلیمی تحریک کی صدائے بازگشت سے اس وقت ہر شہر و قصبہ کے بام و در گونج

---

[1] حیات عبدالحی ص ۱۳۰ [2] ایضاً ص ۱۳۲

پیش تھے، زمانہ کا نیا رخ اور تاریخ کا نیا دھارا ان کی آنکھوں کے سامنے تھا، دونوں تعلیموں کے فیض یافتہ اشخاص سے اُن کا دن رات کا واسطہ پڑتا تھا، اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے ذہنوں، احساسات بلکہ زبانوں اور اصطلاحوں میں بھی کتنا عظیم تفاوت رونما ہو رہا ہے اور ان دونوں طبقوں کے درمیان کیسی وسیع خلیج پیدا ہو رہی ہے جو دین و ملت کے حق میں نہایت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اس کا علاج وہی تھا جو انھوں نے اپنی نوخیز و محدود انجمن کی ایک تقریر میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ "علماء کی کم توجہی کا سبب سب سے بڑا یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ خود زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف ہیں" اور جس کا علاج انھوں نے تجویز کیا تھا کہ "جو لوگ علوم مشرقی و دینیات کی تعلیم قدیم طریقہ پر ہماری قوم کے علماء سے پاتے ہیں، ان کو زمانہ کی ضرورتوں سے واقف کرنا اور جو لوگ انگریزی کالجوں میں مغربی علوم و فنون کی تعلیم پاتے ہیں، ان کو مذہبی معلومات سے مستفید کرنا"۔ دوسری تدبیر وہ تھی جو ندوۃ العلماء نے (اس وقت جب وہ اس کے سرگرم رکن بن چکے تھے) اختیار کی کہ "انگریزی زبان اور بقدر ضرورت جدید علوم کو نصاب میں داخل کیا جائے اور ان کو دینیات اور عربی علوم و فنون کے ساتھ پڑھایا جائے"۔[1]

ندوۃ العلماء کے دور اندیش بانی

بیسویں صدی کے آخری ربع میں ہم جب عالم اسلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے دل میں ندوۃ العلماء کے بانیوں اور ان سے پہلے سرسید احمد خاں کا انقلابی نعرہ بلند کرنے والوں ان جگر بیں شخصیتوں کے بارے میں احترام و عقیدت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جن کی دور اندیش بصیرت اور حقیقت پسندی نے ایک صدی قبل اپنے اس دور کے انجام کو دیکھ لیا تھا اور اصلاح

---

[1] حیات جاوید ص ۱۳۲ ج ۱ طبع دوم ۱۹۴۳ء

ہے کہ انیسویں صدی کی یہ جبری شخصیتیں اپنے ایمان راسخ اور چشم بصیرت سے اس قیادت کو دیکھ رہی تھیں، جو اسلامی شریعت کو قصۂ پارینہ، قرآنی تعلیمات کو بازیچۂ اطفال بتانے والی تھی، اور جو عالم اسلام اور ملت اسلامیہ پر مسلط ہو کر اپنے عوام سے محاذ آرائی اور ان کی سرکوبی پر اپنی پوری توانائی اور صلاحیت صرف کرنے والی تھی، ان سب فتنوں کے سدباب کے لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اپنے مقاصد میں اولین اہمیت نظام تعلیم میں تبدیلی اور اصلاح نصاب کو دی۔

گزشتہ باب میں ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی مکمل حکمرانی کے نتیجے میں مسلمانوں کی ابتر حالت کی اصلاح کی جو تحریکیں شروع ہوئیں ان میں دو ممتاز تحریکیں، دو انتہا پسند نظریات اور رجحانات پر قائم تھیں، علی گڑھ کی تحریک مغرب کے رنگ میں رنگ جانے کی دعوت تھی تو دوسری طرف دیوبند ہر اس چیز سے اور اس بات سے گریز کی داعی تھی جس پر یورپ کی چھاپ یا مغرب کی تہمت ہو، ان دونوں طبقوں کا باہمی بُعد اور بعض بدیہی حقائق سے انکار کا مزاج کچھ اس قسم کا بن گیا تھا کہ ؎

واعظ ادھر یہ سلسلۂ نے کے جواز میں
اقبال کر یہ ضد ہے کہ پیتا ہی چلا ہے

یا اکبر الہ آبادی کی ظریفانہ مگر حقیقت پسندانہ رنگ میں ؎

قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبر — تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں — خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ ادھر نہ ادھر — زیادہ سست یہ پاؤں سب نے ہیں پیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لیمن بھی چھو نہیں سکتے — ادھر یہ دھن ہے کہ سلفر ہو یہ ہو وہ

ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

غرض وہ گورنر عذاب است جان بیخبر را بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلا

انگریزوں کے تسلط کے بعد مسلمانوں کے یہ دونوں گروہ جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے تھے، اکبر الہ آبادی نے اس قطعے میں جو تصویر کی ہے وہ شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ جیتی جاگتی حقیقت ہے، ندوۃ العلماء کے روشن ضمیر بانیوں نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ نہ مغرب سے بیزاری اسلام کا مطالبہ ہے نہ مشرق کی ہر چیز کو گلے لگانا ایمان کا تقاضہ ہے۔

قدیم صالح اور جدید نافع کا حسین امتزاج ندوۃ العلماء کی دعوت تھی جس کی پذیرائی اور اس میں مضمر حقائق و مفادات کا ادراک آج سے پون صدی قبل کیا جاتا تو عالم اسلام کو آج کا روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

چھٹی صدی مسیحی انسانی تاریخ کا وہ موڑ ہے جس میں اتر کر جزیرہ عرب سے سوئے قوم وہ انسان آیا جس نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں اور باریک سے باریک جزئیات کے لئے رہنما اصول عطا فرمائے، اپنے ماننے والوں کو اس نے معاد سے لے کر معاش تک، دین سے لے کر دنیا تک، تعلیم کے مدرسوں سے لے کر ذکر کے حلقوں تک، غرض ہر شعبۂ حیات میں اپنی رہنمائی اور ہدایات سے مالا مال کیا، مسلمانوں نے اپنی قومی زندگی میں جب تک اسوۂ نبوی کی اس جامعیت اور ہمہ گیری کی پیروی کی اور اس کی دعوت دی وہ برابر زمین کے رقبے اور انسانوں کے ذہن و دماغ پر چھاتے چلے گئے لیکن جب ان کی قومی زندگی میں جامعیت اور ہمہ گیری کے تصور میں کمی آئی تو وہ اقوام عالم کی نظروں میں حقیر اور کرۂ ارض پر بے حیثیت بن کر رہ گئے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی قیامت تک کے لئے نمونۂ عمل ہے آپ خدا تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپ کی دعوت کو قیامت تک ہر عصر، ہر طبقہ، ہر خطۂ زمین میں پہونچنا ہے اور انسانی فطرت کے پکار کی "لبیک" بننا ہے، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے حالات اس بات کا تقاضہ کر رہے تھے کہ وہ طبقہ جو دینی تعلیمات اور علوم اسلامیہ کا امین، وارث، جانشین اور مبلّغ ہے، وہ صورتِ حال کا حقیقت پسندی سے جائزہ لے کر ایسی تبدیلی لائے جس میں دینی معتقدات تو اپنی اصل روح کے ساتھ برقرار رہیں، ان کی حقیقی روح پر ذرا آنچ نہ آئے لیکن دوسری طرف وہ نئے حالات کو سمجھ کر ان علوم و فنون کو حاصل کرنے میں بھی کوشاں ہو جنہیں دین کا خادم بنا کر اسلام کی اشاعت کا کام لیا جا سکتا ہے۔

دینی مدارس کا حال

حالات کا تقاضہ خطرات کی پے در پے بجنے والی صدائے جرس قدیم مدارس میں کوئی بیداری، جنبش اور حرکت نہیں پیدا کر سکی، قدیم عربی مدارس کتاب و سنت پر استقامت اور صلابت کے طریقۂ تعلیم پر اصرار کی قابل قدر کوشش کے ساتھ نئے مسائل پر توجہ اور نئے سوالات کے جواب کی فکر کما حقہ نہ کر سکے، انھوں نے اقدامی پوزیشن کے بجائے دفاعی پوزیشن پر قناعت کر لی۔

قیام ندوۃ العلماء سے پہلے قدیم عربی مدارس میں رائج نصاب تعلیم پر ایک نظر ڈالنے پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان درس گاہوں میں معقولات کی ان کتابوں پر (جن کی ضرورت بیسویں صدی میں نہیں تھی) غیر معمولی توجہ، اساتذہ کی محنت اور طلبہ کا قیمتی وقت صرف کیا جا رہا ہے، اس کے برعکس دینی علوم بالخصوص قرآن پر، اور بعض قدیم مدارس میں جو معقولات میں خاص شہرت و امتیاز رکھتے تھے، حدیث و فقہ پر بھی بہت کم توجہ ہے، قدیم حلقۂ درس کے

ایک قابل احترام بزرگ اور دارالعلوم دیوبند کے سرپرست مولانا رشید احمد گنگوہی معقولات کی تعلیم پر اپنی بیزاری کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"فلسفہ محض بے کار ہے، اس سے کوئی نفع معتدبہ حاصل نہیں ہوا ہے اس کے کہ چار سال ضائع ہوں اور آدمی خود دماغ، جنی دینیات سے ہو جائے، کج فہم اور کوتہ فہم شرعیات سے ہو جائے اور کلمات کفریہ زبان سے نکال کر ظلمات فلسفہ میں قلب کو کدورت ہو جائے، اور کوئی فائدہ نہیں ہے"[1]

عام عربی مدارس جو دین کے نمائندہ ادارے اور دین کے داعیوں اور مبلغوں کو ڈھالنے والے محل تھے، ان کا تعلق تمدن و تہذیب کی لازوال قوت سے کمزور پڑ چکا تھا، جدید افکار و نظریات کی حاقیت کی روشنی یا ہوا تک کا وہاں گزر نہ تھا، وہ نصاب تعلیم جو (صالح دماغوں) ذہنی نشوونما میں معاون ثابت نہ ہو، اس سے غنی والا ذہن و دماغ باہمی منافرت، فلسفیانہ مباحث، احتمال آفرینی اور فقہی اختلافات کی نذر ہو جاتا ہے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء نے اپنے فاضلانہ و محققانہ مضمون میں ہندوستان کے نصاب تعلیم کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے، یہ مضمون اس موضوع پر ایک اہم اسناد اور سند کی حیثیت رکھتا ہے، جن لوگوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا انھوں نے عام طور پر اس سے استفادہ کیا ہے، یہ مقالہ ایک ایسے فاضل کے قلم سے نکلا ہے، جو اسی نصاب درس کا ساختہ پرداختہ تھا اور جس نے اس کی تحصیل اپنے عصر کے فاضل ترین اساتذہ سے اور خاص طور پر جہاں سے یہ نصاب مرتب ہو کر سارے ایشیا میں پھیلا تھا یعنی فرنگی محل کے ممتاز دکھنہ مشق اہل درس سے کی تھی، پھر اس کے قلم سے علماء ہند کے حالات و تذکرہ میں نزہۃ الخواطر

---

[1] سوانح قاسمی ج ۲ ص ۲۹۵

کی آٹھ ضخیم جلدیں اور ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کی تاریخ وارتقاء کی داستان اور ہندوستانی علماء کی ان علوم میں تصنیفات کی مکمل ڈائرکٹری "معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف"[1] کے نام سے نکلی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اس زمانے میں جو نصاب رائج ہے، وہ درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے، کیونکہ درس نظامیہ میں منطق میں مندرجہ ذیل کتابوں کا اضافہ بغیر فکر وغور کے خود بخود ہوگیا ہے، غلام یحییٰ، ملا حسن، حمداللہ، قاضی مبارک اور بعض مقامات شرح سلم العلوم عبدالعلی بحر العلوم، اور حاشیہ عبدالعلی بر میرزاہد رسالہ، اور کہیں کہیں شرح سلم ملا مبین بھی۔

اس اضافہ کی تاریخ بہت دلچسپ ہے، مولوی محمد فاروق صاحب چریاکوٹی اپنے استاد مفتی محمد یوسف سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے بچپن میں شرح سلم علی العموم رائج نہیں تھی، بلکہ قاضی مبارک کے شاگرد مولوی مدن وغیرہ اپنے شاگردوں کو سلم کے ساتھ شرح سلم قاضی مبارک بھی پڑھاتے تھے، اور ملا حسن کے شاگرد شرح سلم ملا حسن پڑھاتے تھے، پڑھانے میں ایک دوسرے پر نوک جھونک بھی ہوجاتی تھی، اس لئے ایک کو دوسرے کی کتاب کا دیکھنا ضروری تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوگئیں جن کو ہم اگر کہنا چاہیں تو صحیح طور پر ناخواندہ مہمان یا سبزۂ خودرو سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

اس نصاب کے حسن وقبح پر بارہا مفصل اور بسیط تقریریں ندوۃ العلماء کے

---

[1] یہ کتاب دمشق کی رائل اکیڈمی "المجمع العلمی" کی طرف سے ۱۹۵۶ء میں "الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند" کے نام سے شائع ہوئی، اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں" کے نام سے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔

جلسوں میں کی گئی ہیں، اور بڑے بڑے مضامین لکھے گئے ہیں، لہذا مجھکو اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ میں استیعاب کے ساتھ ان تقریروں کا اعادہ کروں، ضرورتِ مقام کے لحاظ سے صرف ان نقائص کو بدفعات ذیل میں بیان کرتا ہوں جو وقتاً فوقتاً ظاہر کئے گئے ہیں:-

۱ــ اس نصاب میں قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اور تحصیل فن کی طرف توجہ کم کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ طلباء میں ضرورت سے زیادہ احتمال آفرینی پیدا ہو جاتی ہے لیکن کسی فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا۔

۲ــ منطق کی کتابیں ضرورت سے بہت زیادہ ہو گئی ہیں، شروع سے لیجئے تو پندرہ کتابیں صرف منطق کی اس نصاب میں ہیں، صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، تہذیب شرح تہذیب قطبی، میر قطبی، ملا حسن، حمداللہ، میر زاہد رسالہ، غلام یحییٰ، میر زاہد ملا جلال قاضی مبارک۔

۳ــ منطق کی پندرہ کتابیں نصاب درس میں ہیں، اور تفسیر کی صرف ڈھائی کتابیں، بیضاوی اور جلالین، بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں، جلالین پوری پڑھائی جاتی ہے، لیکن اس کے اختصار کا حال یہ ہے کہ اس کے الفاظ و حروف قرآن مجید کے الفاظ و حروف کے برابر ہیں۔

۴ــ حدیث و تفسیر کو ادب و عربیت سے مدد حاصل ہوتی ہے، اس کا حصہ بہت کم ہے، بلاغت میں صرف دو کتابیں درس میں ہیں، مختصر و مطول، مختصر پوری پڑھائی جاتی ہے، اور مطول "انا نافلۃ" تک یعنی ۱/۴ سے بھی کم۔

۵ــ منطق کی کتابیں جو درس میں داخل ہیں، ان میں غلط مبحث بہت ہے، ملا حسن، حمداللہ

اور قاضی ہیں تو منطق، لیکن ان میں منطق کے جس قدر مسائل ہیں اس سے کہیں زیادہ امور عامہ اور فلسفہ کے مسائل ہیں، جعل بسیط اور جعل مرکب، علم باری، کلی طبعی کا وجود فی الخارج وغیرہ وغیرہ ایسے اہم مسائل ہیں، جن میں مصروف ہو کر طالب العلم کو منطق کے خاص مسائل کی طرف بہت کم توجہ ہو سکتی ہے۔

۶۔ اس نصاب میں تاریخ، جغرافیہ، علم اعجاز القرآن اور ضروری علوم بالکل نہیں"[1]

مولانا شبلی اپنے مضمون "ندوہ اور نصاب تعلیم" میں لکھتے ہیں:۔

"موجودہ نصاب میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں، جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے، یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بیکار ہو جائیں، مثلاً شمسیہ میں یہ عبارت تھی کہ "العلم اما تصور فقط وھو" قطبی میں اس کے متعلق ایک بڑی بحث اس بنا پر چھیڑ دی گئی کہ ھو کی ضمیر تصور کی طرف پھرتی ہے یا تصور فقط کی طرف، اس بحث میں قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف ہو گئے لیکن اگر مصنف ضمیر کے بجائے خود مرجع کو ذکر کر دیتا تو یہ تمام بحثیں رائگاں ہو جاتیں، اس طرح بجائے اس کے کہ اصل مسئلہ پر وقت صرف کیا جائے مصنف کے ایک خاص لفظ اور اس کے منشاء پر بے فائدہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے، نصاب موجودہ کی اکثر کتابوں کی یہی حالت ہے، یعنی جس قدر اصل فن کے مسائل ہیں ان کے قریب بلکہ ان سے زیادہ فضول لفظی مسائل ہیں"[2]

مولانا عبدالحق حقانی لکھتے ہیں:۔

"فن تاریخ و جغرافیہ کو ہمارے بڑے قابل علماء جو جعل مؤلف اور جعل بسیط کی موشگافی میں

---

[1] ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات۔ از مولانا حکیم سید عبدالحئی صفحہ ۲۲، ۲۳ [2] الندوہ ج ۱ نمبر ۲ صفحہ ۳۴-۳۴

شیخ بوعلی کے کان کاٹنے کو تیار ہیں، محض بیکار سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ قرآن و احادیث و فقہ پڑھاتے وقت یہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فرعون اور اس کی قوم قلزم میں غرق ہوئی تھی یا رود نیل میں اور مصر قدیم، قلزم سے کس طرف ہے، اور رود نیل کس طرف، اور نہ وہ کتاب الجغرافیہ پڑھتے وقت حدود عرب کو سمجھ سکتے ہیں، فن تاریخ سے بھی بے خبر ہیں اسی طرح فن ادب سے ناآشنائی ان کو قرآن و احادیث کے غوامض و اسرار بلاغت نہیں سمجھنے دیتی اور نہ ان کو خود اس قدر استعداد ہوتی ہے کہ وہ قلم برداشتہ فصیح عربی میں کچھ لکھ سکیں اسی طرح ریاضیات کے فنون سے بھی بے بہرہ ہوتے ہیں، ادیان منسوخہ سے بھی محض ناآشنا ہوتے ہیں، انھیں نہیں معلوم کہ توریت موجودہ کیا ہے اور انجیل کیا ہے اسی طرح باوجودیکہ ہندوستان کے رہنے والے ہیں، مگر ہنود کے مذہب سے محض ناآشنا"

(مضامین ثلثہ ص ۲۸)

مشہور مصری فاضل مفتی محمد عبدہ کے شاگرد رشید علامہ سید رشید رضا نے اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں جو انھوں نے اجلاس ندوۃ العلماء (۱۹۱۲ء) میں دیا تھا، قدماء کے طرز تصنیف پر روشنی ڈالنے کے بعد (جس میں فن کی تحصیل و تسہیل پر زور دیا جاتا تھا) فرمایا:-

"پھر ہمتیں پست ہوگئیں اور تحقیقات کا شوق دھیما ہوگیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی کتابوں کے خلاصے لکھے جانے لگے جس میں مختلف علوم کے ضروری قواعد اور مسائل مختصر عبارت میں بیان کئے جاتے تھے، اور ان کے ساتھ مثالیں اور دلیلیں درج نہیں کی جاتی تھیں، پھر اختصار کی نے یہاں تک بڑھی کہ ایک مصنف کسی علمی مسئلہ کو ایک وقت جس مختصر عبارت میں لکھتا تھا، دوسرے وقت خود اس کو نہ سمجھ سکتا تھا، اس کے بعد وہ زمانہ آیا جس میں ان خلاصوں کی شرحیں اور شرحوں کی شرحیں لکھی جانے لگیں اور رفتہ رفتہ ان شرحوں

پڑھی حاشیے چڑھنے لگے، اس زمانے میں طریقۂ تعلیم یہ نکلا کہ کسی فن کی کتاب استاد کے ہاتھ میں ہے اور شاگرد اس کے روبرو اول اس کتاب کا متن پڑھتے ہیں پھر اس کی شرح، پھر اس کا حاشیہ، اس کے بعد استاد تقریر کرتا ہے، ان تمام کوششوں کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ ایک مختصر کتاب کی عبارت سمجھ میں آجائے اور اس عبارت کے حل کرنے کے لئے اور جس نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی سمجھ لیا جائے"[1]

اس کے بعد فن بلاغت و معانی و بیان کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"اسرار البلاغۃ شیخ عبدالقاہر جرجانی کی تصنیف ہے اور علم بیان کے مسائل اس میں بیان کئے گئے ہیں، دلائل الاعجاز بھی ایک ایسی ہی کتاب علم معانی میں ہے، ان دونوں کتابوں کو دیکھ کر اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ طریقۂ تصنیف اور طریقۂ تعلیم کو زمانہ مابعد میں کس قدر تنزل ہوا ہے، یہ پہلی کتابیں ہیں جن میں فن بلاغت مستقل طور پر مدوّن کیا گیا ہے اور اس میں کلیّہ قاعدے بیان کئے گئے ہیں، یہ کتابیں ان کتابوں سے کہیں زیادہ افضل اور مفید ہیں، جو ان کے بعد اور انہی کی مدد سے لکھی گئی ہیں اور درس میں جاری کی گئیں مثلاً مفتاح سکاکی و مختصر علامہ تفتازانی، ان کے بعد کی کتابوں کا اثر یہ ہوا ہے کہ ممالک اسلامیہ کے مدارس میں عربی زبان کی بلاغت مردہ ہوگئی ہے، میں نے اور شیخ محمد عبدہ مرحوم نے حجاز، عراق اور قسطنطنیہ میں اسرار البلاغۃ اور دلائل الاعجاز کی تلاش کرائی اور جب ان کتابوں کے نسخے مل گئے تو ان کی تصحیح کی اور ان کو چھپوایا، شیخ مرحوم نے ان کتابوں کا درس جامع ازہر میں دیا اور بہت سے طلبہ ان کے حلقۂ درس سے مستفید ہوئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ازہر میں عربی زبان کی فصاحت و بلاغت از سر نو زندہ ہوگئی، حالانکہ اس سے پہلے وہ مر چکی تھی"[2]

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کے مقالہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ نصاب ہمیشہ

---

[1] خطبۂ صدارت علامہ سید رشید رضا در اجلاس سیزدہم ندوۃ العلماء ۱۹۱۲ء ص ۲۸-۳۰ [2] ایضاً۔

تبدّل و تغیر حذف و اضافہ کی منزلوں سے گزرتا رہا ہے' مقالہ نگار نے بڑی دیدہ وری اور ریزہ چینی کے ساتھ اس کی عہد بعہد تبدیلیوں اور ترمیم و اضافہ کی مفصّل روداد پیش کی ہے' اور بتایا ہے کہ کس عہد میں اور کن عوامل و محرکات کے ماتحت اس میں تبدیلی کی گئی کس زمانہ میں کس علم کا غلبہ رہا اور وہ معیار فضیلت و شرط کمال سمجھا گیا اور اس زمانہ میں کس فن کا پلہ بھاری رہا، اس سے یہ قطعی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان میں ہماری تعلیمی تحریک کے رہنما اور اسلامی علوم کے خادم و ناشر بڑا بر زمانہ کی تبدیلیوں کا احساس اور حقیقت پسندی سے کام لیتے رہے' اور وہ کبھی بھی لکیر کے فقیر نہیں بنے۔

لیکن ہندوستان کی علمی تاریخ کا ایک عجوبہ اور ذہنی و علمی نشأۃ و ارتقاء کے لحاظ سے ایک المیہ ہے کہ جس عہد میں سب سے بڑا (سیاسی و علمی و فکری) انقلاب آیا اور جب اس نصاب کو وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں کی تکمیل کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، ٹھیک اسی زمانہ میں یہ وقوف و جمود کا شکار ہو گیا، اور ہر طرح کی تبدیلی و ترقی کے لئے دروازے بند کر دیئے گئے، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے بڑی خوبی سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے' وہ لکھتے ہیں :-

"علوم اسلامیہ کا قدیم نصاب تعلیم اس زمانہ میں تو برابر بدلتا اور زندگی کا ساتھ دیتا رہا جس میں انقلابات بہت دیر میں آتے تھے' اور ان کی نوعیت میں بنیادی فرق نہیں ہوتا تھا' یہ انقلابات اشخاص اور حکمراں خاندانوں کی تبدیلی کا نام تھے' لیکن اس کے باوجود واضعین نصاب اور عالم اسلام میں علمی و تعلیمی تحریک کے رہنما برابر اپنی ذہانت و حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے رہے' اور تبدیلی و اضافہ سے کام لیتے رہے، لیکن جب انیسویں صدی کا وہ زمانہ آیا جس میں حکمراں خاندانوں کا نہیں بلکہ تہذیبوں اور افکار و اقدار کا انقلاب رونما ہوا اور انقلابات کی کثرت اور شدت دونوں حد سے متجاوز ہو گئیں تو یہ نصاب ایک منزل پر آکر ٹھہر گیا' اور اس نے ہر تغیر و اضافہ سے انکار کر دیا، مضامین' مقررہ کتابوں اور طرز تعلیم' ہر چیز میں

اس روش پر اصرار کیا گیا جو ہندوستان میں بانی درس نظامی (ملا نظام الدین لکھنوی م ۱۱۶۱ھ) اور مشرق وسطیٰ میں اٹھارہویں صدی کے علماء ازہر کے زمانہ میں قائم ہو گئی تھی، فقہ و قانون اسلامی میں توسیع و اضافہ ان مسائل میں (جو جدید اکتشافات، نئی اقتصادیات اور نئی تنظیمات نے پیدا کر دیئے تھے) اجتہاد سے کام لینا چھوڑ دیا گیا، اجتہاد جو اپنے اعلیٰ نازک اور نہایت ضروری شرائط[1] کے ساتھ بہر حال علماء اسلام کا فریضہ اور بدلے ہوئے زمانہ کی رہنمائی کا ذریعہ تھا، عملاً معطل و مسدود ہو گیا، اور ایک معاصر عرب عالم[2] کے بلیغ الفاظ میں "علماء کے نزدیک اس دروازہ کو کھولنا تو (شرعاً) ممنوع نہیں تھا، مگر جس کنجی سے وہ کھل سکتا تھا، وہ عرصہ سے گمشدہ تھی"۔

اسلامی علوم، معارف قرآنی اور شریعت اسلامی کے لئے جس طاقتور، مؤثر و دلپذیر دلنشیں تعبیر و تشریح اور اس کے لئے زبان و ادب کے اس نئے دور میں جس اسلوب اور پیرایۂ بیان کی ضرورت تھی، وہ اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھا، ایسے علماء خال خال پائے جاتے تھے، جو ان دینی حقائق کی ابدیت، زندگی کی صلاحیت اور اسلام کی فوقیت و برتری کا نقش، جدید طبقہ کے دل و دماغ پر قائم کر سکیں، اور اپنی بھرپور علمی تنقیدوں اور ماہرانہ تحلیل و تجزیہ سے تہذیب جدید کے طلسم کو توڑ سکیں[3]"۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخری زمانہ میں ہندوستان کا نصاب درس ذہنی و علمی انحطاط کا شکار ہو چکا تھا، درس نظامی میں عرصہ تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور جب تبدیلی ہوئی تو بغیر کسی غور و فکر کے جن کتابوں کا اضافہ کیا گیا، وہ شروح و حواشی پر مشتمل تھیں، تصنیف و تالیف اور تحقیق کے میدان میں

---

[1] جن کی تفصیل کتب اصول فقہ میں ہے [2] استاد مصطفیٰ احمد الزرقاء، استاد فقہ اسلامی جامعہ دمشق و سابق وزیر قانون حکومت شام [3] اسلامیت و مغربیت کی کشمکش، از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص ۲۴۹-۲۵۰

شروح وحواشی کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہو رہا تھا" الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف منطق کی شروح وحواشی کی تعداد ۱۱۷ تک پہونچتی ہے جن میں ۳۷ کتابیں سلم کی شرح میں لکھی گئیں۔

اس نصاب سے طلباء میں کسی فن میں کمال تو نہیں پیدا ہوتا البتہ احتمال آفرینی کی عادت پڑجاتی ہے رہ گئی حدیث تو اس کی کتابیں ہر مدرسہ میں رائج نہ تھیں بعض اہل شوق اس کے لئے سفر کرتے اور جہاں یہ متاع گراں مایہ ملتی حاصل کرتے لیکن بالعموم سب طلباء کو اس حصول میں جو دشواری تھی وہ ظاہر ہے مولانا شبلی نعمانی نے قدیم عربی نصاب کے نقائص پر ایک بسیط مقالہ ندوۃ العلماء کے اجلاس سالانہ ۱۸۹۴ء میں پڑھا تھا، اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک نقص یہ ہے کہ منطق کی کتابیں جو درس میں داخل ہیں ان میں غلط مبحث بہت ہے، ملا حسن قاضی ہیں تو منطق میں لیکن ان میں منطق کے جس قدر مسائل ہیں کہیں زیادہ امور عامہ اور فلسفہ کے مسائل ہیں اس نصاب میں ادب وعربیت کا حصہ بہت کم ہے ایک طالب علم ادب سرے سے نہ پڑھا ہو عربی زبان میں دو سطریں نہ لکھ سکتا ہو، قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت کو بیان نہ کرسکتا ہو تو اس کے چہرۂ کمال پر کوئی داغ نہیں، حالانکہ ادب وعربیت کے بغیر تفسیر وحدیث کسی میں کمال پیدا نہیں ہوسکتا اس بنا پر ادب سے بے اعتنائی علوم دینیہ سے بے اعتنائی ہے"

عربی زبان کے ساتھ تاریخی آثار اور مردہ زبان کا معاملہ تھا، حالانکہ یہ ایک ایسی زندہ جاوید، زرخیز اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبان ہے جس میں اسلامی علوم کے علاوہ شعر وادب، تاریخ وفلسفہ اور تصوف کے بیش بہا خزانے اور انسانی ذہانت کے یادگار نمونے پوشیدہ ہیں، درس نظامی میں عربی زبان وادب کے پورے سرمایہ میں سے جو کتابیں انتخاب کی گئی ہیں ان میں سرفہرست مقامات حریری ہے

اس کتاب نے اپنی مسجع عبارتوں، پیچیدہ ترکیبوں اور مشکل و ثقیل الفاظ کی وجہ سے مدرسین و طلباء میں عربیت کا صحیح ذوق پیدا نہ ہونے دیا، نفحۃ الیمن ادبی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے کوئی بلند نمونہ نہیں، اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ادبی ذوق پیدا کرنے اور تحریر و تقریر کی مشق کے لئے نظم کی افادیت ہر زبان میں کم رہی ہے، اور انشاء و ادب کی تعلیم کے لئے ہمیشہ نثر کو مفید سمجھا گیا ہے، عربی زبان کے مشہور ادیب اور انشاء پرداز مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں :۔

"تحریر و تقریر کی مشق عربی میں ترجمانی اور اظہار مافی الضمیر میں جو چیز مفید ہے وہ نثر ہے، نہ کہ نظم، نظم پابہ زنجیر ہوتی ہے اور مقید، اگرچہ نثر بھی ہمارے یہاں نظم سے کچھ کم نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں جو قافیہ بندی اور تکلف و صنعت داخل ہو گئی ہے، اس نے ادب کو بھی نظری علوم کی طرح بنا دیا ہے، جو پڑھائے جاتے ہیں، لیکن برتے نہیں جاتے"

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ :۔

"ایک بہت بڑا اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ موجودہ نصاب میں قرآن مجید کے ساتھ بہت کم اعتنا کی گئی ہے، اور تفسیر و ملحقاتِ تفسیر کی بہت کم کتابیں رکھی گئی ہیں، کل دو کتابیں تفسیر میں داخل ہیں، بیضاوی اور جلالین شریف، بیضاوی کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں، اور جلالین پوری پوری پڑھائی جاتی ہے، لیکن اس کے اختصار کا یہ حال ہے کہ الفاظ اور حروف قرآن مجید کے الفاظ و حروف کے برابر ہیں، قرآن مجید کے ساتھ خصوصی اعتناء بہت درکار ہے"

ایک اور نقص طریقۂ تعلیم میں یہ ہے کہ قدیم علم کلام جو فلسفۂ یونان کے مقابلہ میں ایجاد ہوا تھا بغیر کسی اضافہ اور ترمیم کے درس میں داخل ہے، اس نصاب تعلیم میں ایک خاص نقص یہ ہے کہ وہ ایک خاص سلسلہ پر محدود ہے، قدیم زمانہ میں بہت سے لوگ صرف ایک یا دو فن تحصیل کرتے تھے، اور تحصیل کا

تمام زمانہ اسی خاص فن میں صرف کر دیتے تھے، بہت سے اہل کمال اسی طرز کے تعلیم یافتہ ہیں، اور درحقیقت یہ درس ایک خاص فن میں کمال پیدا کرنے کے لئے نہایت مفید تھا، آج یہ طریقہ بالکل متروک ہے اور اہل فن کے نہ پیدا ہونے کا یہ بھی ایک بڑا سبب ہے۔

اصول فقہ کی تعلیم کا مقصد شریعت میں رسوخ تھا، مگر نہ اجتہاد درمانہ شریعت علم بلاغت کی تعلیم کلام میں زور فصاحت و بلاغت کے لئے دی جاتی ہے اب وہ بھی مصنفوں کی بازی گاہ ہے جو استاد بلاغت کی سب سے بڑی کتاب کا درس دیتے تھے، وہ خود خط نہیں لکھ سکتے تھے، ایک استاد کی شہرت کی بنیاد یہ تھی کہ وہ کتابوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے، فقروں کی ترکیب کر سکتے تھے، شبہات پیدا کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا، وہ آسان کو پیچیدہ اور صاف کو مبہم بنا دیتے تھے، ایک استاد کی شہرت ان کی دینداری اور تنگ نظری کے سبب تھی، وہ معمولی سبب پر لوگوں پر کفر کا فتویٰ لگا دیا کرتے تھے۔

اس تعلیم کا مدار لفظی بحث پر تھا، طالب علم میں بحث و حجت کی صلاحیت پیدا ہوتی تھی، احتمال آفرینی کی عادت پڑ جاتی تھی، بقول شیخ محمد عبدہٗ ایک طالب علم تحصیل علم سے فارغ ہو کر بعض کتابیں سمجھ سکتا تھا، لیکن وہ دنیا کے معاملہ کے بارے میں نابلد ہوتا، وہ جغرافیہ و تاریخ، علوم طبعی، کیمیا اور ریاضی سے کورا ہوتا۔

ترکی

سلطنت مغلیہ کے دبدبے اور رعب و جلال کا جس طرح ہندوستان میں خاتمہ ہو گیا، اسی صورت حال سے سلطنت عثمانیہ بھی دوچار ہوئی، سلطنت عثمانیہ جس سے سارا یورپ ہیبت زدہ تھا، یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ عثمانی سلاطین کی حفاظت اور پناہ میں داخل ہوتے تھے، ان کے

احترام میں کلیساؤں کے گھنٹے بند ہو جاتے تھے، ایک ایسی حکومت جس کا اثر یورپ، ایشیا اور افریقہ تینوں براعظموں پر تھا، جس کے پاس دنیا کا بہترین پایۂ تخت تھا، جس کے بارے میں نپولین نے ایک بار کہا تھا کہ اگر کبھی دنیا کی متحدہ حکومت قائم ہوتی تو قسطنطنیہ ہی میں صلاحیت ہے کہ وہ اس کا دارالسلطنت ہوتا" وہ عثمانی سلطنت یورپ کے اس قدر قریب کے باوجود (جو مختلف علوم و فنون اور تنظیم و ترقی میں برابر فاصلہ دور سے گزر رہا تھا) جمود و تعطل کا شکار تھی، اور اس نے یہ قرآنی ہدایت بالکل فراموش کر دی "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ الاية" آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گویا ان کے ذہن سے محو ہو گیا تھا (الحکمة ضالة المؤمن حيث وجدها فهو أحق بها) "دانائی کی بات مومن کا گمشدہ خزانہ ہے، جہاں اس کو مل جائے وہی اس کا حقدار ہے"۔

اس دور میں ترکی کے علمی اور تعلیمی جمود کا مشہور ترکی فاضلہ خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی ترکی کے علماء اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے، مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسہ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مرکز تھے، مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر نئے علم و حکمت کی بنا ڈالی جس نے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علماء کی جماعت معلمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی، یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا، وہاں سے اب تک آگے نہیں بڑھا، یہ طرز خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظام تعلیم پر حاوی رہا، علماء نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی بلکہ نئے خیالات کو اپنے قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا، مشاہدہ و تجربہ کی محنت کی انھیں فرصت نہیں تھی، سہل نسخہ یہی تھا کہ ابطہ

کے فلسفہ پر قدم جماتے رہیں، علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں، چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا۔[1]

مولانا شبلیؒ کو اپنے قیام قسطنطنیہ کے زمانہ میں یہاں کے نئے طرز کے اسکولوں اور کالجوں کو دیکھ کر جو خوشی ہوئی اسی قدر یہاں کے پرانے عربی مدرسوں کو دیکھ کر تکلیف ہوئی، بلکہ ان کی رائے یہ ہو گئی کہ:-

"موجودہ (پرانی) تعلیم کی پستی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا، وہ اس قدیم نظام تعلیم کی ابتری تھی۔"[2]

قسطنطنیہ میں مولانا شبلی کے علم کے مطابق اس وقت عربی اور مذہبی علوم کے طلباء بیس ہزار سے کم نہ تھے، مگر سب کی حالت افسوسناک تھی، ان کے رہنے کے حجرے تنگ و تاریک، صحن مختصر، مکانات بند بند، ذریعۂ آمدنی زکوٰۃ و خیرات، اپنے سفرنامہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا، وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی، ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں نہ ہو اس کی بے سروسامانی قدرتی بات ہے لیکن قسطنطنیہ، شام اور مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا ہے۔"[3]

مصر

مولانا شبلی نعمانیؒ نے ۱۳۰۹ھ میں ترکی، مصر و شام کا سفر کیا، وہاں انھوں نے بنظر غائر تعلیمی، سماجی، دینی اور سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیا، وہ جب مصر پہونچے تو انھوں نے وہاں کے

---

[1] ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش [2] سفرنامہ روم و مصر و شام صفحہ ۷۸ [3] ایضاً صفحہ ۷۸

قدیم تعلیمی ادارے جامعہ ازہر کے بارے میں جو تأثرات اپنے سفرنامہ میں لکھے ہیں انھیں پڑھ کر ہندوستان کے ان روشن ضمیر اور صاحب بصیرت علماء کی قدر آتی ہے جنھوں نے ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی اور جس کا پہلا مقصد نصاب درس کی اصلاح کو قرار دیا، مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں :۔

"جامعہ ازہر سے قدیم دنیا میں کوئی یونیورسٹی نہیں ہے ۳۷۵ھ میں یہاں باقاعدہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہوا، ابتدا میں طلباء کی تعداد پینتیس ۳۵ تھی ۸۱۸ھ میں طلباء کی تعداد سات سو سے زائد ہوگئی اور آج تو یہ حال ہے کہ کم و بیش پانچ ہزار طلبہ ازہر کے اقامت گاہوں میں رہتے ہیں اور کل بارہ ہزار طلبہ اس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، مگر افسوس کہ تعلیم کا نظام نہایت ابتر ہے منطق، فلسفہ، ریاضی اور دیگر علوم عقلیہ گویا درس میں داخل ہی نہیں، اصول، فقہ، تفسیر، حدیث، ادب معانی کی تعلیم ہے لیکن اس قدر کم ہے کہ اتنے بڑے دارالعلوم کے کسی طرح شایانِ شان نہیں، نحو اور فقہ پر ایک مدت صرف کی جاتی ہے، مگر ان کی تعلیم بھی محققانہ اور مجتہدانہ نہیں، کافیہ وغیرہ کی شرحیں، شرحوں کے حواشی اور حواشی کے حواشی پڑھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں، اور ان کا حفظ کرنا بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے، چونکہ میں نے خود ازہر میں قیام کیا تھا، اکثر طلبہ سے گفتگو رہتی تھی، میں ان کو نہایت معمولی بحثوں میں مصروف دیکھتا تھا، اور افسوس کرتا تھا، اس لغو طریقۂ تعلیم کا اثر ہے کہ ازہر نے ایک مدت سے کوئی قابلِ قدر عالم اور مصنف نہیں پیدا کیا، نہ صف بندی ہے نہ کوئی خاص نصاب ہے نہ امتحان ہے نہ ترقی پانے کے لئے کوئی قاعدہ مقرر ہے، افسوس پر افسوس یہ ہے کہ ان ابتریوں کی اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں۔

کثرت سے ایسے طلباء ہیں جن کے لئے مکان یا حجرہ کچھ بھی نہیں مسجد کے صحن میں یا کوٹھوں بلکہ ہزاروں چھوٹی چھوٹی الماریاں اوپر تلے چنی ہیں، یہی ان کے توشہ خانے ہیں، جن میں

وہ کپڑے اور ضروری سامان رکھتے ہیں، سونے بیٹھنے کے لئے مسجد کا صحن استعمال ہوتا ہے، مسجد میں جا بجا مدرسین درس دیتے ہیں، اور اس قدر شور و غل ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، اس ہنگامے میں جمعیت خاطر ایک طرف مدرسین کی آواز میں بھی طالب علموں کے کان تک پہنچتی ہیں یا نہیں، طلبہ کو معمولی کھانا ازہر سے ملتا ہے لیکن چونکہ روٹیاں ملتی ہیں، اس لئے سالن کا اہتمام انھیں خود کرنا پڑتا ہے، بہت سے طلبہ جن کو چار چار پانچ پانچ روٹیاں ملتی ہیں، نان بائی کو دو تین روٹیاں دے کر اس کے بدلے سالن لیتے ہیں، روٹیوں کی تقسیم کا طریقہ یہ ہے کہ وقت متعین پر طلبہ کا ایک گروہ بازار میں (جو مسجد کے سامنے ہے) دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور روٹیاں تقسیم ہونی شروع ہوتی ہیں، طالب علموں کے ہاتھوں میں کوئی تولیہ یا رومال نہیں ہوتا جس طرح بھیک منگے جو کچھ ملتا ہے ہاتھ پھیلا کر لے لیتے ہیں، ان طالب علموں کا بھی یہی حال ہے۔

مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامعہ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا، ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر حصہ کے مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو جس کے طالب علموں کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو، اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید ہو سکتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ بجائے فائدہ پہونچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے اور کرتا جا رہا ہے، تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مندی بلند نظری، جوش، ہمت غرض تمام شریفانہ اوصاف کا استیصال ہو جاتا ہے[1]:

اس دور میں عالم اسلام کے ایک اور مرکزی مقام مصر اور وہاں کی مشہور اسلامی دانش گاہ جامعہ ازہر

---

[1] سفرنامۂ مصر و روم و شام

کے نظام و نصاب تعلیم پر مصر کے مشہور فاضل احمد امین لکھتے ہیں:۔

"ازہر کے نصاب تعلیم میں جتنی کتابیں داخل درس تھیں، وہ سب متاخرین کے نتائج طبع کا نتیجہ تھیں، مرور زمانہ سے وہ بے روح ہو چکی تھی، نحو کی تعلیم سے مقصد صحیح گفتگو، انشاء پردازی اور ادبی کتابوں کی تفہیم تھی لیکن اب اس علم کا مقصد مؤلفین کے الفاظ کی گرہ کشائی رہ گیا"

ہندوستان اور عالم اسلام کے دینی مدارس اور نظام تعلیم و تربیت و نصاب درس کی اس زبوں حالی پر تحریک ندوۃ العلماء کے مؤسسین کی گہری نظر تھی، یہی وجہ تھی کہ جب ندوۃ العلماء کے زیر انتظام ایک مثالی دار العلوم قائم کرنے کی تجویز ۱۳۱۳ھ میں اسی جلسۂ انتظامی میں پیش ہوئی، (جس کا تفصیلی ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے) تو اس میں خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ ایسے علماء تیار کئے جائیں جو علوم مذہبی میں درجۂ کمال اور دنیا کے حالات و واقعات سے گہری واقفیت رکھتے ہوں، اس ضمن میں بانیٔ ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ لکھتے ہیں:۔

"بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات اور واقعات سے بھی باخبر ہو، اس کو معلوم ہو کہ اصول سلطنت کیا ہیں، مسلمانوں کی دنیوی حالت کیا ہے، ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جا رہا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جاتا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں اور ان کو دنیا کے حال سے بالکل خبر نہیں، اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابل التفات ہے۔

نہایت ضروری ہے کہ ایک جماعت کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت و اطلاع انتظام و تدبر، حزم و مصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، عمرو بن العاصؓ، خالد بن ولیدؓ، ابو عبیدہؓ

کے نقش قدم پر ہو۔"[1]

مولانا شبلی نعمانی" جنھوں نے اس دور کے بعض اہم مسالک کا سفر کر کے بچشم خود دینی تعلیم کا انحطاط و زوال دیکھا تھا، ندوۃ العلماء کا مجوزہ دار العلوم کا نقشہ اپنے الفاظ میں اس طرح کھینچا ہے۔

"تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا خالص دینی اور مذہبی مدرسہ نہیں، جو بلحاظ جامعیت و وسعت و عظمت کے مدرسۂ اعظم کہلانے کا مستحق ہو، یعنی جس میں تمام علوم و فنون یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ کی تعلیم ایسے کمال درجہ تک دی جاتی ہو کہ تحقیق کا مرتبہ حاصل ہو سکے، جس میں اسلامی علوم کی قدیم اور نادر کتابیں فراہم کی گئی ہوں، جس میں طالب علموں کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دی جاتی ہو، جس میں ایسے لوگ تیار کیے جاتے ہوں جو مخالفین کے اعتراضات کا جواب آج کے مذاق کے موافق دے سکیں، جس میں حکومت کی موجودہ زبان بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہو، جس کی عمارت وسیع پُرفضا اور عظیم الشان ہو، اس غرض کو پورا کرنے کے لئے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا دار العلوم قائم کیا گیا۔"

بانیان ندوۃ العلماء کی نظر ان جزئیات پر بھی تھی جو تربیت و معاشرت کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں، مولانا محمد علی مونگیری لکھتے ہیں:۔

"ہر طالب علم کے لئے جدا کمرہ ہوگا، اور بجز خاص حالت کے دو طالب علم ایک کمرہ میں نہ رہیں گے، طالب علموں کو تاکید کی جائے گی کہ وہ اپنے حجروں کو صاف اور پاکیزہ رکھیں، صبح سے شام تک جو اشغال ہیں مثلاً سو کر اٹھنا، نماز پڑھنا، مطالعہ کرنا، مدرسہ جانا، کھانا کھانا، ورزش کرنا سب کے لئے اوقات متعین ہوں گے اور تمام طالب علموں کو انھیں اوقات میں سب کام کرنا ہوں گے۔"

[1] روداد جلسۂ انتظامی ندوۃ العلماء

مجوزہ دارالعلوم کے نصاب تعلیم اور نظام تربیت کے مختلف رہنما اصول تحریر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لڑکے مہذب اور پابند شریعت ہوں کہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکیں، طالب علموں میں دلیری اور بلند ہمتی و عالی ظرفی و فراخ حوصلگی پیدا ہو جو بغیر اس قسم کے دارالعلوم کے جس میں تمام باتیں نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوں حاصل نہیں ہو سکتیں، علوم دینیہ خصوصاً علم کلام میں جس کی اس وقت نہایت ضرورت ہے نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کیا جائے تاکہ الحاد و دہریت کا مقابلہ پورے زور و قوت سے ہو سکے۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے مرتبہ مسودۂ دارالعلوم کی اہمیت دکھاتے ہوئے مولانا محمد الحسنی مرحوم لکھتے ہیں:-

"اس مسودہ میں مولانا نے دارالعلوم کے احاطہ میں مدرسین اور نگراں و مربی حضرات کے مکانات کی تعمیر پر زور دیا ہے، طلبہ کے لئے ایک دارالاکل (ڈائننگ ہال) کی تجویز کی ہے، جہاں طلباء اور اساتذہ یکجا ہو کر کھانا کھائیں گے، طلبہ کی رہائش کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "ہر طالب علم کے لئے جدا کمرہ ہوگا، اور بجز کسی خاص حالت کے دو طالب علم ایک حجرہ میں نہ رہیں گے، طالب علموں کو تاکید ہوگی کہ وہ اپنے حجروں کو صاف اور پاکیزہ رکھیں، صبح سے شام تک جو اشغال ہیں مثلاً سو کر اٹھنا، نماز پڑھنا، مطالعہ کرنا، مدرسہ جانا، کھانا کھانا، ورزش کرنا سب کے لئے اوقات متعین ہوں گے اور تمام طالب علموں کو انہیں اوقات میں سب کام کرنا ہوں گے۔"

ایک خاص بات جو اس مسودے میں نظر آتی ہے، وہ ایک اسلامی لباس (یونیفارم) ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا یہ نقطۂ نظر اور خیال بڑی دور اندیشی اور فطرت شناسی پر مبنی ہے۔

اسی کے ساتھ نماز عصر کے بعد تمام طلبہ گھوڑ سواری، بندوق چلانا، تیراکی اور اس قسم کی

دوسری جسمانی ورزشوں میں حصہ لیں گے، کسب حلال کے لئے بعض فنون صناعیہ سکھائے جائیں گے، مگر اس کا تعین طالب علم کے رجحان اور مناسبت پر ہوگا۔

مہینہ میں دو یا تین مرتبہ طلبہ علمی و اخلاقی مضامین پر مباحثہ (سمپوزیم) کریں گے اور اس کے لئے ایک مخصوص ہال ہوگا، تہذیب نفس اور تزکیۂ باطن کو اس خالص علمی اور انتظامی خاکہ میں بھی مولانا نے فراموش نہیں کیا ہے اور نشانہ بازی، گھوڑ سواری، اور جدید اسالیب تعلیم و تربیت کے ساتھ اس پر بھی زور دیا ہے اور یہ مولانا کی وہ خصوصیت اور جامعیت ہے، جو اس دور کے کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔

اس شعبہ میں مولانا نے تصوف و اخلاق کی دو مشہور کتابیں "احیاء العلوم" اور "عوارف المعارف" کے منتخب حصوں کی سفارش کی ہے اور تفسیر و حدیث کے مطالعہ پر زور دیا ہے۔

مہینہ میں ایک بار عربی زبان میں مباحثہ ضروری قرار دیا ہے، جس کی وجہ اور ضرورت بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ آج کل کے طلبہ بلکہ اکثر علماء کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی عرب آجائے تو اس سے پانچ منٹ تک محاورۂ عربی میں بات چیت نہیں کر سکتے، "اسلامی ممالک کے جغرافیہ پر بھی مولانا نے زور دیا ہے، اور قرآن و حدیث کے مقامات سمجھنے کے لئے اس کی اہمیت واضح کی ہے، یہ خاکہ پیش کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:۔

"ان تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لڑکے ایسے مہذب اور پابند مذہب ہوں کہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکیں، طالب علموں میں دلیری، بلند ہمتی، عالی ظرفی و فراخ حوصلگی پیدا ہو جو بغیر اس قسم کے دار العلوم کے جس میں تمام باتیں نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوں حاصل نہیں ہو سکتی، علوم دینیہ خصوصاً علم کلام میں جس کی اس وقت نہایت ضرورت ہے نہایت اعلیٰ درجے کا کمال پیدا کیا جائے تاکہ الحاد و دہریت کا مقابلہ پورے زور و قوت سے ہو سکے۔"[1]

[1] سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۵۲-۱۴۹

مولانا کے ان خطوط سے جو انھوں نے نائب ناظم ندوۃ العلماء مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کو حجاز سے لکھے ہیں، ان کے بلند تخیل، وسیع ذہن اور جامع و زندہ نظام تعلیم کے نظریہ کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے، یہاں پر ان کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

"طلباء کی نگرانی اور تعلیم میں اول تو اس امر کا لحاظ رکھئے کہ انھیں ذوق علمی اور شوق پیدا ہو، صرف تنبیہ اور زجر پر ان کا پڑھنا اور یاد کرنا منحصر نہ رہے، اگر کوئی مستطیع طالب علم وغیر مستطیع آپ کے حکم میں تامل کرے یا عذر پیش کرے اس میں بہت غور کیجئے، اور خوشی سے ان کا عذر سنئے اور جہاں تک ممکن ہو اُسے مانئے یا اپنے حکم کو نرم کیجئے اور اگر مشورہ کے بعد بھی اُس حکم کی تنسیخ یا تغیر مناسب نہ ہو تو اس طالب علم کو اس خوبی سے سمجھایئے کہ وہ خوشی سے مان لے، آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ امر کس قدر ضروری ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مستطیع لوگ بھی عربی پڑھیں، مگر اس وقت میں کہ انگریزی کا دریا طغیانی پر ہے، لوگوں کی تمام امیدیں دنیاوی اسی سے وابستہ ہیں، عربی کو فقط بیکاری نہیں سمجھتے ہیں بلکہ دنیاوی ترقی کے لئے مضر جانتے ہیں، ایسی حالت میں جو لوگ عربی کی طرف توجہ کریں، وہ کس قدر قدر کے لائق اور دوچوٹی کے مستحق ہیں، غضب یہ ہے کہ غیر مستطیع شائق بھی ہوں ان کو بھی زائد سختی دل برداشتہ کر دے گی، اور چونکہ بہت مدارس عربی جاری ہیں اس لئے وہ ضرور چلے جانے پر آمادہ ہوں گے، یہاں کی عمدگی اور آرام کا خیال نہ کریں گے اس لئے بہت ضروری ہے کہ ان کے ساتھ رحیمانہ اور نہایت عاقلانہ طور سے برتاؤ رکھنا چاہئے اور پدر مہربان کی طرح ان پر شفقت رکھنا چاہئے، اس شفقت اور مہربانی میں اگرچہ سب برابر ہیں، مگر پھر بھی ان کی حیثیت کے مطابق ان سے برتاؤ کرنا چاہئے اور انزل الناس کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

(۵) اس کو آپ نے اس جلسہ میں بخوبی معلوم کیا ہوگا کہ ایسے امور کی تعلیم کی ضرورت بہت ہے جو اس وقت عوام کو پسند ہے اس کی نسبت میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں، طلبا کی تعلیم میں امور ذیل کا لحاظ ضرور رکھئے، اوّل خط ان کا صاف اور املا صحیح ہو، اس کے لئے خوشنویس پر تاکید کیجئے اور طلبا پر بھی، صحتِ املا کے طریقے انھیں بتایئے، کبھی کبھی طلبا سے دریافت کرتے رہئے کہ تم نے کیا لکھا، اس میں استاد شاگرد جس کی غفلت ہو اس پر تنبیہ کیجئے، خوشنویس سے یہ بھی کہئے کہ لڑکوں کو خط لکھنا بھی سکھائیں، اور وہ انشائیں جو اس وقت کے طرزِ تحریر کے موافق لکھی گئی ہیں انھیں دیکھنے کا حکم دیجئے۔

دوم اردو عبارت اور مضمون لکھنے کی مشق کرایئے، طلبا اخبارات دیکھیں، اخبارات میں مضمون لکھیں اگرچہ کوئی اصلاح نہ دے تو بھی طلبا لکھتے لکھتے خود ہی مشاق ہو جائیں گے، اور ممکن ہے کہ گاہ گاہ مولوی عبدالحی صاحب دیکھ لیا کریں، اس میں ایسا کیجئے کہ وہ اپنی انجمن کریں اور اپنے شوق سے یہ سب کریں، آپ اس کے موید و محرک رہیں کہ اُن کی انجمن ہمیشہ گرم رہے۔

سوم ہر ماہ میں کم سے کم دو مرتبہ ان سے بیان کرایئے، بیان میں آپ قلم دوات اور کاغذ لے کر بیٹھئے اور جس طالب علم سے جو غلطی لائق اظہار ہو اُسی وقت لکھ لیجئے اور وہ بیان کر چکے یا سب بیان کر چکیں اُسی وقت آپ کھڑے ہوں اور جس نے لائق تعریف بیان کیا ہے اُس کی تعریف اور جس نے جو غلطی کی ہے اُس غلطی کا اظہار کر دیجئے، بغیر اس کے اُن سے بیان کرانا کم نفع دے گا، اس کی بھی تاکید کیجئے کہ بآواز بلند بیان کریں، اس پر زور دیجئے کہ جو لکھ کر پڑھیں وہ ٹٹول ٹٹول کر نہ پڑھیں، اس طرح پڑھیں کہ گویا زبانی بیان کر پڑھتے ہیں، جو قرآن شریف پڑھتے ہیں ان سے وعظ کے طریقہ سے قرآن مجید ہی کا بیان کرایئے،

جو مضمون بیان کریں گے آپ ہدایت کریں ان میں آپ انھیں ۱۰۰ دیں یعنی بتا دیں کہ وہ فلاں فلاں رسالے یا کتاب میں اسے دیکھو، اس میں کبھی غفلت اور سستی نہ کیجئے گا۔

(۶) طلباء کو سیرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ضرور یاد ہو۔

(۷) سہ ماہی ششماہی امتحان میں ترغیباً کچھ انعام مقرر کر دیجئے، اس طالب علم کو جو سب سے اول نمبر ہو اور سالانہ میں ..... ہو بہت ضرور ہے، جب تک ..... انتظامیہ منظور نہ کرے با اختیار ناظم انھیں دیجئے، سہ ماہی امتحان میں جو سب سے اول نمبر ہو اُسے دو روپیہ سے چار تک دیئے جائیں اور ششماہی امتحان میں پانچ سے سات تک اور سالانہ میں دس سے سولہ تک دیا جائے، یہ بھی مناسب ہے کہ بعض ضروری علوم سے انعام کو خاص کیجئے مثلاً جو فقہ میں اول نمبر ہو اسے انعام دیا جائے گا، یا قرآن شریف کے بیان میں۔

(۸) قرأت کی طرف بھی خاص توجہ رکھئے، آپ کو خیال ہو یا نہ ہو کہ حافظ واجد کے پڑھنے کیسا عمدہ اثر ڈالا، اب اگر ہر سال یہی ایک حافظ کا سنوایئے تو برا اثر ہوگا، غرضکہ اور بھی ایسے پیدا ہوں۔

(۹) طلبا کے ورزش کا بھی بہت خیال رکھئے قوت اور صحت جسمانی اگر نہ ہوگی تو وہ کیا پڑھیں گے اور آپ ان سے محنت کیوں کر لے سکیں گے، اس میں آپ شرم نہ کریں، مشورہ کر کے کوئی ورزش کرائیں، اور ہر وقت ان پر ایسا دباؤ نہ رہے کہ ان کے دماغ کی شگفتگی جاتی رہے حاصل یہ ہے کہ نہ تو ایسے غیر مہذب ہو جائیں جیسے اسکول کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں کہ کسی بزرگ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں اور نہ ایسے خائف اور پژمردہ ہو جائیں کہ بشاشت اور طباعی جاتی رہے، بلکہ شرعی اور تہذیب کے ساتھ ہشاش بشاش رہیں، اب پٹنہ کے اطراف کے لڑکے آنے والے ہیں، اگر ان امور کا آپ لحاظ نہ رکھیں گے تو اس طرف جو

عمدہ اثر ڈالا گیا ہے، وہ برائی سے بدل جائے گا"

ہندوستان اور عالم اسلام کے نظام درس و طریقۂ تربیت کی ان خامیوں کی اصلاح کی کوشش ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلام میں ناپید تھی، ندوۃ العلماء نے روزِ اول ہی سے اپنے مقاصد میں نصاب تعلیم کی اصلاح شامل کرکے اس اہم خلاء کو پر کیا۔

رفع نزاع باہمی

فرد، ملک، سوسائٹی کا عمل، رجحان اور سرگرمیاں، نصاب تعلیم، نظام تربیت کسی قوم یا معاشرے کی روایات کی آئینہ دار ہوتی ہیں مسلسل پانچ صدی تک نصاب تعلیم اور نظام تربیت سے عالم اسلام اپنی نشوونما، ارتقاء اور ذہنی تعمیر کی صلاحیتیں کھو چکا تھا، یہ نصاب تعلیم فکر و عمل کے لئے کسی وسیع میدان کے فراہم کرنے سے قاصر تھا، نتیجہ یہ ہے کہ وہ صلاحیتیں جو زیادہ بہتر خدمت اور اعلیٰ قیادت کا مظاہرہ کرتیں، باہمی اختلافات، تکفیر و تفسیق، فروعی بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کی نذر ہونے لگیں، تحریک ندوۃ العلماء کے وجود میں آنے سے قبل ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورا عالم اسلام ایک دنگل کا روپ اختیار کر چکا تھا، اس دور کی چشم دید صورتِ حال ایک ایسے سیاح کی زبانی سنئے جو اپنے اس سیاحت کے بعد تحریک ندوۃ العلماء کی نظامت کے مقام پر فائز ہوا، مولانا حکیم عبدالحی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) نے آج سے ستر اسی سال قبل دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا اور اسی نام سے ان کا یہ سفرنامہ شائع ہوا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"آج صبح سے دوپہر تک قیام گاہ میں رہا، دوپہر کو کھانا کھا کر جامع مسجد نماز پڑھنے کے لئے گیا، نماز کے بعد چار جگہ وعظ ہونے لگا، منبر پر مولوی محمد اکبر وعظ کہتے ہیں، یہ بزرگ حنفیوں کا خوب خاکہ اڑاتے ہیں، دل کھول کر تبرا کرتے ہیں، اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ

ھدایہ پڑھانے سے توبہ کی ہے"۔

فرماتے تھے:۔

"آج کون ہے جس نے ہدایہ سے توبہ کر کے کلام مجید کی تعلیم شروع کی ہو، سب جہنم میں جائیں گے اور وعظ میں ہر ہر بات میں اپنی بڑائی بیان کرتے ہیں، ہر آیت کو اہلِ دہلی اور اپنے اوپر اتارتے ہیں، اہل دہلی کو ظالمین اور مشرکین سے ملاتے ہیں، اور اپنے آپ کو آنحضرتؐ سے (العیاذ باللہ) دوسرے صاحب بھی مُنذر نہ کے پاس اسی طور پر حنفیہ کا خاکہ اڑا رہے تھے تیسرے صاحب دوسری جانب محدثین و متبعین سب کی خبر لے رہے تھے، قیام تعظیمی کے منع کرنے پر سخت سست کہہ رہے تھے۔

چوتھے صاحب حوض پر کچھ مناجاتیں اور نعتیہ غزلیں کہہ رہے تھے، اور لوگوں کو اپنی طرف راغب کر رہے تھے، الغرض ایک ہڑبونگ تھا جس کو دیکھ کر نہایت افسوس ہوا، خدا کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں، جب سلطنت اسلام جاتی رہی تو جس کا جو جی چاہے کہے اور کرے[1]"۔

مسلمانوں کے مختلف طبقات کے درمیان باہمی جنگ و جدال اور اختلاف کی ہلکی سی یہ جھلک اپنے اندر اس دور کی بھرپور عکاسی رکھتی ہے، جماعتی عصبیت اور فروعی اختلافات کی کثرت نے جسم ملت کو داغ دار اور مسلمانوں کی تاریخ کو بدنما بنا دیا تھا، ہندوستان کے باوقار علماء اور نامور شخصیتوں پر کفر کے فتوے لگانے کا عام رواج تھا، پوری امت مقلدین اور غیر مقلدین، اہل حدیث اور اہل فقہ میں تقسیم ہو گئی تھی، اور یہ تمام گروہ باہم اس طرح برسرپیکار تھے کہ گویا وہ مختلف مذاہب کے پیرو ہوں، ملت کی ساری قوت آمین بالجہر، رفع یدین اور قرأت خلف الامام کے اثبات یا تردید میں صرف ہو رہی تھی، فقہ کی

---

[1] دہلی اور اس کے اطراف

جزئیات اور اختلافی مسائل میں ضخیم ضخیم مناظرانہ کتابیں لکھی جاتی تھیں، مناظرہ، طنز و تعریض سب و شتم اور اس سے بڑھ کر جبر و تشدد ہر جگہ عام تھا، اس عہد میں جس قسم کی کتابیں شائع ہو رہی تھیں، ان میں باہمی منافرت کی روح پوری طرح کارفرما تھی، بانیٔ ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے سیرت نگار لکھتے ہیں:۔

"لوگوں نے ان فقہی مسائل کو جو ہمیشہ رہیں گے، کفر و اسلام کا معرکہ بنا دیا تھا، اور اس میں وہ شدت اختیار کر لی تھی جو ایک مسلمان کو کسی کافر یا مرتد کے مقابلہ میں ہونی چاہیئے اس صورتِ حال کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ قیمتی دستاویز وہ خط ہے جو مولانا ابوالقاسم سنبھلی نے اس طوفانی مخالفت سے متاثر ہو کر مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ کو لکھا تھا، وہ بڑی دلسوزی اور قلق کے ساتھ خط میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"مسائل فروعی میں اس قدر لاد نعم، ردّ و کد، اور سب و شتم نے زور پکڑا ہے کہ جس کا پایاں نہیں، جنگ و جدل فیما بین شعار اسلام ہو گیا ہے، مسائل اصولِ ایمانی کہ جس پر بنائے ایمان و اسلام ہے مفقود، ایک زمانہ تھا کہ اہل اسلام کفار و اشرار سے مجادلہ و مقاتلہ کرتے تھے، اور آمادۂ ہدم بنائے کفار و مشرکین رہتے تھے، اب یہ زمانہ ہے کہ باہم مسلمانوں میں خانہ جنگی ہے، مسلمان اپنی ملت و مذہب اور بنائے اسلام کو گرا رہے ہیں اور باہم ایک دوسرے کو سب و شتم کرتے ہیں کہ جو کچھ روشنی اس کی ہو مبدّل بہ تاریکی ہو جائے، اندھیرے میں اندھیرا ہو، لوگ بزرگوں کو بدنام کرتے ہیں، جو کوئی کلمۂ حق کہتا ہے پکڑا جاتا ہے"[1]

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں کم و بیش یہی صورتِ حال پورے عالم اسلام میں تھی، سلطنت عباسیہ کے زوال میں صرف تاتاریوں کی یلغار ہی نہیں، شیعہ و سنی اختلافات کے ساتھ

---

[1] تذکرہ مولانا محمد علی مونگیری از مولانا سید محمد الحسنیؒ

حنبلی اور شافعی مسلک کے پیروؤں کی خانہ جنگی بھی اس زوال کا اہم سبب ہے۔

لوگوں نے خدا کے گھروں کو بھی اکھاڑا بنا دیا تھا، مسجدوں پر یہ لکھا جانے لگا تھا کہ یہ حنفیوں کی مسجد ہے، یہ شافعیوں کی، یہ حنبلیوں کی، ایک دوسرے کی مسجدوں میں غلاظت پھینکنے کی وارداتیں بکثرت ہونے لگی تھیں، اور ایک انگریز مفکر کے اس قول کا پورا عالم اسلام میں مشاہدہ ہو رہا تھا، جو اس نے کہا تھا:۔

"اسلام کی بڑھتی ہوئی فتوحات کو کسی نے نہیں روکا، بلکہ ان کے اندرونی اختلافات سے یورپ کو نجات ملی، ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کو منتشر کرنے اس کی قوت کو کمزور کرنے کا جتنا موقع باہمی اختلافات نے دیا اتنا بیرونی حملوں نے نہیں"۔

مناظروں، دشنام طرازی سے آگے بڑھ کر بات، مقدمہ بازی اور فوج داری تک جا پہونچی تھی اور مسلمانوں کے مقدمات غیر مسلموں کی عدالتوں میں پیش ہونے لگے تھے جس پر غیر مسلموں کو ہنسنے کا موقع ملتا تھا، دہلی میں کوٹلا والی مسجد میں صرف آمین بالجہر پر جھگڑا اتنا بڑھا کہ دو الگ الگ پارٹیاں بن گئیں، ایک پارٹی چاہتی تھی کہ آمین زور سے کہا جائے اور دوسری چاہتی تھی کہ چپکے سے، اس پر سخت لڑائی ہوئی، متعدد آدمی زخمی ہوئے، پھر مقدمہ چلا اور اس پر ہزاروں روپیہ برباد ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں پارٹیوں میں ہمیشہ نفرت و عداوت پیدا ہو گئی اور پھر آج تک ختم نہ ہوئی اسی طرح میرٹھ میں مقلدین اور غیر مقلدین کی کشمکش اتنی بڑھ گئی کہ ہائی کورٹ تک مقدمہ پہنچا۔

اس کے علاوہ علی گڑھ کا مشہور مقدمۂ زہر خورانی افسوسناک صورتِ حال کی ایک اور مثال ہے، مولانا لطف اللہ صاحبؒ کو زہر دیا گیا، مگر وہ تکلیفیں اٹھا کر بچ گئے، لاٹھیاں چلیں، مقدمہ بازی ہوئی، وہ سب کچھ ہوا جو مسلمانوں کا سر شرم سے جھکا دینے کے لئے کافی ہے، اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک بدنما داغ ہے بقول مرزا حیرت دہلوی:۔

"اگر یہ تمام کیفیت مفصل طور پر لکھی جائے اور مستقل کتابی صورت میں اس ماتمی حالت کو لایا جائے تو یہ وہ تاریخ ہوگی جو صدہا برس تک ہماری آئندہ مہذب نسلوں کو خصوصاً اور غیر قوموں کو عموماً ہم پر اور موجودہ اسلام پر خندہ زنی کا موقع دے گی"[1]

ندوۃ العلماء کے قیام کا مقصد جہاں اصلاح نصاب اور رفع نزاع باہمی تھا، وہاں اس نے اپنے اہم مقاصد میں ایسے علماء کی تیاری شامل کی تھی، جو روشن خیال ہوں، زمانہ کی نبض پر جن کا ہاتھ ہو، جن کی نگاہ قدیم و جدید کی مصنوعی اور سطحی تقسیم سے بالاتر ہو، یہ وہ ضرورت تھی کہ جس کی کمی ہر دور میں حساس لوگوں کو محسوس ہوتی رہی ہے، جن علماء کی تیاری کا اعلان و ارادہ ندوہ نے کیا تھا، انہیں مولانا شبلی نعمانیؒ نے ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

"(۱) علماء میں ایثار نفس پیدا کرنا (۲) انگریزی داں علماء پیدا کرنا (۳) مذاقِ حال کے موافق علماء کے گروہ میں مقررین اور ارباب قلم کا پیدا کرنا (۴) ایسے علماء پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کر سکیں"

اسی عزم و ارادہ کا اعلان اس دور میں ہوا جب ہندوستان اور عالم اسلام کی تمام درسگاہوں میں تربیت کا جو طریقہ تھا، اس کا نقشہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے، دینی مدارس کے طلبہ کی اس معاشرت سے کسی قسم کی حمیت و غیریت یا ایثار نفس کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس طبقہ سے کسی قسم کی بلند خیالی کی توقع کیونکر ہو سکتی ہے۔

تربیت سے قطع نظر کر کے تعلیم کے مسئلہ کو لیجئے تو اس میں بھی یورپ کی کسی زبان کی تعلیم لازمی قرار نہ دی جائے اور موجودہ زمانہ کے علوم و فنون نہ پڑھائے جائیں تو مذاق حال کے موافق اہل قلم کیسے پیدا ہو سکتے ہیں، غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کا کام جس صلاحیت کے علماء کو چاہتا ہے ان کا

---

[1] مقاصد ندوۃ العلماء۔

وجود نہیں، مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنے مضمون "ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے" میں اخبار "حبل المتین" مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس میں تحریر ہے :-

"جس زمانے میں روسی قوم بت پرست تھی، شہنشاہِ روس ولاڈیمر نے اسی طرح ایک جلسہ منعقد کیا تھا، اور علماء اسلام کو بھی بلایا تھا، جو صاف اس غرض کے لئے قازان سے تشریف لائے انھوں نے اسلام کے تمام عقائد اور فلسفہ میں سے صرف یہ مسئلہ منتخب کر کے پیش کیا کہ سور کا گوشت کھانا حرام ہے"

مؤرخین روس لکھتے ہیں :-

"شہنشاہ روس اسلام کی طرف مائل تھا، اور چاہتا تھا کہ تمام قوم روس کے لئے مذہب اسلام کا انتخاب کرے لیکن قازانی عالم نے شریعت اسلام کی تمام احکام میں سے صرف اس مسئلہ کو پیش کر کے اس پر اس قدر زور دیا کہ شہنشاہ نے غصہ میں آکر ان کو نکلوا دیا اور عیسائی مذہب قبول کر لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹ کروڑ آدمی دفعتہً عیسائی ہو گئے"

روشن خیال زمانہ سے باخبر اور وسیع النظر علماء کی تیاری جس قدر اہمیت رکھتی تھی، اس کے صحیح احساس بانیانِ ندوۃ العلماء کے وجود میں آنے سے پہلے اس کے مؤسسین میں سے ایک اہم شخصیت مولانا شبلی نعمانیؒ نے ۱۸۹۲ء میں اپنے سفر روم، مصر و شام میں یہ آواز اٹھائی تھی، ہندوستان کے ساتھ قسطنطنیہ، مصر کے مذہبی اداروں، خاص طور سے جامع ازہر کے نصاب تعلیم اور طریقۂ تربیت پر مولانا نے حسرت و افسوس کے آنسو گرائے تھے، اور اس بات کا اظہار کیا تھا کہ یہ نظام تعلیم ایسے علماء نہیں پیدا کر سکتا جو عصر جدید کے چیلنج کا مقابلہ کر سکیں اور اسلام کے ابدی پیام اور فطری دعوت کو عام کر سکیں، مولانا شبلیؒ کے اس سفر کے چند سال بعد یعنی ۱۸۹۹ء میں جامع ازہر کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی اس کے متعلق علامہ سید رشید رضا ایڈیٹر المنار مصر نے مسلسل مضامین

لکھے، ۳۰ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ کے المنار میں اپنی اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے جن تین نامور علماء کے نام سند لائے تھے ان میں ایک مولانا شبلی نعمانی بھی تھے، بانیان ندوۃ العلماء کو ان حضرات کا بخوبی اندازہ تھا جو تعلیم جدید نے پیدا کر دیئے تھے، ان کو خوب معلوم تھا کہ سیلاب کا یہ بہاؤ کس رخ پر ہے اور اس سیلاب میں ہمارے مذہبی علوم و فنون کا کیا حال ہوگا اور جو شکوک و شبہات نئی تعلیم کے بدولت پیدا ہو رہے ہیں، ان کا جواب دینے کے لئے کس استعداد کے علماء کی ضرورت ہے۔

بانیانِ ندوۃ العلماء میں سے اکثر بزرگ عالم اسلام کی سیاحت بھی کر چکے تھے جس کی وجہ سے علماء کے جدید فرائض کی ضرورتیں ان پر منکشف ہو گئیں تھیں، اس ضرورت کے شدت احساس کا نتیجہ ندوۃ العلماء کے بنیادی اغراض و مقاصد کا ایک مقصد ایسے وسیع الخیال علماء کی تیاری تھا، جو دینی علوم میں گہری بصیرت کے ساتھ علوم جدیدہ اور زمانہ کے حالات پر اچھی نظر رکھتے ہوں، اسلام ایک دعوتی اور تبلیغی مذہب ہے، چھٹی صدی مسیحی میں حضور اکرم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اس کی برق رفتار ترقی میں اس جذبۂ تبلیغ کا بڑا دخل ہے، جسے حضور اکرم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ میں پیدا کر دیا تھا، وہ توحید کی دعوت لے کر اطراف عالم میں پہونچے، اقبال کی شاعرانہ زبان میں۔ ع

مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے

یہ امت "امتِ دعوت" اور اسلام تبلیغی مذہب نہ ہوتا تو مذاہب عالم میں سب سے کم عمری کے باوجود دنیا کے پانچوں بڑا عظموں میں نہ پھیلتا، اسلام ایک روایتی دین بھی نہیں بلکہ وہ زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی مکمل دین اور مستقل تہذیب اور ایک ایسا دستور العمل ہے جس میں انسانی فطرت اور مادہ و روح کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اسلام کے سادہ لیکن پرکشش پیغام، اس کے

اخلاقی اصول، مساوات کے درس، خدا پرستی کی دعوت نے چھٹی صدی مسیحی کی دنیا کو متاثر کیا، جن انسانوں تک یہ دعوت پہونچی انھوں نے اس کا ایک نجات دہندہ کی حیثیت سے استقبال کیا، اسے دل سے قبول کیا، اس کے اولین داعیوں اور مبلغوں کی زبان، معاشرت، تہذیب و ثقافت بھی اسلام کے طفیل میں محبوب اور قابل تقلید بن گئی۔

بعد کی صدیوں میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کی وہ سرگرمیاں باقی نہ رہیں جو عصر رسول اور دورِ خلفائے راشدین میں تھیں، مسلمان اس اہم ذمہ داری سے گریز کرنے اور غفلت برتنے لگے، اسلام کے علم برداروں کی اس غفلت کی وجہ سے وہ دین جو لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کی غرض سے آیا تھا، سکڑا اور سمٹ کر رہ گیا، ہندوستان میں اسلام صحابہ کرام اور ان کی تربیت یافتہ جماعت کے ذریعہ نہیں آیا بلکہ ہم پسند بادشاہ اپنے ساتھ اس مذہب کو لے کر آئے، یہ کشور کشا خیر امت کے منصب و مقام اور تبلیغ و دعوت کے اس جذبہ سے عاری تھے، جسے اسلام اپنے پیروؤں میں دیکھنا چاہتا ہے، طبقاتی کشمکش، اونچ نیچ اور عدم مساوات کا شکار یہ ملک اپنے ہی جیسے انسانوں کے ظلم و ستم اور استحصال کا شکار، یہاں کے عوام اسلام جیسے دینِ مساوات کی دعوت کے روئے زمین پر سب سے زیادہ محتاج تھے، وہ اس دین کے ذریعہ زندگی کی حقیقی لذت سے آشنا اور عزتِ نفس، انصاف و مساوات، احترام آدمیت اور ضمیر کی آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوں، درخیبر کی راہ سے اس ملک میں داخل ہونے والے مسلمان اس مشن اور خدمت کے جذبہ کو اولین مقام دیتے کہ وہ یہاں خدا کے بندوں کو خدا کا بندہ بنانے اور اخلاق و محبت اور خدا پرستی کا پیغام دیتے آئے ہیں، وہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مبارک الفاظ میں یہاں کے باشندوں سے یوں مخاطب ہوتے کہ "ہم یہاں اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں، دنیا کی تنگی سے نجات دے کر وسعت و کشائش کی راہ دکھائیں، ظلم و جور سے بچا کر عدل و انصاف کی

فضا میں لائیں، بنی آدم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ان کے درمیان برادرانہ محبت قائم ہونی چاہئے، ہماری نظر میں انسانوں کے درمیان شریف و کمین کی تقسیم صحیح نہیں ہے، ہم انسانوں کی خود ساختہ اونچ نیچ کے قائل نہیں ہیں، ہم تمام آدمیوں کو ایک ہی اصل کی شاخیں سمجھتے ہیں اور ہم سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں، ملک گیری اور کشور کشائی ہمارا مقصد نہیں ہے، ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانے آئے ہیں" تو آج برصغیر کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ کچھ اور ہوتا، اس ملک پر آٹھ سو سالہ حکمرانی کے بعد بھی امت مسلمہ یہاں اقلیت میں رہی، اس پر بھی غیر مسلموں کی جبراً تبدیلی مذہب کے الزام اور پروپیگنڈا سے ملت اسلامیہ ہند سے بچ نہ سکی:۔

"انگریزوں کے دور حکومت میں ایک طرف عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں جاری تھیں تو دوسری طرف شدھی سنگٹھن کے نام سے وہ ہندو تحریکیں سرگرم عمل تھیں، جو غیر تربیت یافتہ بھولے جاہل مسلمانوں کو یہ جھانسہ دے کر کہ تم اصلاً ہندو ہو مسلمانوں کو پھر ہندو مذہب میں داخل کرنے کے لئے زور و شور سے جدوجہد کر رہی تھی۔

شدھی تحریک کا مثبت و مناسب جواب یہی تھا کہ مسلمانوں کو دین سے آشنا کرایا جائے اور برادرانِ وطن تک اسلام کا حقیقی پیغام پہونچایا جائے۔

(۱) ندوۃ العلماء نے ابتدا ہی سے اشاعت اسلام کو اپنے مقاصد میں داخل کیا تھا، اور یہ طے کیا تھا کہ ایسے علماء اور مبلغین پیدا کئے جائیں جن میں سادگی جفاکشی اور جاں نثاری کے اوصاف ہوں۔

(۲) اشاعت اسلام کا مستقل شعبہ قائم کیا جائے، تمام اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کی جائیں مستقل واعظ مقرر کئے جائیں، جو دیہات میں جاکر ایک ایک دو دو مہینہ رہ کر اسلامی احکام اور عقائد کی تعلیم دیں۔

(۳) عربی خوانوں کو سنسکرت اور انگریزی کی اعلیٰ درجہ تک تعلیم دی جائے۔

مدرسہ فیض عام کی چٹائی پر

ان مقاصد کے پیش نظر تحریک ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی، قیام کا پس منظر ندوہ کے گل سرسید مولانا سید سلیمان ندوی کے گہربار قلم سے پڑھئے:۔

"انقلاب و حوادث کے جو طوفان ملک میں اٹھ رہے تھے، ان سے حساس مسلمانوں کے دل مضطرب تھے، مدارس اور مکاتب کا پرانا سلسلہ ٹوٹ رہا تھا، انگریزی اسکول اور کالج میں مسلمان لڑکے کھنچ رہے تھے، سلطنت کے اثر سے عیسائیت کا چرچا تھا، مشنریوں کے جال ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، ان کے یتیم خانے ہر جگہ قائم تھے، مسلمانوں اور عیسائیوں میں مناظروں کی گرم بازاری تھی، دونوں طرف سے رسائل لکھے جا رہے تھے، یورپ کے نئے خیالات سیلاب کی طرح امڈے چلے آ رہے تھے، عام علماء زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف، کچھ معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھے تھے، اور خواص تقلید اور عدم تقلید، قرأت فاتحہ، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلوں میں ایسے گھستے تھے کہ مناظرہ مجادلہ، اور مجادلہ مقاتلہ بن گیا تھا، خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، ایک دوسرے کی تفسیق اور تکفیر پر بڑی مہریں ہو رہی تھیں، مدرسوں میں پرانا فرسودہ طریقۂ درس جاری تھا، جو زمانہ کے انقلاب سے بے کار اور نئے زمانے کے لئے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر ہو رہا تھا۔"

یہ صورت حال تھی کہ حسن اتفاق سے اس خوش قسمت مدرسہ فیض عام کانپور کی چٹائی پر (جسے مفتی عنایت احمد صاحب استاذ حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی نے ۱۲۷۷ھ میں

قائم کیا تھا) مدرسہ مذکور کے چند فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کے موقع پر چند نفوس قدسیہ اس صورتِ حال پر غور فرما رہے تھے، یہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء تھا۔ اس مجمع میں جو باکمال نفوس جلوہ افروز تھے، ان کے متبرک ناموں پر ایک نگاہ آج بھی بتا سکتی ہے کہ وہ کس پایہ کے تھے، حالانکہ ان میں سے بعض کا اس وقت عنفوان شباب تھا۔

۱۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب علی گڑھی۔

۲۔ مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی۔

۳۔ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی۔

۴۔ مولانا محمد خلیل احمد صاحب مدرس دوم دار العلوم دیوبند۔

۵۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری۔

۶۔ مولانا نور محمد صاحب پنجابی (صدر مدرس مدرسۂ اسلامیہ فتح پور)

۷۔ مولانا احمد حسن کانپوری۔

۸۔ مولانا سید محمد علی مونگیری۔

۹۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب (مدرس اول دار العلوم دیوبند)

۱۰۔ مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی۔

۱۱۔ مولانا حکیم سید ظہور الاسلام فتحپوری۔

۱۲۔ مولانا عبد الغنی خاں مئوری شیلا آبادی۔

۱۳۔ مولانا حکیم فخر الحسن گنگوہی۔

۱۴۔ مولانا سید شاہ تجمل حسین دلیسنوی۔

یہ اسلامی ہندوستان کے گذشتہ دور کے وہ نام ہیں، جن پر اس دور کو پورا فخر و ناز ہے،

اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے، اور آئندہ سال مدرسۂ فیض عام کے سالانہ جلسے کے موقع پر تمام ہندوستان کے علما کو اس کے لئے عام دعوت دی جائے، اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء قرار پایا، اور اشتہارات واخبارات کے ذریعے سے آئندہ جلسہ کا اعلان کیا گیا۔

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ جو مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے شاگرد رشید اور حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ کے مرید وخلیفہ، ردِّ نصاریٰ میں متعدد کتابوں کے مصنف تھے اس نئی مجلس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔[1]

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی وناظم اول ندوۃ العلماء

قبل اس کے کہ مجلس ندوۃ العلماء کی ابتدائی سرگرمیوں اور اس قافلۂ حق کی جادہ پیمائی کی داستان سنائی جائے، یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس کی ابتدائی دعوت دینے والا کون تھا، اس کی شخصیت وفکر کی تشکیل میں کن اہم عناصر وواقعات نے حصہ لیا، اس کار عظیم کے لئے اس کے انتخاب میں کیا حکمت تھی؟ اس موقعہ پر مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے اس مقدمہ کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جو موصوف نے سیرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے لئے لکھا تھا، مولانا فرماتے ہیں:-

"اس دور کی یگانہ شخصیتوں میں ایک مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی ذات بھی ہے، جو جامعیت وتوازن کا ایک ایسا مرقع ہے، جس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی، الٰہیت وربانیت، عشق وخدا مستی، کمال اتباع سنت وفنائیت فی الرسول، اسلام

---

[1] حیات شبلی ص ۳۰۲-۳۰۳

کے لئے دل سوزی اور امت کی فکر، علو ہمت و بلند نظری، تازگی فکر و جرأت اندیشہ، نور بصیرت و فراست ایمانی، حقیقت پسندی و عملیت، زمانہ کی نبض شناسی اور آنے والے خطرات سے آگاہی، وسعت قلب و نظر، اجتماعی کام کی صلاحیت، مختلف الذوق رفقاء کے ساتھ اشتراک عمل و تعاون کے لئے ہمہ وقت آمادگی، یہ مختلف اور بظاہر متضاد صفات و کمالات ان کی ذات میں اس طرح جمع اور پہلو بہ پہلو ضو فگن ہیں کہ دیکھنے والے کے لئے اور ان کی سوانح کا مطالعہ کرنے والے کی نگاہ کی ہمہ گیری کے لئے یہ ایک مستقل امتحان بن جاتا ہے، اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ۔ ع

گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد!

انھوں نے جس طرح "جام و سنداں" اور "شیشہ و آہن" کو جمع کیا، انھوں نے جس طرح محدود ماحول میں رہ کر باہر کی وسیع دنیا دیکھی، جن مہیم اور ناتمام اشاروں پر مستقبل کے خطرات کی واضح نشاندہی کی اور بلیغ پیشگوئی کی، جس قانع و زاہد ماحول میں رہ کر جس کے در و دیوار سے۔ ع

گوش بند و چشم بند و لب بہ بند!

کی صدا آرہی تھی، زمانہ کے جدید تقاضوں کو محسوس کیا اور ان کے لئے بے چین ہوئے، جس قلیل اثاثہ پر ایک ایسی عالمگیر اور انقلاب انگیز دینی تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی جس کے آگے مصر و ترکی کے مصلحین بھی اس دور میں نہ جا سکے، وہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اور وہ قرآن کی فطرت کی ارجمندی اور ان کے جوہر کی تابانی کی دلیل ہے، اور اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا نمیر و خمیر تنہا اس ماحول اور تربیت کا نتیجہ نہیں جو انھوں نے پائی تھی، بلکہ اس نسبت گرامی کا نتیجہ ہے جو ان کو نسبی و روحانی طریقے پر حاصل تھی۔ ع

تری آگ اس خاکداں سے نہیں

انیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے ندوۃ العلماء کا جو وسیع و دقیع تخیل پیش کیا، جس طرح مقاصد و وسائل کی تنقیح کی جس طرح قدیم نصابِ علوم آلیہ[1] کے غلبہ اور کتب معقولات کی بے جا کثرت پر جرأت مندانہ تنقید کی، جس طرح عربیت میں کمال اور علوم اسلامیہ میں مہارت خصوصی پر زور دیا، جس طرح فقہ کی تدوین جدید اور جدید مسائل و ضروریات پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت بیان کی جس طرح فتنۂ تکفیر اور نزاع باہمی کے اس پرآشوب دور میں اتحاد اور مناظرہ و مجادلہ، انتہا پسندی کے اس پرجوش ماحول میں مسلک اعتدال کی دعوت دی، جس طرح انھوں نے مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے فلسفۂ جدید کے مطالعہ اور علوم جدیدہ کی تحصیل پر زور دیا، جس طرح انھوں نے ایک ایسے ماحول میں جس میں ہر جدید چیز بے دینی اور "نیچریت" کا نشان سمجھی جاتی تھی، مفید علوم اور انگریزی زبان اور تحریر و تقریر کی مشق کی برملا ترغیب دی جس طرح انھوں نے بیگانگی و بدگمانی کے اس دور میں مدارس دینیہ کے وفاق کی دعوت دی جس طرح انھوں نے مدارس اور انجمنوں کے سالانہ جلسوں میں ملتِ اسلامیہ کی فکرمندی کے لئے جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو دعوت دی اور ان کو علماء و مشائخ کے پہلو میں بٹھایا اور ان کی طرف تعاون و اعتماد کا ہاتھ بڑھایا، جس طرح انھوں نے حریف و رقیب علماء اور جماعتوں کے "باہم دگر دست و گریباں" پیشواؤں کو ایک دوسرے سے ملایا اور گلے لگایا، جس طرح انھوں نے علماء و فضلاء مدارس کو حالاتِ زمانہ سے باخبری اور عملی زندگی میں شرکت اور خیر القرون کی طرح مسلمانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری

---

[1] صرف و نحو و منطق وغیرہ۔

سنبھالنے کی دعوت دی جس طرح انھوں نے تمدن و معیشت اور دین کی خدمت کے لئے اسلام کی عطا کی ہوئی آزادی اور رفقہ کی دی ہوئی گنجائش سے فائدہ اٹھانے کو جائز قرار دیا، اور باوجود اپنے ذاتی و علمی اعلیٰ معیار ورع و تقویٰ کے اجتماعی کاموں میں اس کو نہ صرف گوارا بلکہ ضروری قرار دیا۔

یہ اور بہت سے "اوّلیات" و امتیازات ہیں، جن میں اگرچہ آج کوئی ندرت و جدّت نظر نہ آتی ہو، مگر ان میں بہت سی چیزیں اپنے زمانہ سے آگے کی تھیں، اور ان کی جرأت وہی کر سکتا تھا جس کا اخلاص، جس کا فہم دین اور جس کا ورع و تقویٰ ہر شبہ سے بالاتر ہو، اور جس کو خود رسوخ فی العلم کی دولت اور اپنے فہم و بصیرت پر اعتماد کی قوت حاصل ہو اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے بہت سی چیزیں جو آج مانوس و بدیہی نظر آرہی ہیں، اور ان کو عام طور پر قبول کر لیا گیا ہے، اس میں بھی ان کے خلوص، سوز و دردمندی اور مسلسل جد و جہد کو دخل ہے[1]۔

ندوۃ العلماء کا پہلا وفد

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے نظامت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد محسوس کیا کہ ندوہ کے تعارف کے لئے وسیع جد و جہد کی ضرورت ہے، انھوں نے مولانا مشتاق علی صاحب کو (جو اس وقت مدرسۂ اسلامیہ فیض آباد میں مدرس تھے، اور ندوہ کے بنیادی جلسہ میں بھی شریک تھے) اس پر مامور کیا کہ وہ اس مقصد سے ہندوستان کے کچھ اہم علاقوں کا دورہ کریں، یہ ندوہ کا گویا پہلا وفد تھا، جس نے اس سلسلہ کا آغاز کیا۔

---

[1] سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ از مولانا محمد اسحٰق مرحوم صفحات ۱۹-۲۲ (مقدمہ)

مولانا مشتاق علی صاحب نے بڑی خوبی اور دلچسپی کے ساتھ یہ اہم کام انجام دیا، انھوں نے جن علاقوں کا دورہ کیا ان میں دیوبند، رامپور، پٹنہ، نگینہ، نجیب آباد، اٹاوہ، علی گڑھ، جھانسی بھوپال، ملکہ پور اور بمبئی شامل ہیں، بمبئی سے وہ کامران ہوتے ہوئے جدہ گئے اور مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے، ان کے ساتھ ارکان کی طرف سے مولانا محمد علی مونگیریؒ کی لکھی ہوئی ایک تحریر تھی جس میں ندوۃ العلماء کے مقاصد کی وضاحت کی گئی تھی، شاید یہ پہلا رسمی بیان تھا، جو اس بنیادی جلسے کے بعد جاری کیا گیا، اس تحریر میں ندوۃ العلماء کے قیام کے حسب ذیل دو اغراض بیان کئے گئے تھے۔

۱۔ چونکہ اس زمانے میں دیکھا جاتا ہے کہ جو طلبہ علوم عربیہ سے فارغ ہوتے ہیں، وہ امور انتظامی دنیا اور معیشت سے محض ناواقف رہتے ہیں، اور بوجہ زیادہ عمر ہو جانے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتے، اس لئے وہ بے موقع طور سے اہل دنیا کے محتاج ہوتے اور عوام کی نظروں میں بے وقعت و بیکار ٹھہرتے ہیں، اور علوم دینیہ سے بھی جیسی کہ واقفیت ہونی چاہیئے نہیں رکھتے، جو علوم دینی اس وقت کے مناسب اور دین کے معین میں ان سے بھی ناواقف رہتے ہیں، یہ انجمن ان سب باتوں پر غور کر کے اولاً سلسلۂ تعلیم کو درست کرنے اور بالاتفاق تمام مدارس اسلامیہ میں جاری ہو جانے کی کوشش کرے اور بجا امور ان طلبہ کی تہذیب و اخلاق اور ترقی علم میں مفید سمجھے حتی الوسع ان کے اجراء کی سعی کرے۔

۲۔ اس وقت ہمارے علماء کی باہمی نزاعیں سخت نقصان پہونچا رہی ہیں، اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں میں بڑا بڑا فساد برپا ہوتا ہے جس سے علماء اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کی مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے، یہ انجمن کوشش کرے گی کہ یہ باہمی نزاع ہونے نہ پائے، اور جب کوئی اختلاف کسی گروہ میں واقع ہوا کرے تو اس انجمن کے

ذریعے طے ہو جایا کرے۔[1]

اس تحریک کا علماء میں عام طور پر گرمجوشی سے استقبال ہوا، بھوپال کے تقریباً تمام اہم علماء نے اس سے اتفاق کیا، اور تائید میں دستخط کئے، جھانسی کے علماء نے بھی دستخط کئے، رنجیب آباد میں سب حضرات نے اس سے اتفاق کیا، بمبئی میں مدارس کے ذمہ داروں سے گفتگو ہوئی اور ان سب نے ندوۃ العلماء کی ضرورت کو تسلیم کیا اور دستخط کئے، علی گڑھ میں مولانا مشتاق علی نے علامہ شبلی نعمانیؒ سے (جو اس وقت مدرسۃ العلوم میں استاد تھے) ملاقات کی اور ندوۃ العلماء کے تخیل و نصب العین، اصلاح نصاب، اور رفع نزاع باہمی پر ان سے گفتگو کی، مولانا شبلی نعمانیؒ نے ہندوستان کے علاوہ روم و مصر و شام کے مدرسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کے دل میں رہ رہ کر ان مدرسوں کی زبوں حالی، ابتری اور علماء کی ضروریات زمانہ سے بے خبری کا درد تھا، اور وہ برابر اپنے مضامین اور تقریروں میں اس احساس کو ہر دفعہ نئے رنگ میں پیش کرتے تھے، انھیں ندوۃ العلماء کے مقاصد میں اپنے خواب کی تعبیر اور اپنے زخموں کا مرہم دکھائی دیا، مولانا شبلیؒ نے ندوہ کے اغراض و مقاصد سے کلی اتفاق ظاہر کیا، اور تادم آخر اس تحریک سے وابستہ رہے۔

مولانا مشتاق علی نگینوی کے ذریعے حجاز میں ندوۃ العلماء کا پہلا تعارف ہوا، انھوں نے مدینہ منورہ کے علماء کے سامنے ندوہ کا تخیل اور اغراض و مقاصد پیش کئے، حجاز کے علماء نے اس کی ضرورت و اہمیت تسلیم کی، مکہ معظمہ میں انھوں نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے خاص طور پر ملاقات کی اور سب حالات اور کارروائی لکھی ہوئی ان کے سامنے پیش کی، مولانا اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کاغذ کو اپنے دستخط سے مزین فرمایا۔[2]

---

[1] روداد ندوۃ العلماء سال اول ص۱۴۷ [2] ایضاً

پہلا اجلاس عام

ندوۃ العلماء کے تخیل اور اغراض و مقاصد سے تعارف کے لئے مولانا مشتاق علی نگینوی نے مختلف مقامات کا سفر کیا اور علماء اصحاب فکر اور بااثر لوگوں سے شخصی ملاقات و تبادلۂ خیال کر کے انھیں اس نئی اصلاحی تحریک کا ہم خیال و ہمنوا بنانے کی کامیاب کوشش کی، دوسری طرف ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس عام کے اعلان اور مقاصد ندوۃ العلماء کے تعین و تشہیر کے بعد ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲، ۲۳، ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء میں مدرسۂ فیض عام کانپور میں ہوا، پہلے دن ۱۵ شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۸۹۴ء کی صبح مدرسۂ فیض عام کے چودہ فارغ التحصیل طالب علموں کی دستار بندی کا جلسہ حضرت مولانا لطف اللہ صاحبؒ علی گڑھی کی صدارت میں ہوا، صدارت کی تحریک مولانا عبداللہ صاحب انصاری ناظم دینیات ایم اے او کالج علی گڑھ (داماد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند) نے پیش کی اور تائید مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ نے فرمائی، مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر "نجم الاخبار" اٹاوہ نے مدرسۂ فیض عام کی سالانہ کارروائی پڑھ کر سنائی، اس کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے سورۂ جمعہ کا وعظ اس خوبی سے کہا کہ حاضرین پر وجد طاری تھا۔

اجلاس ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کا اجلاس اسی دن تین بجے سہ پہر سے شروع ہوا، شمس العلماء مولانا شبلی نعمانیؒ نے مولانا لطف اللہ صاحبؒ کی صدارت کی تحریک کی اور مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ نے تائید کی، اس اجلاس کی روح پرور کیفیت کا بیان نواب صدر یار جنگ محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی زبان سے سنئے:۔

"شوال ۱۳۱۱ھ میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ہوا، یہ اجلاس اپنی شان اور اجتماع میں خود اپنی نظیر تھا، ایک شان یہ تھی کہ ہر فرقہ کے صنادید علماء شریک جلسہ تھے، علمائے حنفی کے علاوہ اہل حدیث میں سے مولانا ابراہیم آروی، مولانا محمد حسین بٹالوی، شیعہ مجتہدین میں مولوی غلام الحسنین کنتوری شریک جلسہ تھے، یہ مشاہدہ تھا کہ تمام علماء بلا تخصیص فرقہ صدر نشین کی تعظیم و تکریم میں یکساں سرگرم تھے، کرسیِ صدارت حضرت کے جمال و کمال دونوں پر نازاں تھی، اسی موقع پر جو رسالہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے پیش کیا تھا، اس میں مفتی عنایت احمد صاحب، مولانا لطف اللہ صاحب اور مولانا احمد حسن صاحب کی بڑی شاندار الفاظ میں مدح و ثنا کی تھی"۔

(استاذ العلماء ص ۴۳،۴۲)

اس کے بعد مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ نے ندوۃ العلماء کے اغراض اور عربی تعلیم کے موجودہ نقائص پر ایک بسیط اور مدلل تقریر فرمائی، بعد میں مولانا شبلی نعمانیؒ نے ندوۃ العلماء کا دستور پیش کیا، مولانا محمد حسین صاحب بٹالویؒ کی تحریک سے یہ دستور العمل علماء کی ایک مجلس کے سپرد ہوا، عصر کے بعد مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواریؒ نے دینی و دنیوی ترقی اور مذہبی تعلیم پر وعظ فرمایا۔

دوسرے دن ۱۶ شوال کی صبح کو مولانا شبلیؒ کی تحریک اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی کی تائید سے مولانا سید محمد شاہ محدث رامپوری صدر جلسہ ہوئے سب سے پہلے مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک پُرزور تقریر کی، پھر مولانا محمد ابراہیم آروی نے دلپذیر وعظ فرمایا۔

۱۷ شوال کی رات کو مغرب بعد جید علماء کی موجودگی میں دستور العمل منظور ہوا تیسری نشست ۱۷ شوال مطابق ۲۴ اپریل کی صبح کو ہوئی، مولانا لطف اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر تھے اس جلسے میں چار تجویزیں پاس ہوئیں:۔

تجویز ۱ موجودہ طریقۂ تعلیم قابلِ اصلاح ہے۔

تجویز ۲ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شریک ہوا کریں۔

تجویز ۳ مدارس اسلامیہ جو کثرت سے جا بجا قائم ہیں ان کا وفاق بنایا جائے ہندوستان کے دو تین بڑے مدارس کو مرکز بنا کر چھوٹے مدرسوں کو ان کی شاخیں قرار دیا جائے۔

تجویز ۴ مدرسۂ فیض عام کی ترقی اور مالی تعاون کے متعلق تھی، یہ وہ تجویزیں ہیں جو عربی تعلیم کی اصلاح اور دینی مدارس کی تنظیم کے لئے آج سے ۸۴ سال قبل پیش کی گئی تھی اگر ہندوستان میں عموماً طور پر ان تجویزوں پر غور و عمل ہوتا تو صورتِ حال بالکل مختلف ہوتی، طریقۂ تعلیم کے اصلاح کے سلسلے میں پہلی تجویز مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے پیش کی تھی، اور موصوف نے اصلاحِ نصاب کے مسئلہ کو بڑی جامعیت سے بیان فرمایا، مولانا شبلیؒ نے اس تجویز کی تائید میں ایک عالمانہ تقریر فرمائی اور بتلایا کہ "اسلام میں آغاز تعلیم سے طریقۂ تعلیم کیا رہا؟۔ نصاب کیونکر بدلتا رہا؟ علوم معقولات کا رواج کیسے ہوا؟ درس نظامیہ کی بنیاد کیونکر پڑی؟ اور موجودہ نصاب میں کیا کیا نقائص ہیں؟ مثلاً معقولات کی کتابیں ضرورت سے زیادہ ہیں منطق کی کتابوں میں متاخرین نے

الٰہیات کے مسئلے مخلوط کر دیئے ہیں، کتابوں کے الفاظ و عبارت کے ساتھ فن کی بھی تعلیم ہونی چاہیئے، ادب کی کتابیں پڑھائی جائیں، قرآن پاک اور علوم قرآن کی کتابیں داخلِ نصاب کی جائیں اور طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی جائے۔

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ جب مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے یعقوب کندی، حکیم فارابی، ابن سینا، قطب الدین رازی کے نصابات بدلتے رہے تو سلسلۂ درس نظامیہ کا آج تک بغیر تغیر بحال رہنا کس لحاظ سے ہے، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے علماء نے اس اہم مسئلے کی طرف توجہ کی اور آج یہ مسئلہ ایسی پُر وقعت مجلس میں پیش ہے جس میں چار دانگ ہند کے علماء تشریف فرما ہیں"

اس تجویز کی تائید میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا جو متانت، زور انشاء، جدید و قدیم معلومات کا بہترین نمونہ تھا، اصلاح نصاب کی ضرورت کے موضوع پر مولانا حالی نے اس جلسہ میں اپنی تقریر لکھ کر بھیجدی تھی، وہ کسی وجہ سے جلسے میں شریک نہ ہو سکے، ان کی تقریر اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئی، اس میں انھوں نے تاریخ و جغرافیہ اور نصاب تعلیم کی تبدیلی کی اہمیت و ضرورت کے ساتھ عربی زبان و ادب کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دلائی تھی، اس جلسہ میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا مقالہ بھی تھا، ان کے علاوہ نصاب تعلیم کی تائید میں مولانا محمد عبدالغنی صاحب مبشر رشید آبادیؒ، مولانا محمد یونس خاں صاحب "یُمن" "تاولی" مولوی حافظ نیاز احمد صاحب ہیڈ ماسٹر اسکول فتح پور، مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی پروفیسر عربی اورینٹل کالج لاہور، مولانا محمد عبدالعلی آسی مدراسی اور مولانا حکیم محمد عبدالباری عظیم آبادی نے پُر مغز اور مدلل تقریریں کیں، اور اپنے مقالات پیش کئے، اجلاس کی روداد میں یہ تمام تقریریں اور مضامین ہیں، اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں:۔

اصلاح نصاب کی یہ تجویز کثرت رائے سے منظور ہوئی اور اس کے مطابق بارہ علماء کی

ایک مجلس موجودہ نصاب اور طریقۂ تعلیم پر غور کر کے اپنی سفارشات پیش کرنے کی غرض سے مقرر کی گئی اس کے ارکان میں استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحبؒ، مولانا عبدالحق صاحب حقانیؒ، مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، مولانا سید ظہور الاسلام صاحبؒ، مولانا ابراہیم صاحب آروی، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواڑیؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ اور مولانا محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء، مولانا عبدالغنی صاحب، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا عبداللہ انصاری یہ حضرات تھے ـــــ اس کے بعد بقیہ تینوں تجاویز کثرت آراء سے منظور ہوئیں اور تیسری تجویز منظور ہونے کے بعد دستور العمل کی دفعہ ۱۱ کے مطابق مجلس انتظامیہ کے سولہ ارکان کا انتخاب عمل میں آیا، اور چار علماء مولانا لطف اللہ صاحبؒ علی گڑھی، مولانا محمد شاہ محدثؒ، مولانا محمد عادل اور مولانا عبدالواحد کانپوری اعزازی ارکان قرار دیئے گئے، اس طرح ندوۃ العلماء ایک قانونی تنظیم کی شکل میں جلوہ گر ہو گئی۔

تعارفی جدوجہد

ندوۃ العلماء کے اس پہلے اجلاس عام کے بعد ارکان و بہی خواہانِ ندوہ نے اس کے مقاصد کی اشاعت تکمیل اور ترقی کے لئے تعارفی جدوجہد کا آغاز کر دیا جس میں پیش پیش رہنے والوں میں مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواڑیؒ، مولانا عبدالحق حقانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانیؒ، مولانا حکیم عبدالحی صاحب حسنیؒ، مولانا حکیم سید ظہور الاسلام صاحب، مولانا فتح محمد نائب لکھنوی صاحب اور مولانا شبلی نعمانیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مولانا حقانی نے دہلی بمبئی اور حیدرآباد تک ندوۃ العلماء کی سرگرمیاں پہونچا دیں۔

منشی بدرالدین صاحب بی اے بن عبداللہ صاحب جے، پی نے بمبئی میں سب سے۔ ۱۲

توجہ کی اور نہایت جوش و خروش سے اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے استقبال و تائید

جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور علمائے دین کے درمیان خلیج کو دور کرنے میں ندوۃ العلماء کو پہلی کامیابی اپنے اس اجلاس کے بعد ہوئی، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے ندوۃ العلماء کا باقاعدہ خیر مقدم اس تجویز کی شکل میں ظاہر ہوا، جسے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے اپنے سالانہ اجلاس ۱۸۹۴ء منعقدہ علی گڑھ میں نواب محسن الملک کی تجویز اور سید محمود کی تائید سے باتفاق آراء منظور کیا اور جسے سرسید نے ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر مسلمانوں میں تقسیم کیا۔

اس ریزولیوشن کی عبارت حسب ذیل تھی:۔

"اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جلسۂ ندوۃ العلماء جو بمقام کانپور منعقد ہوا تھا اور جس میں علماء اور اکابرین جمع ہوئے تھے، تمام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہے اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقۂ تعلیم اور رفع نزاع باہمی نہایت عمدہ اور مفید ہیں، تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبود متصور ہے، بدل و جان قلم سے، قدم سے، دم سے مدد کرنی چاہیئے۔"

نواب محسن الملک کی تقریر

اس تجویز کو پیش کرتے ہوئے نواب محسن الملک نے ایک مفصل تقریر فرمائی اور اس میں پرزور لفظوں سے تحریک ندوۃ العلماء کی افادیت و اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی، انھوں نے اپنی تقریر میں جا بجا ندوۃ العلماء کے اجلاس اول کی روداد سے ان تقریروں کے حوالے دیئے، جو

ندوۃ العلماء کے اجلاس میں علماء نے کی تھیں۔

انھوں نے فرمایا کہ "حضرات! ہمارے اس جلسہ کا مقصود اپنی قوم میں تعلیم پھیلانا اور ان علوم و فنون کا جاری کرنا ہے جس سے ہمارے دین اور دنیا دونوں کی فلاح اور ترقی ہو، مگر اس مقصود کے حاصل ہونے کی اس وقت اچھی امید ہو سکتی تھی، جب کہ وہ مقدس لوگ جو اپنے علم و فضیلت اور زہد و پرہیزگاری سے مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہیں، اور شریعت و ملت کی مشعل لے کر ہم کو سیدھی راہ بتا سکتے ہیں اس میں شریک ہوتے ..... بارے خدا کا شکر ہے کہ ہمارے دل کی کشش نے اپنی تاثیر دکھائی ..... ہمارے بزرگوں نے اپنی قوم کی بیماری تسلیم کی، وہ اس کے علاج پر آمادہ ہوئے اور قومی مجلس نے ایک دوسری نہایت پاکیزہ اور دلربا شکل میں ظہور کیا، یعنی ہندوستان کے مشہور اور نامور عالموں کا ایک بڑا جلسہ کانپور میں ہوا۔

میں قوم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ حضراتِ علماء نے زمانہ کی ضرورت کو دیکھا اور ہماری اصلاح و ترقی پر متوجہ ہوئے، یہی ہماری خواہش تھی اور یہی ہمارا مقصود ہے، خواہ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ہو یا ندوۃ العلماء کے مبارک لقب سے، اور اس کے لئے ہم علی گڑھ میں جمع ہوں یا کانپور میں۔

اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات کیا کہنا چاہتے ہیں تو اس روداد کو دیکھئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ اس مقدس فرقہ کو بھی اپنی قوم کی غفلت اور کاہلی کی شکایت ہے، اور نہ صرف عوام بلکہ علماء کے باہمی اختلاف پر افسوس ہے، وہ بھی موجودہ تعلیم کو غیر کافی اور قابل اصلاح اور طرزِ تعلیم کو غیر مفید اور لائق تبدیل سمجھتے ہیں۔

حضرات! ندوۃ العلماء کی پہلی ہی مجلس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تعصب، خود پسندی، اور رسوم کی پیروی کی بو بھی نہیں پائی جاتی۔

آپ ذرا ان تقریروں کو سنئے جو قوم کی غفلت اور باہمی مخالفت کی نسبت ہمارے علماء

نے اس مجلس میں کی ہیں ان ہی کے دردانگیز الفاظ میں سنئے، مولانا ابو محمد عبدالحق دہلوی اپنی فصیح وبلیغ تقریر یوں شروع فرماتے ہیں:۔

"الحمد للہ مدت مدید کے بعد ہماری قوم بھی خواب غفلت سے بیدار ہوئی، جو دنیا میں بڑے بڑے کارنمایاں کرکے تھکی ماندی ہو کر سو گئی تھی، اور ایسی سوئی تھی کہ اس عرصہ میں وہ قومیں جو میدانِ ترقی میں صدہا کوس پیچھے تھیں، بہت آگے نکل گئیں، اور نکلی چلی جارہی ہیں۔

حضرات! غفلت اور نااہلیت سے بڑھ کر قوم کی خرابی کا بڑا سبب اختلاف ہے اس کی برائی، ندوۃ العلماء نے اس طور پر ظاہر کی کہ جس سے ہمارے علماء کی عالی دماغی، بلند خیالی اور پاک دلی ظاہر ہوتی ہے، اس جلسے میں وہ پاک الفاظ نکلے جو اس قابل ہیں کہ ہر ایک مسلمان صفحۂ دل پر لکھے اور اس پر عمل کرے"۔

وہ فرماتے ہیں:۔

"اول برکت ندوۃ العلماء کی یہ ہے کہ اس نے مقلدین اور اہل حدیث قدیم وجدید تعلیم یافتہ اور مختلف اذواق کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، امید ہے کہ جیسا قوائے مختلفہ کو اکٹھا ہونے سے ایک کیفیت متشابہ پیدا ہو جاتی ہے جس کو مزاج کہتے ہیں، ان طبائع مختلفہ کے اجتماع سے ایک دوسری حالت پیدا ہو، جو قریب قریب اعتدال حقیقی کے ہو جائے"۔

صاحبو! جس طرح ہمارے علماء نے مذہبی جھگڑوں کی برائیاں بیان فرما کر اس سے باز رہنے کی نصیحت فرمائی، اس سے کچھ کم تعلیم اور طرز تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی، بلکہ اس ضروری مسئلہ پر جو دنیا کی ترقی اور تنزلی کا اصلی ذریعہ ہے، نہایت غور فرمایا، چنانچہ جہاں مقاصد ندوۃ العلماء بیان کئے گئے وہاں اس بات کا اقرار ہے کہ تمام خرابیوں کا باعث نقصان طرز تعلیم اور نااتفاقی ہے، اور اس کے بعد پھر صاف صاف یہ کہا ہے کہ اصلاح طریقۂ تعلیم کا مطلب

یہ نہ خیال کیا جائے کہ ندوۃ العلماء کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ موجودہ کتب درسیہ میں شرحی یا کمی یا ردّوبدل کر دیا جائے، نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی مدنظر ہے کہ کیا طرز تعلیم اختیار کیا جائے اور کون سے اسباب مہیا کئے جائیں، جن سے ہمارے مدارس کے منتہی طلباء کو قابلیت تامہ اور مذاق صحیح حاصل ہو اور تحقیقات علمیہ کا شوق اور کمال حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا ہو، اور مخالفین دین کو شائستہ اسلوب سے جواب دے سکیں، اس مضمون کی تشریح مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے بہت اچھی طرح اپنے پرزور اور نہایت فصیح و بلیغ تقریر میں کی ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"تعلیم میں ایسی ترمیم کرنی چاہیئے کہ وقت کم صرف ہو، اور ضروری علوم آجائیں، اس طریقہ سے پہلے جو تعلیم کا طریقہ تھا، اس میں زمانہ کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے ترمیم کی گئی، اب طریقۂ مروّجہ میں ضرورت کے موافق کیوں ترمیم نہ کی جائے، اس تعلیم سے عربیت نہیں آتی، اور باوجود علوم عربیہ کی تکمیل کے نثر و نظم لکھنا تو درکنار سمجھنے کی قدرت بھی نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ اس تعلیم میں کتاب اللہ کے سمجھنے اور اس کے نکات اور دقائق کے دریافت کا لحاظ کم کیا گیا ہے، تیسرے یہ کہ اس تعلیم میں ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں تہذیب نفس کے قواعد بیان کئے گئے ہوں، سابق کا علم کلام جو فلاسفہ اور معتزلہ کے رد سے بھرا ہوا ہے، اب نہ وہ معتزلہ ہے نہ فلاسفہ، ان کے خیال بدل گئے، مگر اب علم کلام میں فلاسفۂ حال اور ردّ نصاریٰ کے داخل کرنے کی ضرورت ہے نیز ایسی کوئی کتاب اس تعلیم میں نہیں رکھی گئی جس سے احکام دین کے اسرار اور ان کی خوبیاں معلوم ہوں، حالانکہ زمانۂ حال کے موافق اس کی بڑی ضرورت ہے۔

حضرات! کوئی قوم ایک سی حالت پر قائم نہیں رہ سکتی، اس لئے کسی قوم کو اپنی ذلت اور ادبار کو دیکھ کر دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیئے، آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سمت درستی اور ترقی کی

تدبیریں ہو رہی ہیں، اس کا ثبوت ندوۃ العلماء ہے، اس نے اول ہی اجلاس میں دنیا کو متعجب کر دیا، اپنے عمدہ اور پاکیزہ خیالات سے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں، اور اپنی مفید اور ضروری تجویزوں سے اس بات کو ثابت کر دیا کہ یہی وہ گروہ ہے جو قوم کی رہنمائی کر سکتا ہے، اور قوم کو منزل مقصود پر پہنچا سکتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اس اجلاس میں فرمایا کہ:۔

"وارثِ انبیاء کون سے علماء ہیں، انبیاء نے کوئی جائداد نہیں چھوڑی، انھوں نے صرف چند صفات چھوڑے جو ان سے متصف ہے وہی ان کا وارث ہے، صرف کتابوں پر عبور کر جانا ان کا وارث نہیں بنا سکتا، نصاب تعلیم میں ایسی ترمیم ہو جس میں مذہبی علوم سے طلباء کو کما حقہ لگاؤ حاصل ہو، پھر ان کو اتنا وقت ملے کہ فنون جدیدہ میں توغل اور زمانے کے رنگ و ڈھنگ، نشیب و فراز، آثار و اطوار سے شناسائی پیدا کر سکے۔"

مولانا عبداللہ صاحب انصاری (داماد مولانا قاسم صاحب نانوتوی) نے اپنی قوم کی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:۔

"اس وقت جو ہم اپنی تعلیمی اور اخلاقی حالت دیکھتے ہیں تو اس میں انتہا درجہ کی ابتری پاتے ہیں، اور اس پر آفت یہ ہے کہ ہماری تقدیر نے ایسا قضیہ منعکس کر دیا کہ ہم لوگ بلا کو عطاء، درد کو دوا، زحمت کو رحمت، نقمت کو نعمت، تلون کو استقامت، ذلت کو عزت، قساوت کو تصوف، نفسانیت و تعصب کو حمایت دین و ملت سمجھنے لگے، بھلا وہ مریض کیونکر صحت پا سکتا ہے، جو اپنے آپ کو مریض نہ سمجھے۔

بلا ضرورت کئی مدرسے ہیں، اور ہر مدرسہ کے مدرس و مہتمم اپنے ہی مدرسہ کی ترقی کے خواہاں ہیں، حتیٰ کہ بعض حضرات اس درجہ اپنے مدرسہ کی خیر خواہی میں منہمک ہو جاتے ہیں کہ دوسرے مدارس کے

تنزل بلکہ تخریب کے درپے ہو جاتے ہیں"

حضرات! ندوۃ العلماء کے فوائد کے متعلق جو کچھ میں نے کہا اسے جیسا کہ چاہئے میں بیان نہ کر سکا مگر غالباً میں اپنے پیش کئے ہوئے ریزولیشن کے ثابت کرنے میں ضرور کامیاب ہوا، پس اے حضرات! اگر ہم درحقیقت قومی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم ان کو آگے رکھیں، علم کا نورانی جھنڈا لے کر قوم کو جہاد اکبر پر آمادہ کریں، تاکہ جہل، تعصب، اوہام جو قوم کے حقیقی اور زبردست دشمن ہیں، مغلوب کئے جائیں، مجھے امید ہے کہ یہ مبارک جھنڈا جو ہمارے علماء نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے، اور جس پر بے تعصبی اور قومی ہمدردی کے مبارک الفاظ لکھے ہیں، اسے اب ہاتھ سے گرنے نہ دیں گے، اور پھر ایک مرتبہ قرطبہ اور بغداد کی یاد دلائیں گے "وَإِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ"[1]

سرسید مرحوم کا خط

جدید تعلیم یافتہ طبقہ، اور اس تحریک کے داعیوں کو قریب کرنے کے لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اس طبقہ کے بااثر حضرات سے رابطہ پیدا کیا، اور انھیں اس اجلاس کی دعوت دی، مولانا محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء نے اس سلسلہ میں سرسید احمد خاں مرحوم کو جو خط لکھا تھا، اس کا مفصل جواب سرسید نے دیا، اور ندوۃ العلماء کے مقاصد سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا، نیز انھوں نے وہ تجاویز پیش کیں جو خود ندوۃ العلماء کے داعیوں کے پیش نظر تھیں، وہ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:-

"جناب مولوی صاحب مخدوم و مکرم من مولوی محمد علی صاحب مہتمم جلسۂ ندوۃ العلماء، بعد سلام مسنون، التماس یہ ہے کہ کاغذات جلسۂ مدرسہ فیض عام کانپور مع پرچہ اطلاعی انعقاد

---

[1] مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک حصۂ اول ص ۲۴۱ تا ۲۶۶ باختصار

جلسہ ندیۃ العلماء آپ کا دستخطی مرسلہ حافظ الٰہی بخش صاحب مہتمم مدرسہ فیض عام کانپور میرے پاس بحیثیت ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ پہونچا، ممنون عنایت ہوا، خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایسا جلسہ جس میں ہمارے زمانہ کے علماء و اکابر واسطے فلاح مسلمانوں کے جمع ہوں گے، منعقد ہونے والا ہے ندیۃ العلماء کے اغراض جس کو میں نہایت عمدہ اور مفید خیال کرتا ہوں، یہ بیان ہوئے ہیں کہ "علوم اسلامی کیونکر زندہ رہ سکتے ہیں، اور مسلمانوں کا نفاق باہمی کس طرح رفع ہو سکتا ہے، اور آئندہ کون سے طریقے اختیار کئے جائیں، جس سے اسلام اور نیز مسلمان اچھی حالت میں قائم رہ سکیں" یہ مقاصد نہایت عمدہ ہیں، اور خدائے تعالیٰ ان میں کامیاب کرے، اور خدائے تعالیٰ ہمارے زمانہ کے علماء کو سلف صالحین کی پیروی نصیب کرے، اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کی عداوت ان کے دل سے دور کرے، مگر ایک امر جو سب سے ضروری اور مقدم ہے، میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک زمانہ مسلمانوں پر ایسا گزرا ہے کہ جس میں بجز تحصیل علوم دین کے اور کسی علم سے سروکار نہ تھا جس کے سبب علوم دین کی ہزار کتابیں، حدیث، تفسیر، فقہ، اسماء الرجال، اصول حدیث، اصول فقہ وغیرہ موجود ہو گئیں، اس کے بعد ایک زمانہ آیا جس میں حکمت و فلسفۂ یونان کا مسلمانوں میں رواج ہوا، اور اس کے سبب سے مذہبی عقائد میں بہت کچھ خلل واقع ہوا یا واقع ہونے کا اندیشہ ہوا، اس وقت علماء نے مذہب اسلام کی تائید پر کمر باندھی، اور علم کلام ایجاد کیا، اسلام کی نصرت کی، مگر وہ زمانہ بھی گیا، اور جدید فلسفہ اور جدید حکمت اور جدید علوم حکمیہ پیدا ہوئے، اور اس کے مسائل اور جو تحقیقات علوم طبعی کی اس میں ہوتی ہے وہ بہت زیادہ مخالف مسائل موجودہ اسلام کی ہے، اور ان جدید علوم کا روز بروز زیادہ شیوع ہوتا جاتا ہے، اور کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہو سکتا، اگلے زمانہ کے عالموں نے بھی حکمت اور فلسفۂ یونان بلکہ منطق پڑھنے کو بھی حرام قرار دیا تھا، مگر اس سے کچھ نتیجہ نہیں ہوا، ہزاروں لاکھوں

آدمیوں نے اس کو پڑھا اور لا چار خود علماء نے اس کی تحصیل کی، اور علم کلام ایجاد کیا۔

جو مسائل حکمت و فلسفہ و طبعیات کے علوم جدیدہ کے ذریعہ سے پیدا ہوئے ہیں ان کے لئے وہ علم کلام جو یونانی فلسفہ و حکمت کے مقابل بنایا گیا تھا، کافی نہیں ہے، اور تفاسیر قرآن مجید و حدیث شریف اور دیگر کتب مصنفہ اہل اسلام میں اس کے متعلق کچھ پایا نہیں جاتا، اور اس سبب سے الحاد و زندقہ مسلمانوں میں پھیلتا جاتا ہے، جو نہایت سخت وبا ہے، جس کی روز بروز ترقی ہونے کی امید قوی ہے پس اس کا کیا علاج ہے۔؟

امید ہے کہ آپ میرے اس عریضہ کو ندوۃ العلماء کے سامنے پیش فرمائیں گے اور جو ہدایت علماء کی اس باب میں ہو اس کو مشتہر فرما دیں گے، تاکہ مسلمان اس آفت سے جس کی پناہ کسی جگہ نہیں معلوم ہوتی، محفوظ رہیں۔"

علی گڑھ — والسلام۔ خاکسار

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء[1] — سید احمد

ندوۃ العلماء کا عام استقبال

تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے مقاصد و تخیل کا ملک کے عوام و خواص، قدیم و جدید طبقے اور مختلف مسلک و مکتب فکر سے وابستہ حضرات نے جس گرم جوشی سے استقبال کیا اس کی نظیر اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی، کشمیر سے ڈھاکہ اور حیدرآباد تک یہ نئی اور نامانوس صدا ہر اس شخص کی دل کی دھڑکن بن گئی جو ملت کی زبوں حالی اور پراگندگی سے مایوس و مضطرب تھا اس اجنبی صدا نے ہندوستان کے مسلمانوں کے رگ و پے میں ایک نئی روح دوڑا دی اور انھیں اپنی

---

[1] خط ماخوذ از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مطبوعہ ۶ اپریل ۱۸۹۴ء صفحہ ۳۵۸

سماجی، تعلیمی اور فکری دنیا کی تاریکی میں امید کی نئی کرن نظر آئی، ندوۃ العلماء کے اجلاس دوم منعقدہ لکھنؤ کی روداد کا آغاز مولانا محمد علی مونگیریؒ اس پُرمسرت تحریر سے کرتے ہیں:۔

"خداوند عالم کا نہایت شکر گزار ہوں کہ اس مبارک انجمن (ندوۃ العلماء) کی عمر ایک سال کی ہوئی، اور اسی ایک سالہ عمر میں اس نونہال نے کسی قدر عالم گیر شہرت اور قابل قدر وقعت حاصل کی جس کو فضل ربانی اور تائید یزدانی کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے، غالباً ہندوستان کا کوئی شہر، کوئی قریہ نہیں جہاں اس کا ذکر خیر نہ پہونچا ہو، کوئی دانشمند ایسا نہ ہوگا، جو امید کی نظروں سے اسے نہ دیکھتا ہو، کوئی مصلح اور بہی خواہ اسلام ایسا نہ ہوگا جو اس کی رفتار و گفتار پر ہمہ تن گوش نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اس کی ایک پکار میں ملتان سے لے کر ڈھاکہ، حیدرآباد تک کے اہل ہم جمع ہو گئے، وہ حضرات علماء و مشائخ اس جلسے میں منزلیں طے کر کے تشریف لائے جو اپنے شہر میں بھی عام جلسوں میں شریک نہ ہوتے تھے، بعض علماء کی زبان سے یہ بھی سنا کہ الٰہی! کیسی مقناطیسی کشش ہے کہ بے اختیار اس قدر دُور دُور دراز سے لوگ چلے آتے ہیں، اگر کوئی بادشاہ بھی بلاتا تو اس مسرت کے ساتھ اپنا روپیہ صرف کر کے اس قدر لوگ ہرگز نہ آتے، الغرض یہ شہرت، یہ دلفریبی، اور یہ جذب مقناطیسی ضرور تائید غیبی کی خبر دیتی ہے، یہ عام دلآویزی اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ جس کام کا اعلان ندوہ نے کیا ہے، ایسا ضروری اور قوم کے لئے مفید ہے کہ بے اختیار ان کے قلوب ایسے کھنچے جاتے ہیں، جیسے پیاسا مضطربانہ دوڑتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ یہ ندوہ ایسی منفعت کی چیز ہے کہ جس کی مسلمانوں کو بے انتہا احتیاج ہے، اگر ہمارے اہل اسلام اور خصوصاً علمائے کرام نے پوری ہمت اور استقلال سے کام کیا تو وہ عمدہ نتائج وہ خود اور ان کی اولاد دیکھے گی جو ان کے وہم و خیال میں بھی اس وقت نہیں"[1]

---

[1] روداد اجلاس ندوۃ العلماء۔

دوسرا سالانہ اجلاس

ندوۃ العلماء کا دوسرا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا، جس شہر کو مستقبل میں ندوۃ العلماء اور اس کے قائم کردہ دار العلوم کا مرکز ہونا مقدر تھا، اس اجلاس کے محرک منشی اظہر علی صاحب کاکوروی وکیل لکھنؤ و مشیر قانونی انجمن تعلقداران اودھ تھے، اجلاس ندوۃ العلماء کے لکھنؤ میں انعقاد اور منشی اظہر علی صاحب کی اس سلسلہ میں کوشش و سرگرمی کا محرک خود منشی صاحب کے الفاظ میں یہ تھا، وہ کہتے ہیں:۔

"یکبارگی منجانب اللہ اس جلسہ کی عظمت اور عمدگی میرے قلب میں آئی، اور خیال ہوا کہ یہ جنبش معمولی نہیں ہے، اور اس خیال میں ایسا جوش ہوا کہ اسی وقت میں نے اس کی ذمہ داری کا خط لکھا" یہ خط ۲۲ جنوری ۱۸۹۵ء کا لکھا ہوا ۲۴ جنوری ۱۸۹۵ء مطابق ۲۷ رجب ۱۳۱۲ھ کو دفتر ندوۃ العلماء میں موصول ہوا، جس میں موصوف لکھتے ہیں:۔

"میری خواہش ہے کہ جلسۂ ندوۃ العلماء کی خدمت گزاری کا فخر لکھنؤ میں مجھ کو عطا کیا جائے میں اپنے مہمانوں کی فکر قیام اور تناول ماحضر کی کروں گا، ہاں آپ لوگوں کی اور دیگر دوستوں کی صرف اعانت کا شکر گزار ہوں گا، مجھ کو امید ہے کہ آپ اور دیگر حضرات میری اس ناچیز خواہش کو پورا کر کے جواب سے مطلع فرمائیں گے"[1]

---

[1] روداد سال دوم ص۱۸

نظم و شائستگی کا عجیب مظاہرہ

ندوۃ العلماء کے اجلاس اپنے نظم و شائستگی، سنجیدگی اور افادیت میں ایسے مثالی اجلاس ہوتے تھے، کہ جن کی نظیر اس دور میں ہمیں کسی تحریک اور جماعت کے جلسوں میں نظر نہیں آتی ان جلسوں میں نشر و اشاعت اور پبلسٹی کے ایسے مؤثر اور (UPTODATE) ذرائع استعمال ہوتے تھے کہ آج کی متمدن سوسائٹی میں بھی اس قدر اہتمام اور جزئیات کا خیال شاذ و نادر ہی ہوتا ہو، ندوۃ العلماء کے اجلاس دوم کی روداد صـ۱۹ پر ایک نقشہ درج ہے اس سے ندوۃ العلماء کے نشر و اشاعت کے طریقے اور اس کے کارکنوں کی تنظیمی صلاحیت کا حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے، اس نقشہ پر عنوان ہے۔

نقشہ اشاعت اشتہارات جلسۂ سال دوم ندوۃ العلماء بمقام لکھنؤ

نمبر شمار	نام اشتہار	تعداد طبع	تاریخ اشاعت	کیفیت
۱	اشتہار عام بار اول	۴۸۰۰	۲۱ شعبان ۱۳۱۲ھ	اس اشتہار میں یقینی تاریخ کی اطلاع اور مضامین بھیجنے کا قاعدہ بیان کیا گیا تھا
۲	خطوط دعوت	۱۲۰۰	۲۴ "	یہ خط اہتمین مدارس و انجمنہائے اسلامیہ کے واسطے تھا اور بضرورت عام اشاعت بھی ہوا۔
۳	خطوط بنام ایڈیٹران	۱۵۰	" "	اس میں مخصوص ایڈیٹران اخبار کو دعوت کے علاوہ مضمون بھیجنے کی اطلاع دی گئی تھا۔
۴	نقشہ برائے دریافت حال انجمنہائے مدارس اسلامیہ	۱۰۰۰	" "	اس نقشہ سے آمد و خرچ و دیگر کیفیات مدارس و انجمنہائے اسلامیہ کے دریافت کیے گئے
۵	خطوط بنام اراکین	۳۰۰	۲ رمضان ۱۳۱۲ھ	اس میں مخصوص ممبران کو تاریخ جلسہ کی اطلاع دی گئی۔
۶	خطوط دعوتی بنام علماء	۲۴۰	۲۰ "	یہ خط دعوتی بزبان فارسی مخصوص علماء کی خدمت میں بھیجا گیا۔
۷	خطوط دعوتی بنام رؤسا	۲۴۰	" "	یہ خط مخصوص رؤسا کو بھیجا گیا۔
۸	کارڈ جوابی	۱۰۰	۲۴ "	یہ کارڈ جوابی مخصوص مہتممین مدارس و انجمن کے پاس بھیجا گیا۔
۹	اشتہار بار دوم	۶۰۰	۸ شوال ۱۳۱۲ھ	اس اشتہار میں یقینی تاریخ کے علاوہ قواعد جلسہ کا اظہار کیا گیا تھا
۱۰	کارڈ والئ جلسہ انتظامیہ	۶۰۰	" "	اس میں اس جلسے کی کارروائی کا اعلان کیا گیا تھا جو عام جلسے کے انتظام و انتخاب عہدہ جات کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔
۱۱	اشتہار کلاں	۱۵۰	" "	یہ اشتہار خاص لکھنؤ و اطراف میں بغرض اطلاع عام شاہراہوں پر لگایا گیا تھا

اب ایک نظر ان کمیٹیوں کے نام پر ڈالئے جن کے سپرد اجلاس کے مختلف انتظامات تھے۔

جماعت مدارات: ۔ اس کا کام مہمانوں کا استقبال اور ان کے لئے مکانات و فرش پلنگ و ضروری سامان کی فراہمی اور شب و روز ان کی ضروریات کا خیال تھا۔

جماعت پخت طعام، جماعت خورانید طعام، جماعت انتظام جلسہ۔

جماعت اراکین دار التفریح: ۔ اس کے متعلق یہ کام تھا کہ ایک مکان عمدہ آراستہ کرے اور اس میں عربی، فارسی کی نادر کتابیں اور اردو کی دلچسپ کتابیں اور مختلف زبانوں کے اخبارات عوام کے مذاق کے لئے مہیا رکھے تاکہ معزز مہمانوں کا بیش بہا وقت ضائع نہ ہو، کاغذ، قلم، دوات لفافہ، کارڈ، ٹکٹ وغیرہ بھی موجود رکھیں، تاکہ مہمانوں کو دور جانے کی تکلیف نہ ہو۔

جماعت اراکین حفظ صحت: ۔ اس جماعت میں مشہور و تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔

شرکائے جلسہ کے لئے چار قسم کے ٹکٹ مختلف رنگوں کے تجویز کئے گئے تھے، ایک علماء کے لئے، دوسرا اراکین کے لئے، تیسرا مہمانوں کے لئے، چوتھا معززین شہر کے لئے۔

آج سے ۸۳ سال قبل ندوۃ العلماء کے اجلاس کے نظم و انتظام کا ایسا اعلیٰ نمونہ ہمیں مسلمانوں یا غیر مسلموں کی کسی سیاسی تعلیمی اور سماجی جماعت کے جلسوں میں نہیں ملتا، علماء جن پر اسلامی شان و شوکت، سطوت و حکومت کے زوال کے بعد بدنظمی، زمانہ سے بے خبری، تاریک خیالی اور کاہلی کا الزام اپنوں نے اور غیروں نے لگایا، انھوں نے ندوۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے نہ صرف اپنی ذہنی و فکری بلندی، وسیع النظری، حالات سے باخبری، اور بصیرت کا ثبوت دیا بلکہ نظم و انتظام کا بھی وہ نمونہ پیش کیا کہ جس سے زائد کوئی دوسرا طبقہ آج تک نہیں پیش کر سکا، ندوۃ العلماء کے تمام اجلاس حسن انتظام کا ایسا نمونہ ہوتے تھے کہ جس سے آگے ذہن اس دور ترقی میں بھی نہیں جاتا۔

جلسہ گاہ

ندوۃ العلماء کا اجلاس دوم ۱۶ر ۱۷ر ۱۸ر شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۲ر ۱۳ر ۱۴ر اپریل ۱۸۹۵ء جمعہ، شنبہ، یکشنبہ کو بارہ دری قیصر باغ میں منعقد ہوا۔ قیصر باغ کی بارہ دری اور اس کے جنوب کی جانب کا میدان جہاں موسم کے لحاظ سے فرش زمردیں عجیب لطف دیتا تھا، ندوہ کی کارروائی سفید بارہ دری میں ہوتی تھی، اور وسیع میدان میں شامیانوں کے نیچے عام مسلمانوں کے نفع کی غرض سے علماء کا وعظ ہوتا تھا۔ قیصر باغ کے اطراف کے مکانات مہمانوں کے قیام گاہ تھے، قدرت کی نیرنگیاں عجیب و غریب ہوتی ہیں، وہ مکانات جو دنیا کی عیش و عشرت کے لئے بنائے گئے تھے، وہاں حضرات علماء اور بزرگ و مشائخ قیام پذیر ہوں، وہ بارہ دری جو مدت سے دنیاوی کاموں میں آتی تھی، اس میں اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کی بہبودی کے لئے علماء وعظ کہیں اور حضرات مشائخ اور دیگر معززین اہل اسلام اس میں صلاح و فلاح کی تدبیریں سوچیں ؎

ہست دور آسماں گاہے چنیں گاہے چناں

بارہ دری میں نشست کا انتظام اس طرح کیا گیا تھا کہ اس کے بیچ کے کمرے میں علماء اور اراکین ندوہ کے لئے اس طرح مخصوص کیا گیا تھا کہ مغرب کی جانب ایک حد تک تخت بچھا کر اس پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں، یہ کرسیاں علماء کے لئے مخصوص تھیں، سامنے ایک بڑی بیضاوی میز تھی، جس کے گرد اراکین انتظامی ندوۃ العلماء کی کرسیاں تھیں، اور ان تختوں کے نیچے جنوب اور شمال کی طرف اخباری نامہ نگاروں کے لئے نشست رکھی گئی تھی، اس کے سامنے مشرق کی طرف عام اراکین کی نشست تھی، ایک طرف عام اہل اسلام کے لئے جگہ معین تھی، بارہ دری کے اندرونی دروازے پر خوشخط نسخ میں یہ آیت آویزاں تھی "سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا" بیرون دروازے

پر ایک طرف بقلم جلی یہ آیت کپڑے پر لکھی ہوئی بشارت دے رہی تھی "اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" دوسری طرف دس گز طولاً اور ڈھائی گز عرضاً کپڑے پر خوش خط لکھا ہوا تھا:
"جلسۂ ندوۃ العلماء" اُسی خطِ نسخ میں مولانا عبدالعلی آسی مدراسی نے تحریر فرمایا تھا، اور نستعلیق منشی شمس الدین اعجاز رقم نے رقم کیا تھا۔[1]

پہلی نشست

۱۶ شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۸۹۵ء بروز جمعہ صبح ۶ بجے پہلی نشست شروع ہوئی، پہلے یہ تجویز تھی کہ مولانا محمد نعیم صاحبؒ فرنگی محلی صدارت فرمائیں، مگر آپ نے ضعف اور گوشہ نشینی کا عذر فرمایا، لہٰذا ناظم ندوۃ العلماء کی تحریک اور مولانا عبدالحق صاحب دہلوی کی تائید سے مولانا سید محمد شاہ محدث رامپوری صدر جلسہ منتخب ہوئے، مولانا عبدالمجید صاحب فرنگی محلی نے چند آیات قرآن مجید عمدہ لہجہ میں تلاوت کیں، بعد سال گذشتہ کی رپورٹ ناظم ندوۃ العلماء مولانا مونگیریؒ کی طرف سے مولانا شبلی نعمانی نے پڑھکر سنائی جس میں ان الفاظ میں سال گذشتہ کا جائزہ لیا گیا تھا۔

"اصلاح نصاب کی تجویز کے متعلق قرار پایا تھا کہ علمائے حاضرین میں سے چند علماء کی مجلس قائم کی جائے جو غور و فکر کرکے دیگر علماء کے مشورے سے جدید نصاب تجویز کرے، اس مجلس کے جملہ ۱۶ ارکان تھے، اگرچہ یہ کام نہایت مفید اور اہم تھا لیکن چونکہ فی زماننا بالکل نیا کام تھا، اور کتابوں کے انتخاب اور ترمیم میں مختلف اور متعدد مشکلات تھے، اور کتابوں کے دقائق اور مضامین مفیدہ اور غیر مفیدہ پر کامل غور و امعان نظر کے لئے زیادہ وقت و زمانہ کی ضرورت تھی

[1] روداد سال دوم ص ۳۲، ۳۳

لہٰذا اس تجویز میں پوری کامیابی نہیں ہوئی، البتہ اس قدر ہوا کہ بعض علماء نے مفصل اور بعض نے مجمل نقائص تعلیم اور وجوہ ترمیم لکھے، اور بعض نے صرف کتابوں کے نام انتخاب کر کے بھیجے، مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی نے اپنی کامل لیاقت کی داد دی، اور ایک خاص رسالہ اس باب میں لکھا۔ اسی طرح مولانا عبدالعلی آسی صاحب مدراسی نے بہت تفصیل سے رائے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو نصاب دو سو برس سے معمول بہ ہو، اس کی ترمیم و اصلاح ایک برس کا کام نہیں تاہم اس امر کے بیان کرنے سے مجھ کو خوشی ہے کہ اس تحریک سے اکثر علماء ہندوستان کا خیال اصلاح نصاب کی طرف مائل ہو گیا ہے، اور اس امر کو کہ نصاب موجودہ میں فن ادب اور تفسیر کے متعلق نہایت کمی ہے، اور جدید علم کلام کی ضرورت ہے، اکثر تسلیم کرتے ہیں۔

تجویز دوم یہ تھی کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم ہر سال ندوۃ العلماء کے اجلاس میں تشریف لائیں، اس تجویز کی انجام دہی مولوی نورالدین صاحب، حافظ محمد عبدالحق اور منشی سید محمد حسین صاحب رئیس بھڑوچ نے مستعدی سے انجام دی، بہت سے مدارس نے اس تجویز کو منظور کر لیا، اور بطیب خاطر ندوۃ العلماء کی ماتحتی منظور فرمائی۔

تجویز سوم یہ تھی کہ مدارس اسلامیہ کو مربوط کیا جائے اور دو تین بڑے بڑے مدرسے مثلاً مدرسہ اسلامیہ دیوبند، مدرسہ فیض عام کانپور، مدرسہ احمدیہ آرہ وغیرہ دارالعلوم قرار دیئے جائیں، اور تمام چھوٹے مدارس ان سے متعلق کئے جائیں، یہ تجویز اگرچہ نہایت مفید اور ضروری تھی، لیکن چونکہ ہندوستان میں یہ طریقہ کبھی مروج نہیں ہوا، اور نہ اس کی عادت تھی، دفعۃً ایک جدید اور خلاف عادت کی پابندی کرنا بہت دشوار تھا، اس وجہ سے اس تجویز کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہ ہو سکی، جب ہمارے بھائی غفلت کی نیند سے چونکیں گے اور اس امر کی ضرورت انھیں محسوس ہو گی تو انشاء اللہ اس تجویز میں پوری کامیابی ہو گی۔[1]

---

[1] روداد سال دوم ص ۳۵-۳۶

ندوۃ العلماء نے آج سے ۸۵ سال قبل اصلاحِ نصابِ تعلیم اور مدارس عربیہ کے وفاق کی دعوت دی تھی، بانیانِ ندوۃ العلماء کی گہری بصیرت نے جن خطرات کا ادراک کیا تھا، وہاں تک عام مسلمانوں کے ذہن کی رسائی نہیں تھی، اصلاحِ نصاب کو اس دور میں عملی جامہ پہنایا جاتا، اور مدارس عربیہ کا وفاق قائم کرکے انھیں ایک کڑی میں مربوط کیا جاتا تو اس ۸۵ سال کے طویل عرصہ میں وہ نتائج رونما ہوتے جن سے ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ نو اور دیندار طبقہ کی قیادت وامامت کی راہ ہموار ہوتی، مگر افسوس ہے کہ اس ناگزیر تبدیلی اور اصلاح پر بروقت اور ہمہ گیر عمل نہیں ہوا، اس جمود پسندی کی توجیہ ندوہ کے ایک پرانے سرگرم رکن مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے ایک جملہ میں اس طرح کی ہے کہ:-

"لوگوں کے ہاتھ میں چند برس جو لاٹھی رہ جاتی ہے اس کو چھوڑنا بھی مشکل ہوتا ہے تو جس نصاب کو صدیوں سے سینے سے لگائے چلے آرہے ہیں اس کو چھوڑنا کتنا مشکل ہوگا!"

اس جمود پسندی اور روایت پرستی نے دیندار طبقے کی اہمیت اور افادیت آہستہ آہستہ ختم کردی اور بدلے ہوئے حالات نے اُسے آثارِ قدیمہ بنا کر رکھ دیا، اب اس کوتاہی کا احساس عام ہے، اور وہ تعلیمی مراکز تک اپنے نظامِ تعلیم میں تبدیلی کی شدت سے ضرورت محسوس کررہے ہیں اور کسی نہ کسی درجہ میں اس پر عمل بھی شروع ہوگیا ہے، کامل ایک صدی کا طویل عرصہ اور فیصلہ کن دور غفلت کی نذر ہوگیا ہے، دینی مدارس کی بہتات وکثرت اور اسباب ووسائل کی فراہمی میں ان کی باہمی چپقلش، نظم وانتظام کی خامیاں، نصاب درس اور طریقۂ امتحان کی لامرکزیت اور ایک عام ابتری دیکھ کر آج ہر سنجیدہ مسلمان مدارس اسلامیہ کے وفاق کی ضرورت محسوس کررہا ہے، جو بات ایک صدی پہلے کرنے کی تھی، اس کی ضرورت آج بھی مسلّم ہے، مگر اس کی عملی تشکیل کی طرف سے عام مایوسی نظر آتی ہے، ندوۃ العلماء اپنی یہ اجنبی اور نامانوس دعوت روزِ اول سے آج تک دے رہا ہے

اس نے ذہن بنانے اور حقائق پر نظر رکھنے والا ایک حلقہ تیار کرنے کا کام برابر جاری رکھا، ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ نے اپنی ایک سالہ رپورٹ کے آخر میں اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے۔

"ایک ایسا جلسہ ہو جو ہندوستان کی تاریخ میں بالکل ایک نئی قسم کا جلسہ ہو جس کی تجویزوں سے لوگوں کے کان آشنا نہ ہوں جس کی تجاویز نہایت اہم اور مشکل ہوں، اس کے متعلق ایک سال کے اندر اس قدر کامیابیاں بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں، اس سال کے جلسے میں تمام مکاتب فکر و خیال کے عوام و خواص کا جو ہجوم اور مجمع اور جوش آپ دیکھ رہے ہیں، وہ اس دعوے کا کافی ثبوت ہے"[1]

اس رپورٹ میں ندوۃ العلماء کے سال گزشتہ کے اراکین کی تعداد ۲۲۴ بتلائی گئی جن میں چار رکن اعزازی اور اے رکن قسم اول یعنی علماء اور ۱۴۹ عام ارکان۔

رپورٹ کے بعد مولانا افہام اللہ صاحبؒ (جو لکھنؤ کے ایک تبحر اور صاحب تصانیف عالم مولانا ولی اللہ لکھنوی کے پوتے ہیں) نے ایک مبسوط مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے ندوۃ العلماء کے قیام کو وقت کی ایک اہم ضرورت نیز علم کی اہمیت کو مدلل طریقہ سے پیش کیا تھا۔

مولانا افہام اللہ صاحب کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے علماء کے فرائض پر ایک جامع اور مدلل مضمون سنایا، مولانا نے فرمایا کہ:۔

"جس زمانہ میں یہاں اسلامی حکومت قائم تھی اس وقت قوم کے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات علماء کے ہاتھ میں تھے، نماز، روزہ وغیرہ کے احکام بتانے کے علاوہ علماء ہی ان کے قدمے فیصل کرتے تھے، علماء ہی جرائم پر حد و تعزیر کی سزا دیتے تھے، علماء ہی قتل و قصاص کے

---

[1] روداد سال دوم ص ۴۰

احکام صادر کرتے تھے، غرض قوم کی دین و دنیا دونوں کی عنانِ اختیار علماء کے ہاتھ میں تھی، اب جب کہ انقلابِ حکومت ہوگیا اور دنیوی معاملات کے فیصلے گورنمنٹ کے اختیار میں آگئے تو ہم کو دیکھنا چاہئے کہ قوم سے علماء کا کیا تعلق باقی ہے یعنی گورنمنٹ نے کس قدر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں، اور کس قدر باقی ہیں، علماء کی عزلت نشینی بلکہ بے پروائی نے عام طور پر یقین دلا دیا ہے کہ ان کو جو تعلق قوم سے باقی رہ گیا ہے وہ صرف مذہبی تعلق ہے، یعنی یہ کہ صرف نماز، روزہ وغیرہ کے مسائل بتا دیا کریں، باقی معاملات میں دست اندازی کا انھیں کوئی حق حاصل نہیں، الحاد و دہریت کی طرف جو میلان عام ہوتا جاتا ہے، اس کا روکنا گورنمنٹ کو ممکن ہو تو ہو زیادہ نہیں تو مذہب عیسوی کو تو اس سے محفوظ رکھ سکتی ہے لیکن ہمارے علماء معقول طریقے پر اس کو روکنا چاہیں تو اس طرح قلع قمع کر سکتے ہیں، جس طرح یونانی فلسفہ کے پھیلنے کے وقت امام غزالیؒ، قاضی عضدالدین، ابن رشد نے زندقہ و الحاد کا استیصال کر دیا تھا۔[1]

مولانا شبلی نعمانیؒ کا یہ مضمون سوا گھنٹے میں ختم ہوا، نو بج چکے تھے، جمعہ کا دن تھا، اس لئے جلسہ ختم کیا گیا۔

کارروائی نشست دوم

اس نشست کا وقت ۵ بجے سہ پہر سے ۹ بجے شب تک مقرر کیا گیا تھا، نماز جمعہ مولانا شاہ امانت اللہ فصیحی غازی پوری نے پڑھائی، ۵ بجے وقتِ متعین پر کثیر مجمع جمع ہوا، اولاً مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اپنے مخصوص انداز میں خطاب فرما کر سامعین پر رقت بھی طاری کر دی اور ان میں جوش و ولولہ بھی بھر دیا، انھوں نے اپنی تقریر میں اس طرف بھی توجہ دلائی کہ:۔

---

[1] مضامین اربعہ۔

"ندوہ نے جس عظیم الشان کام کی بنیاد ڈالی ہے، اس کی کامیابی ہنسی کھیل نہیں، دو چار روز کا کام نہیں، کوئی بڑا کام خیال کے ساتھ ہی نہیں ہو جاتا، بلکہ ہم کو ہمت بلند اور استقلال دیرپا کے ساتھ نہایت کوشش اور سعی بلیغ کرنی چاہیئے، انشاء اللہ ایک روز ندوہ کو کامیاب دیکھیں گے۔"

مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے علاوہ مولانا شاہ امانت اللہ فصیحی غازی پوری، مولانا محمد عبداللہ انصاری اور مولوی یعقوب علی صاحب نے بھی تقریریں کیں۔

دارالافتاء کا قیام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "ایک ایسا زمانہ آئے گا، جب علم دنیا سے اُٹھ جائے گا، اور سیادت جاہلوں کے ہاتھ میں آجائے گی، وہ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے" کچھ اس قسم کے حالات اس زمانے میں بھی تھے، جیسے ذرا شُدبُد ہو جاتی تھی، وہ اپنے کو فتویٰ کا اہل سمجھنے لگتا تھا، اور جبہ و دستار پہن کر مخلوق کو اپنے دام تزویر میں گرفتار کرنے لگتا تھا، یہ دراصل دین کے نام پر ایک کاروبار تھا، یہ لوگ اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کی تکفیر و تفسیق کرتے، نتیجہ یہ تھا کہ ملت کی زبوں حالی بڑھتی جاتی تھی، اور خانہ جنگی جگ ہنسائی کا باعث تھی، اس کے علاوہ زمانہ کے تغیر کی وجہ سے جو نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے، اور جن کا ذکر کتابوں میں صراحت کے ساتھ نہیں ان کے احکام پر غور و تحقیق کے لئے بھی علم دین میں رسوخ کے ساتھ نئے حالات و تغیر کا باریک بینی سے مطالعہ ایک مفتی کے لئے ضروری تھا، غرض ایک عرصہ سے ایسے دارالافتاء کے قیام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، جہاں مخلص و لائق علماء و فقہاء افتاء کے فرائض انجام دیں اور عوام ان سے بسہولت رجوع کر سکیں، ندوۃ العلماء نے اپنے

اس دوسرے اجلاس میں اسے مقصد قرار دیا چنانچہ اجلاس لکھنؤ کی تیسری نشست میں جو ۱۳ر اپریل ۱۸۹۵ء مطابق ۱۷ر شوال ۱۳۱۲ھ کی صبح ہوئی، ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ نے دارالافتاء کی تجویز پیش کی، مولانا کو اس مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی، انھوں نے پوری قوت کے ساتھ یہ تجویز پیش کی، مولانا عبدالحق صاحب حقانی اور مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے تائید میں تقریریں بھی کیں، لیکن بعض حضرات نے اس کی فوری منظوری سے اتفاق نہیں کیا، بالآخر یہ تجویز ایک خصوصی جلسہ کے لئے ملتوی ہوگئی، محرم ۱۳۱۳ھ میں ایک خصوصی جلسہ میں مولانا محمد علی مونگیریؒ نے بہت تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی، اور خاصے مباحثے کے بعد یہ تجویز منظور ہوئی۔

اس کے بعد مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے اپنا لکھا ہوا خطبہ بیان کیا، جس میں انھوں نے اسلام کی ترقی اور تنزل کا بڑا مؤثر نقشہ کھینچا، سامعین ان کی خطابت سے بہت محظوظ و متاثر ہوئے پھر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے اپنا تحریری مضمون پڑھا، بعدہٗ مولانا ابراہیم صاحب آروی نے بڑے جوش و درد کے ساتھ ایک گھنٹہ تقریر کی، اس تقریر میں انھوں نے خلوص و دردمندی کے ساتھ اتحاد و اتفاق کی ضرورت پر زور دیا ان کی تقریر سے لوگوں کے دل دہل گئے، اور آنکھیں اشکبار ہوگئیں، اس نشست میں مولانا محمد یونس خاں صاحب نے عربی قصیدہ اور جناب ابوالقاسم فضل رب عرشی سنائی، شاعر خاص حضور نظام والیٔ حیدرآباد نے اپنی فارسی مثنوی ایرانی لہجے میں پڑھی، جس میں ندوۃ العلماء کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

انجمن ندوہ کہ نامش شدہ	رحمتِ حق حامی کامش شدہ
رومی و بومی ہمہ گشتند جمع	صورت پروانہ حوالی شمع
کار مریضان بہ مسیحا رسید	سلسلۂ قطرہ بدریا رسید
ندوہ طبیب است و مریض است قوم	بود برد عہد اگر بست قوم

پیروی انجمن ندوہ بہ کن فرق بنہ ہرچہ بگوید سخن

اسی دن سہ پہر کی نشست میں نصاب تعلیم کے مسئلہ پر کافی غور وخوض کے بعد ایک خاص کمیٹی بنائی گئی، جو مسئلۂ نصاب کے ہر پہلو پر غور کر کے اپنی سفارشات پیش کرے، اس کمیٹی میں مولانا شبلی نعمانی پروفیسر علی گڑھ کالج، مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ مدرسۂ عالیہ رامپور، مولانا حافظ عبداللہ صاحب مدرس اول مدرسۂ احمدیہ آرہ، مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی، مولانا حافظ عبدالقادر صاحب، مولانا منصور علی خاں صاحب، مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی مولانا عبدالوہاب صاحب، مولانا عبدالجبار صاحب، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، مولانا عبدالوہاب صاحب مدرس آرہ، مولانا فضل حق صاحب رامپوری، مولانا نور محمد صاحب، مولانا افہام اللہ صاحب، مولانا نور محمد صاحب وغیرہ حضرات تھے۔

مسلم ہندوستان میں عرصۂ دراز کے بعد یہ مجلس ایک ایسے مسئلہ پر غور اور لائحۂ عمل طے کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی جس سے بڑے دوررس اثرات اور اہم نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

اس کمیٹی کا جلسہ اسی دن بعد مغرب ہوا، اور کمیٹی کے ارکان نے متفقہ طور پر موجودہ نصاب میں دیگر علوم کے اضافے کی ضرورت کو تسلیم کیا، نصاب درس میں علوم جدیدہ کے اضافہ سے بعض علماء نے اختلاف کیا لیکن کثرت آراء سے اصلاح نصاب کی تجویز منظور ہوئی، اور یہ بھی بالاتفاق طے پایا کہ مجوزہ نصاب کی مدت تعلیم دو برس ہو، اگرچہ یہ نصاب چند خامیوں کے باعث کسی قدر ناقص تھا تاہم اصلاح وترقی کی طرف پہلا قدم تھا، اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت بعض دشواریاں بھی ایسی تھیں جو ہر حیثیت سے مکمل نصاب تجویز کرنے سے مانع تھیں۔

پانچویں نشست

۱۸ شوال ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۸۹۵ء صبح چھ بجے اس نشست کی کارروائی کا آغاز ہوا، اس نشست کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ مولانا عبداللہ صاحب انصاری نے تمام حاضرین بالخصوص جناب صدر جلسہ سے خطاب کرکے یہ خوشخبری سنائی کہ مولانا شاہ آنت اللہ فصیحی غازیپوری اور مولانا ابراہیم صاحب آروی میں جو مدت دراز سے سخت نزاع ہو رہی تھی، وہ ندوے کی برکت سے رفع ہو گئی، دونوں حضرات میں نہایت جوش و خروش سے ملاپ ہوا، اور ان دونوں نے اعلان کیا کہ آج ہم دونوں میں اتحاد ہو گیا، ہم دونوں مل کر قوم کی حالت پر بہت روئے اور یہ قرار پایا کہ ہم اپنے معاملات ندوہ کے سپرد کریں، رفع نزاع باہمی کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء کی یہ پہلی کامیابی تھی، اور پہلا ثمرہ تھا، جو نمایاں صورت میں ظاہر ہوا، لوگوں نے یہ بات محسوس کی کہ موجودہ اختلافات کو ختم کرنے اور علماء میں صحیح شعور پیدا کرنے کے لئے ندوۃ العلماء مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے۔

اس کے بعد صدر جلسہ مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث نے عالمانہ تقریر فرمائی اور آخر میں کہا:۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جب ہماری قوم کی ذلت اپنے حد کمال کو پہونچ گئی تو اب ایسے آثار پائے جاتے ہیں کہ شاید یہ کمال ذلت بھی زوال کا منہ دیکھے اور اس ذلت کا زمانہ بھی آخر ہو، بڑی دلیل اس پر یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالےٰ نے ندوۃ العلماء قائم کرنے کا خیال اور ارادہ اپنے بعض بندوں کے دل و دماغ میں مرکوز کر دیا، اس نیک ارادے کا منشاء یہی ہے کہ عہد سابق کا مرا ہوا اتفاق پھر زندہ ہو۔

اور وہ پردے بیچ سے اٹھ جائیں، جنھوں نے ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا ہے، باہمی اتفاق سے دلوں کی جمعیت اور جمعیت سے اسلام کو قوت ہو، ہمارے مسلمان بھائی خصوصاً علماء، صلحاء اور سادات کو چاہیئے کہ ندوۃ العلماء میں حاضر ہونے کو ضروری سمجھیں[1]"

باہمی اختلاف و رنجش اور ایک دوسرے پر سبّ و شتم کے ماحول میں ندوۃ العلماء کی دعوتِ اتحادِ بین المسلمین نے اتفاق و محبت کی عام فضا پیدا کر دی، لوگوں میں باہمی اخوت کا ایسا جذبہ پیدا ہوا اور اس کی اہمیت کا اس شدت سے احساس ہوا کہ اس احساس و جذبہ کو عام کرنے کے لئے مختلف تدبیریں ہونے لگیں، اس نشست میں باضابطہ مولانا شبلی نعمانی نے خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب کی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ جو صاحب "علماء اور عام مسلمانوں کے باہمی تعلقات بحیثیت دینی کیا ہونے چاہئیں" اس عنوان پر مضمون لکھیں اور مجلس ندوۃ العلماء اسے پسند کرے تو ان کی خدمت میں مبلغ سو روپے بطور ہدیہ پیش کئے جائیں گے[2]، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اس تجویز کی پُرزور تائید کی، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے ایک ایسی پراثر تقریر کی کہ حاضرین کا دل دہل گیا، مولانا حافظ محی الدین صوفی وکیل انجمن حمایت اسلام لاہور نے نااتفاقی کے نقصانات ظاہر کر کے علماء کو اس طرف خاص طور پر متوجہ کیا کہ وہ اپنے مجالسِ وعظ میں اتحاد و اتفاق پر زور دیں، صوفی صاحب کی تقریر کے بعد وہ سپاسنامے پیش ہوئے جو مختلف انجمنوں کی طرف سے آئے تھے، اس میں انجمن حمایت اسلام کا بھی سپاسنامہ تھا، جس میں ندوہ کی بھرپور تائید کی گئی تھی، اس کے بعد ان اکیس[21] مدارس کی فہرست پیش کی گئی جنھوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کی

---

[1] روداد دوم اجلاس ندوۃ العلماء [2] روداد سال دوم ص ۹۳

یا اس کی ماتحتی قبول کی۔

قانونِ حجاج

ندوۃ العلماء نے روزِ اول سے مسلمانوں کے ان اجتماعی معاملات میں بھی رہنمائی کی جن کا تعلق مسلمانوں کی دینی، ملّی یا تہذیبی امتیاز و خصوصیت سے تھا، اور ان امور کی نشاندہی کی جن سے شریعت اسلامی میں مداخلت کا خطرہ ہوتا، اس سلسلہ میں رائے عامہ کو ہموار، اور بوقت ضرورت حکومت کو ان امور کی طرف مؤثر انداز میں ندوۃ العلماء متوجہ کرتا رہا، اس جلسے میں مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی دہلوی نے یہ تجویز پیش کی کہ جو قانونِ حجاج گورنمنٹ کے زیرِ تجویز ہے، وہ مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں خلل ڈالنے والا ہے، لہٰذا ندوہ درخواست کرے کہ ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے، جس سے مسلمانوں کو مذہبی دست اندازی کا خیال ہو، یہ تجویز جلسۂ انتظامیہ اور بعد کو جلسۂ عام میں بھی منظور کی گئی۔

اس نشست میں خان بہادر منشی اظہر علی صاحب وکیل نے ندوہ کے لئے فراہمیٔ سرمایہ کی تجویز پیش کرتے ہوئے ایک مؤثر تقریر کی جس کی تائید مولانا محمد یونس خاں صاحب نے کی اور اپنی تقریر کے آخر میں پیش کش کی کہ:۔

بھائیو! میں کچھ نہیں مانگتا، بلکہ میں خود دس سو روپے ندوۃ العلماء کی نذر کرتا ہوں"

اس تجویز کا مقصد عمومی چندہ نہ تھا، مگر مولانا یونس خاں صاحب اور چودھری محمد عظیم صاحب کی پیش قدمی نے ہمدردانِ قوم کو حرکت دے دی، اور ایک گھنٹے کے اندر ایک ہزار سے زائد چندہ جمع ہوگیا، اجلاس لکھنؤ میں راجہ تصدق رسول خاں صاحب تعلقدار جہانگیر آباد نے مبلغ دو سو روپے یکمشت عطا کئے، اور وعدہ فرمایا کہ میری طرف سے دو سو روپے سالانہ لکھ لیا جائے

راجہ صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے ندوہ کو دو سو روپے دوامی دینے کا وعدہ کیا تھا۔

شعراء کا نذرانۂ عقیدت

اس نشست میں عزیز لکھنوی کا فارسی قصیدہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے پڑھ کر سنایا، قصیدہ کے آخر میں ندوہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

یارب ایں ندوہ وایں نادی وایں بادی باد
شاد تا یوم تناد ایمن از ارباب عناد

دستور العمل کی منظوری

اجلاس ششم میں دستور العمل ندوۃ العلماء پیش ہوا، جسے مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی نے پڑھ کر سنایا، اور باتفاق آراء منظور ہوا، اس اجلاس میں ۳۴ افراد پر مشتمل ایک نئی مجلس انتظامی کی تشکیل بھی کی گئی، ندوۃ العلماء کے دستور العمل کی منظوری کے بعد اس پہلی مجلس انتظامی کے لائق ذکر ارکان حسب ذیل ہیں :۔

مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء، مولانا حافظ شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی، مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حکیم سید ظہور الاسلام فتحپوری، مولانا عبد الغنی صاحب، مولانا عبد اللہ انصاری صاحب (داماد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، مولانا محمد یونس صاحب، مولانا مشتاق علی صاحب فیض آبادی، مولانا فتح محمد نائب لکھنوی، مولانا محمد ابراہیم آروی، مولانا امانت اللہ فصیحی غازیپوری، مولانا حفیظ اللہ صاحب، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب ابن مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا

عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی، مولانا مسیح الزماں صاحب شاہجہانپوری، منشی اطہر علی صاحب اور چودھری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات اراکین اعزازی نامزد ہوئے:۔

مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی، مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی، شمس العلماء مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی، مولانا محمد انوار اللہ خاں صاحب استاذ نظام دکن، مولانا محمد عادل صاحب جانشین مولانا شاہ سلامت اللہ صاحب، مولانا محمد شاہ محدث رامپوری۔

جلسہ کے میزبان منشی اطہر علی صاحب کے شکریہ اور ندوۃ العلماء کی دعائے ترقی پر جلسہ بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

۱۸ شوال کو اجلاس ختم ہوا، اور ۱۹ کی صبح کو فرنگی محل میں مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب جانشین شاہ محمد عبدالرزاق صاحب نے تمام علماء کی پرتکلف دعوت کی اور اس مکان میں کھانا کھلایا جہاں استاذ الاساتذہ حضرت ملا نظام الدین صاحبؒ نشست فرماتے تھے، شام کو مولانا محمد نعیم صاحب کے یہاں تمام علماء مدعو ہوئے۔

آواز پھیل رہی تھی

تحریک ندوۃ العلماء کو قلیل مدت میں ہمہ گیر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

"۱۸۵۷ء کے بعد (ہمارے علم میں) کسی تحریک کو دینی و علمی حلقوں میں ایسی مقبولیت اور مسلمانوں کے مختلف سنجیدہ طبقوں کا ایسا اعتماد حاصل نہیں ہوا تھا، جیسا کہ ندوہ کی تحریک کو حاصل ہوا، روحانی اور اخلاقی طور پر اس کو اپنے عہد کی دو عظیم ترین دینی اور روحانی شخصیتوں حضرت مولانا فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی (جنھوں نے اس کے حق میں

کلمۂ خیر فرمایا تھا، اور اس کی کامیابی اور فروغ کے لئے دعا کی تھی) اور حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (جنھوں نے اس کو تائید الٰہی، اور لطیفۂ غیبی سے تعبیر فرمایا تھا) کی تائید و تصدیق اور ایک طرح کی روحانی سرپرستی کا شرف حاصل تھا، دوسری طرف قدیم علماء میں استاذ العلماء حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کی حمایت و تائید جنھوں نے اس کے متعدد اجلاسوں کی صدارت فرمائی، نیز مولانا محمد حسین الہ آبادی، مولانا ابو محمد عبد الحق حقانی، مولانا محمد ابراہیم آروی جیسے نامور علماء اس کے سرگرم ارکان میں تھے اسی کے ساتھ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی جیسا سحر انگیز مقرر اور شیوہ بیان واعظ (جن کے بغیر علی گڑھ تحریک کی گاڑی بھی نہیں چلتی تھی) اور جن سے نواب محسن الملک کو بھی استغنا نہ تھا، اس کی زبان و ترجمان تھا، اس کے بالمقابل شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی جیسا صاحب قلم اور صاحب فکر اور قدیم و جدید کا مبصر اس کے پرجوش داعیوں اور حامیوں میں تھا، دینی اور دنیاوی وجاہت اور علمی و عملی صلاحیت رکھنے والوں میں متعدد نمایاں شخصیتیں اس کے کاموں میں دل و جان سے شریک تھیں، ایک مولانا مسیح الزماں خاں صاحب شاہجہانپوری استاذ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں نظام دکن، دوسرے مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی رئیس بھیکن پور علی گڑھ جو بعد میں نواب صدر یار جنگ کے لقب اور صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدر آباد کے منصب سے روشناس اور نامور ہوئے، تیسرے خان بہادر منشی اطہر علی صاحب وکیل و مشیر قانونی انجمن تعلقدارانِ اودھ۔

اس وقت مختلف اسلامی اور قومی انجمنوں سے تائیدی تجویزیں اور ریزولیشن آرہے تھے، مختلف اضلاع سے سپاسنامے پیش کئے گئے تھے، ملک کے طول و عرض سے ندوۃ العلماء کے سوالنامے اور استفسار پر تائیدی جوابات اور پرجوش تحسین کے پیغامات

وصول ہوئے تھے، ایک طرف قدیم تعلیمی اور دینی حلقے اور نامور اساتذہ اور علماء کی طرف سے تائید کا اعلان ہوا تھا، دوسری طرف علی گڑھ کے جدید تعلیمی حلقہ میں جس کے صدر نشین نواب محسن الملک اور آنریبل جسٹس سید محمود تھے، اس تحریک کا خیر مقدم کیا گیا تھا، اور اس کو مسلمانانِ ہند کے حق میں فالِ نیک اور قدیم و جدید حلقے کے درمیان ذریعۂ وصل و قرب قرار دیا گیا تھا، جگہ جگہ سے وفود آنے اور ندوۃ العلماء کا تعارف کرانے کی دعوت دی گئی تھی[1]

ندوۃ العلماء کے قیام کے دو سال کے اندر نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر و شام میں بھی ندوہ کا خاصا تعارف ہو گیا تھا، عرب علماء اور دانشور اس کے مقاصد و تخیل سے اتفاق کا اظہار کر رہے تھے، مصری اخبارات میں بھی اس کی تائید میں متعدد مضامین شائع ہوئے، "المؤید" اور "الرفیق" نے اس کی پرزور حمایت کی، اصلاحِ نصاب اور علوم جدیدہ کا اضافہ یہ وہ تجویزیں تھیں، جن کی وجہ سے عالم عربی کے علماء کو ندوہ سے غیر معمولی دلچسپی ہو گئی تھی۔

ندوۃ العلماء کے جلسۂ سوم منعقدہ بانس بریلی کے روداد میں مولانا محمد علی مونگیریؒ لکھتے ہیں "سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کی شہرت نے قلیل عرصہ میں صرف ہندوستان ہی کو مسخر نہیں کیا بلکہ اس نے عرب، مصر و شام سے بھی اپنے حسنِ قبول کی سند حاصل کی ہے، وہاں کے علماء نے یہاں کے علماء سے زیادہ دلچسپی ظاہر فرمائی اور بلا تامل اس کے اغراض و مقاصد کو تسلیم فرمایا ہے، پہلے پہل ہم کو مصری اخباروں میں اس کے تائیدی مضامین دیکھ کر حیرت ہوئی، باوجودیکہ اس کے اسباب اشاعت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی لیکن اس کی عالمگیر شہرت نے خود ہی ایک عالم کو اپنا فریفتہ بنا لیا، حقیقت یہ ہے کہ جو کام خالصاً لوجہ اللہ نیک نیتی کی راہ سے شروع کیا جاتا ہے، اس کے واسطے کسی معرّف کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ سچائی اور

---

[1] حیات عبدالحی ص ۱۳۷، ۱۳۸

سادگی عام طور پر طبیعتوں میں جم جاتی ہے اور دلوں میں گھر کر لیتی ہے[1]"

کسی شخصیت یا تحریک کے دور عروج و اقبال اور مقبولیت و محبوبیت کے زمانہ میں بھی چند لوگ اس کے ناقد اور بدخواہ ہوتے ہیں، تحریک ندوۃ العلماء کو بھی اس طرح کے نارواسلوک اور مخالفت سے گزرنا پڑا، اس مخالفت کے اسباب پر آئندہ روشنی ڈالی جائے گی، البتہ وہ معترضین جنھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ "دو سال ہوئے ندوہ نے اب تک کیا کر کے دکھایا ہے" ان نکتہ چینیوں کو مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء نے حسب ذیل جواب دیا:۔

"ابھی سے ہمارے سادہ مزاج بھائیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ دو برس گزر جانے پر بھی ندوہ نے اب تک کیا کیا؟ لیکن افسوس ہے کہ ایسا کہنے والوں نے خود کبھی کوئی کام نہیں کیا، اس کی قدر وہی جانتے ہیں، جنھوں نے دنیا میں رہ کر کبھی کوئی کام کیا ہے، کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ایسا لیجئے، جس کی طرف سے عموماً لوگوں کو کم توجہی ہو گئی ہے، اس کے از سر نو جاری کرنے کے وقت آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کیا کچھ دقتیں اور موانع پیش آتے ہیں، افسوس! انقلاب زمانہ سے جہاں ہم میں اور عیوب پیدا ہو گئے ہیں، ایک بڑا عیب (جو سب سے بڑھ کر ترقی کا سدّ راہ ہے) یہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہم جس کام کو مفید بھی تصور کر لیتے ہیں، غفلت اور کاہلی کی وجہ سے اس میں ہاتھ نہیں لگاتے اور اگر کوئی خدا کا بندہ اس کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کی اعانت کریں، اس کا پیر پھسل جائے تو خود آ کر سنبھال لیں، عیب چینی پر تل جاتے ہیں اور جس نے زیادہ صلاحیت سے کام لیا وہ دور سے کھڑے ہو کر نتیجے کا انتظار کرتا ہے[2]"

ندوۃ العلماء نے پورے ملک میں زندگی کی ایک لہر پیدا کر دی تھی، اور ہر طبقہ اور خیال کے لوگ اور مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں کا حیرت انگیز اتحاد اور روح پرور اجتماع

---

[1] روداد اجلاس سوم ص ۱-۲ [2] ایضاً ص ۵

اس تحریک کی کامیابی کا بیّن ثبوت تھا۔

تجاویز کو عملی جامہ

ندوۃ العلماء کے اجلاسوں کے منظور کردہ تجاویز عملی شکل اختیار کرتی جارہی تھیں اور کہیں بھی جمود و تعطل کا نام و نشان نہ تھا۔ یکم محرم ۱۳۱۲ھ کو جلسۂ انتظامیہ میں مولانا محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء نے دارالافتاء کے قیام کی ضرورت و اہمیت پر ایک مدلل اور پر اثر تقریر فرمائی، آپ نے کہا:

"ایک اور وقت ہمارے علماء کی یہ ہے کہ زمانہ کے حالات پر ان کی نظر نہیں، دنیا کے معاملات سے اکثر ناواقف، ان کی پیچیدگیوں کو سلجھانا دشوار، جب فقہاء تصریح کرتے ہیں کہ زمانہ بدل جانے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں تو ضروری ہوا کہ مفتی زمانہ کی حالت سے بھی واقف ہو، اور اس طرح جب تک معاملات سے واقف نہ ہوگا اور اس کی پیچیدگیوں پر مطلع نہ ہوگا تو صحیح کیونکر جواب دے گا، یہاں پر محکمۂ افتاء کی ضرورت دوسرے طور پر ثابت ہوتی ہے، کیونکہ بغیر اس کی خاص توجہ کے یہ مرحلہ طے نہ ہوگا، اور یہ ہماری حالت کے لحاظ سے غیر ممکن ہے، ہمارے علماء کو ادھر توجہ ہے نہیں کہ زمانہ کی حالت اور اس کی موجودہ اشیاء کو دریافت کریں، جب یہ حالت ہے تو انصاف کرنا چاہئے کہ دین کی حیثیت سے اس محکمہ کی کیسی ضرورت ہے[1]"

ندوۃ العلماء کی اس مسئلہ میں رہنمائی کی ضرورت اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:۔

"خاص و عام جانتے ہیں کہ یہ علماء کی انجمن ہے، اب بجز ان صاحبوں کے

---

[1] کارروائی جلسۂ انتظامی قلمی صـ۱۱

جو کسی خاص عالم سے خصوصیت رکھتے ہیں، تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ اس انجمن کی طرف ہے، جب کوئی ضرورت انھیں پیش آئے گی اور جب کوئی مسئلہ متعلق اعتقادیات یا عملیات دریافت کرنا ہوگا تو ضرور ندوہ سے سوال کریں گے"[1]

اس کے بعد مولانا نے گیارہ دفعات پر مشتمل محکمۂ افتاء کا خاکہ پیش کیا، منشی اظہر علی صاحب رئیس کاکوری نے بڑی دیر تک اور جوش کے ساتھ اس کی حمایت میں تقریر کی اور کہا کہ:-

"پیشتر میں اس کا مخالف تھا لیکن مولانا صاحب کی تقریر نے میرا خیال بدل دیا"

چنانچہ مجلس انتظامیہ نے دارالافتاء کے قیام کی منظوری دے دی اور مشروط طور پر ندوۃ العلماء کے ماتحت ایک دارالافتاء قائم کر دیا گیا، تاکہ عوام و خواص بوقت ضرورت رجوع کر سکیں۔

ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں یہ ایک انقلابی اور تعمیری منصوبہ تھا، مسلمانوں کے تمام مسائل شریعت اسلامی کی روشنی اور ہدایت میں حل کرنے اور برسر اقتدار طبقہ سے انھیں مؤثر طریقے سے منوانے کا اس سے بہتر کوئی منصوبہ نہیں ہو سکتا تھا، ندوۃ العلماء کے بانیوں خاص طور پر اس کے ناظم اول کی یہ گہری بصیرت تھی کہ انھوں نے اس تجویز کے پس منظر میں مستقبل کے حالات کو پڑھ لیا تھا، یہ تجویز اپنے جلو میں امارت شرعیہ اور دینی نظام کا ایک ایسا نقشہ رکھتی تھی کہ جس کی رنگ آمیزی کا احساس ہندوستان کے مسلمانوں میں عام ہوتا تو ان کے شخصی اور عائلی قوانین پر زد نہ پڑتی، ان کے مقدمات ان عدالتوں میں نہ جاتے جہاں انصاف گراں بھی ہے اور شریعت سے اس کا جوڑ بھی نہیں۔

---

[1] کارروائی جلسۂ انتظامی قلمی صـ

پانچواں باب

ایک نئے تجربہ گاہ کی ضرورت

تحریک ندوۃ العلماء اپنے دور کی عام اجتماعی سطح سے بلند تحریک تھی، اس کے بانی ارکان اور اولین داعیوں کی ذہنی سطح اپنے زمانہ کے بہت سے اہلِ علم و اہلِ فکر سے بلند تھی، یہ صفات و خصوصیات اپنے اندر ایک وزن اور اہمیت رکھتی تھیں، لیکن یہ بات اس تحریک اور اس کے مخلص داعیوں کے لئے ایک آزمائش بھی بن گئی۔

نصاب تعلیم اور طریقۂ تربیت میں تبدیلی کا مسئلہ اس دور میں تو اور بھی مشکل تھا، ندوۃ العلماء نے نصاب تعلیم کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی، اس ضرورت کا احساس پیدا کرنے میں ندوۃ العلماء کے کارکنوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن اس تمام تگ و دو کے بعد اندازہ ہوا کہ جب تک ندوۃ العلماء کے زیر انتظام کوئی نمونہ کا دار العلوم قائم نہ ہوگا، اس وقت تک نصاب تعلیم میں تبدیلی و اصلاح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، ندوۃ العلماء کے حقیقت پسند اور صاحب بصیرت بانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کے ذہن نے اسے سوچا اور یہ خیال ایک واضح خاکہ کی شکل میں ۱۲ محرم الحرام ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامی میں پیش ہوا، ندوۃ العلماء کے ماتحت اعلیٰ پیمانہ پر ایک دار العلوم کے قیام کی تجویز ہر رکن کے دل کی آواز تھی، لہٰذا یہ تجویز منظور ہوئی، اس کے بعد یہ خاکہ مسودۂ دار العلوم کے نام سے شائع کر کے ممتاز علماء، مشاہیر اور ماہرین تعلیم کو بھیجا گیا تاکہ ان کی آراء سے استفادہ

کیا جاسکے، طبقہ علماء کی خاصی تعداد نے اس تحریک و تجویز کی تائید کی، اور اسے ایک انقلابی اقدام سے تعبیر کیا، ندوۃ العلماء کے ماتحت ایک دارالعلوم کا قیام ہندوستان اور عالم اسلام کے سیکڑوں دینی مدارس میں درس و تدریس کے ایک نئے مرکز کا اضافہ نہ تھا، بلکہ مجوزہ دارالعلوم خاص مقاصد کے تحت قائم کیا جانا تھا، اس درسگاہ کی امتیازی خصوصیات اور اس دارالعلوم سے نکلنے والے علماء کی نمایاں صفات و خصوصیات مولانا محمد علی مونگیریؒ کے الفاظ میں :-

"سب سے مقدم یہ ہے کہ قوم میں ایسے علماء کی ایک جماعت موجود ہو جو علوم مذہبی میں اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتی ہو، خصوصاً علم کلام، اور علم فقہ میں اس کو ملکۂ تام حاصل ہو، تاکہ عبادات اور معاملات کے متعلق احکام اور فتاویٰ اس کے مستند اور واجب العمل سمجھے جائیں۔

۲۔ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات و واقعات سے بھی باخبر ہو، اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بسر کرتی ہے، اس کے اصول سلطنت کیا ہیں، مسلمانوں کی دنیاوی حالت کیا ہے؟ ان کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں، سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے؟

ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جاتا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں، ان کو دنیا کے حال سے بالکل خبر نہیں، اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابل التفات ہے، بے شبہ جو علماء دنیا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، اور کثرت عبادت اور ذکر و فکر کی وجہ سے انھیں اپنے زن و فرزند کے ضروریات کی طرف بھی توجہ نہیں، اصحاب صفہؓ سے ان کو تشبیہ دی جاسکتی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کل صحابہ کرامؓ، اصحاب صفہؓ نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے، بے شبہ اصحاب صفہ

کے مشابہ ایک گروہ ہمیشہ قوم میں موجود رہنا چاہئے لیکن اس کے ساتھ نہایت ضروری ہے کہ ایک جماعت کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت اور اطلاع، انتظام و تدبیر، حزم و مصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، عمرو بن العاصؓ، خالد بن ولیدؓ، اور ابو عبیدہؓ کے نقش قدم پر ہو۔

۳۔ ضروری ہے کہ قوم میں ایسے علماء کی بھی ایک جماعت موجود ہو، جو اور علوم و فنون مثلاً نحو و صرف، ادب و انشاء، منطق و فلسفہ وغیرہ میں ماہر اور استاذ ہو، کیونکہ ان علوم سے علاوہ اس کے کہ علوم مذہبی کو مدد پہونچتی ہے، اسلام کی علمی عظمت و شان پر بھی اثر پڑتا ہے۔

۴۔ ایک جماعت ایسے علماء کی موجود ہو جو دور و دراز ممالک کا سفر کرے جن ممالک میں اسلام کی حکومت ہے، وہاں کے مسلمانوں سے مل کر خیالات کا مبادلہ کرے، ترقی اسلام کی تدبیریں سوچے، وہاں کے مفید تجربوں کو اپنے ملک کے لئے دستور العمل بنائے، جہاں اسلام کی حکومت نہیں ہے، وہاں اسلام کی تبلیغ کرے، اسلام کی خوبیاں اور فوائد بیان کر کے لوگوں کو اسلام کی ترغیب دلائے۔

۵۔ چند علماء ایسے ہوں جو مسلمانوں کے قدیم عمدہ تصنیفات کے نشر و اشاعت کا کام اپنے ذمہ لیں، علمائے سلف نے مختلف علوم و فنون میں جو کتابیں ایسی لکھی ہیں، جن پر علمی حیثیت سے فخر کیا جا سکتا ہے، ان کے نسخے جہاں سے مل سکیں بہم پہونچائے جائیں، اور تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کئے جائیں۔

۶۔ چند علماء ایسے ہوں جو فن تقریر میں کمال رکھتے ہوں تاکہ ہر قسم کے مجالس میں ہر طرح کے مضامین پر خواہ دینی ہوں یا دنیوی، اخلاقی ہوں یا سیاسی، علمی ہوں یا خطابی، نہایت پر زور اور پر اثر تقریر کر سکیں، اس امر کی بڑی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ بے دینوں کا اثر جو ملک میں زیادہ پھیلتا جاتا ہے، اس کا روکنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہمارے علماء بھی ہر قسم کے مضامین پر

تقریر کر سکیں۔

۷۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اکثر اہل علم کو ایسا ہونا چاہئے کہ بعد فراغ آزادی سے گزر بسر کر سکیں اور حسب دستور زمانہ کسب معاش میں کسی کے محتاج نہ ہوں۔

۸۔ اب ہم کو غور کرنا چاہئے کہ جس قسم کی جماعتوں کا اوپر ذکر ہوا، اور جن کے بغیر آج کل اسلام اور اسلامی علوم کی ترقی اور استحکام ممکن نہیں، وہ کن اسباب و وسائل سے پیدا ہو سکتی ہے، بہت غور و فکر کے بعد جو رائے اس معاملہ میں قائم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب تک طلبہ کو ابتدائی زمانہ سے آخر تک ایک خاص طرح کی تربیت اور تعلیم نہ دی جائے، اس قسم کی جماعت پیدا نہیں ہو سکتی، اس لئے یہ قرار پایا کہ چند خاص اصول پر ایک عظیم الشان اسلامی مدرسہ قائم کیا جائے، یہ مدرسہ جن اصول اور جس قسم کی تربیت و انتظام پر قائم ہونا چاہئے وہ درج ذیل ہیں:۔

دار العلوم کے بنیادی اصول

دفعہ ۱۔ یہ مدرسہ کسی ایسے بڑے شہر میں قائم کیا جائے گا جو ممالک مغربی و شمالی اودھ میں وسط مقام پر واقع ہو، اور جس کو یہ خصوصیت حاصل ہو کہ وہ آج یا کسی زمانہ میں اسلامی علوم کا مرکز رہا ہو۔

دفعہ ۲۔ مکان مدرسہ شہر سے باہر ہوگا، اور اس کے لئے ایک وسیع ٹکڑا زمین کا لیا جائے گا، جس کی مقدار پانچ سو بیگھے سے کم نہ ہوگی۔

دفعہ ۳۔ یہ وسیع ٹکڑا چھوٹی سی پختہ چہار دیواری سے گھیرا جائے گا، اور اس کے احاطہ میں منفصلہ ذیل عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔

عمارتوں کی تفصیل

۱۔ مکانِ مدرسہ جس میں آٹھ دس بڑے بڑے کمرے ہوں گے، یعنی تفسیر کی تعلیم کا جدا کمرہ حدیث کی تعلیم کا جدا کمرہ، فقہ کی تعلیم کا علٰحدہ کمرہ وغیرہ۔

۲۔ طلبہ کے رہنے کے لئے خوش فضا اور موزوں حجرے، جن کی تعداد سَو سے کم نہ ہوگی۔

۳۔ چند علماء جو مدرسہ میں مدرس ہوں گے، ان کی سکونت کے لئے مکانات۔

۴۔ ان علماء اور صلحاء کے مکانات جو طلباء کے اتالیق اور نگران اور واعظ ہوں گے۔

۵۔ دارالاکل جس میں تمام طلباء اور علمائے مقیم مدرسہ یکجا جمع ہو کر کھانا کھائیں گے۔

۶۔ دارالمناظرہ، جس میں تمام طلباء مہینہ میں دو تین مرتبہ جمع ہو کر علمی و اخلاقی مضامین پر مناظرہ کریں گے۔

۷۔ ایک بہت بڑا وسیع کمرہ جس میں سالانہ امتحان اور تقسیم انعام کی مجلس ہوگی۔

۸۔ شفاخانہ، جس میں ایک طبیب یونانی موجود ہوگا، اور ہر قسم کی دوائیاں مہیا رہیں گی۔

۹۔ کتب خانہ، جس میں ہر قسم کی کتابیں مع فہرست موجود رہیں گی۔

۱۰۔ مسجد۔

طلبہ کا نظام تربیت

دفعہ ۴۔ ہر طالب علم کے لئے جدا کمرہ ہوگا اور بجز کسی خاص حالت کے دو طالب علم ایک حجرہ میں نہ رہیں گے، دفعۂ مذکورۂ بالا کی عمارتوں میں سے بجز مسجد کے ہر عمارت پر اس بزرگ اور فیاض شخص کا نام ہوگا، جس کے زرِ عطیہ سے وہ عمارت تعمیر ہوگی، ہم کو قوی امید ہے کہ

ہمارے ملک کے فیاض اور دیندار امراء اس قسم کی اسلامی عمارتوں کا اپنے نام سے موسوم ہونا ضرور پسند فرمائیں گے، اور اس کے لئے زرچندہ عطا کر کے دنیا میں اپنے بلند نامی اور اخروی میں اجر دائمی پائیں گے۔

دفعہ ۵۔ طالب علموں کو تاکید ہوگی کہ وہ اپنے حجروں کو صاف اور پاکیزہ رکھیں۔

دفعہ ۶۔ ہر طالب علم کے حجرے میں چٹائی کا فرش اور اس پر دری ہوگی، اور پلنگ اور ایک چھوٹی سی الماری بھی ہوگی۔

دفعہ ۷۔ صبح سے شام تک جو اشغال ہیں، مثلاً سو کر اٹھنا، نماز پڑھنا، مطالعہ کرنا، مدرسہ میں جانا، کھانا کھانا، مسنون ورزش کرنا سب کے لئے اوقات معین ہوں گے، اور تمام طالب علموں کو ان ہی معین اوقات میں یہ سب کام کرنا ہوں گے۔

دفعہ ۸۔ تمام طالب علموں کا ایک اسلامی لباس ہوگا، اور وہ خاص شرفائے عرب کے طور پر ہوگا۔

دفعہ ۹۔ تمام طلبہ عرب کے طریقہ پر کھانا کھائیں گے۔

دفعہ ۱۰۔ نماز عصر کے بعد طلباء مدرسہ کے احاطہ میں کسی قسم کی جسمانی ورزش مثلاً گھوڑے پر چڑھنا، بندوق لگانا، تیرنا وغیرہ سیکھیں گے۔

دفعہ ۱۱۔ مدرسہ کے رہنے والے طلباء میں سے جب کوئی بیمار ہوگا تو مدرسہ کے شفاخانہ میں اس کا علاج کیا جائے گا۔

دفعہ ۱۲۔ کسب حلال کے لئے بعض فنون صناعیہ بھی سکھائے جائیں گے، مگر اس کی تعیین طالب علم کے رجحان اور مناسبت پر موقوف ہوگی۔

شرائطِ داخلہ

دفعہ ۱۔ جو طالب علم مدرسہ میں داخل ہونا چاہے گا، اس سے مراتب ذیل دریافت کئے جائیں گے، نام اور پورا پتہ، سنہ اور سال کس جماعت میں داخل ہونا چاہتا ہے، کس قدر تحصیل کر چکا ہے، علوم کے ساتھ بعض صنائع کسب معاش کے واسطے سیکھنا چاہتا ہے یا نہیں، ناظم یعنی مہتمم مدرسہ ان تمام مراتب کو ایک کتاب میں جو اسی غرض سے تیار رہے گی درج کرے گا۔

دفعہ ۲۔ ناظم اس طالب علم کو مع ایک نقشہ کے جو اطلاعاتِ مذکورہ بالا پر مشتمل ہوگا، اس جماعت کے مدرس کے پاس جس میں وہ داخل ہونا چاہتا ہے بھیجدے گا، مدرس اس کا امتحان لے گا، اور اگر وہ اس جماعت میں پڑھنے کے قابل ثابت ہوگا، تو اس جماعت کے رجسٹر میں اس کا نام لکھ لیا جائے گا۔

دفعہ ۳۔ دولت مند طلباء سے داخلہ کے وقت چندۂ داخلہ لیا جائے گا جس کی تعداد عشر سے لے کر صد تک ہوگی۔

دفعہ ۴۔ مدرسہ میں اہل خیر کی فیاضی سے سرمایہ مہیا رہے گا جس سے غریب طالب علموں کی خوراک، پوشاک، سکونت وغیرہ کا انتظام کیا جائے گا۔

نظام تعلیم و تدریس

تین قسم کے طلباء ہوں گے:۔

۱۔ جو تمام علوم عربیہ مروجہ و مجوزہ میں تکمیل چاہیں گے۔

۲۔ جو صرف کسی خاص فن کی تحصیل کرنی چاہیں گے۔

۳۔ جو قدرِ مناسب کو حاصل کرکے دوسرا قصد رکھتے ہوں گے۔

۴۔ علوم درسیہ کے مدرس الگ الگ ہوں گے تاکہ ہر مدرس اپنے خاص فن میں زیادہ اہتمام اور توجہ کے ساتھ مصروف ہو سکے۔

تعلیم دو طریقے پر ہوگی:۔

۱۔ طریقۂ مروجہ کے موافق۔

۲۔ طریقۂ قدیم یعنی اسلامی طور پر جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ استاذ ایک بلند مقام پر بیٹھ کر زبانی اس مواد پر نہایت واضح دلائل کے ساتھ تقریر کرے گا، جو اس روز کا سبق ہوگا، یہ طریقہ حدیث و ادب وغیرہ میں مدتوں تک جاری تھا، ابو نصر فارابی نے ارسطو کی منطق جو اپنے استاد متی بن یونس سے پڑھی تھی، اس طریقہ کے موافق پڑھی تھی، اس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب علموں کا وقت کتاب کے لفظی مباحث میں ضائع نہیں ہوتا، اور استاد اپنی وسعتِ نظر اور معلومات اور ملکۂ تقریر پڑھانے پر مجبور رہتا ہے۔

نصاب

تینوں قسم کے طلباء کے لئے نصاب درس جدا جدا ہوگا، اس کے عام اصول یہ ہوں گے درجۂ اعلیٰ کے لئے تین قسم کی کتابیں ہر علم میں ہوں گی، ایک وہ جن میں صاف صاف نفسِ مسائل مذکور ہوں، دوسری وہ جن میں مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی نہایت واضح طور سے بیان ہوئے ہوں، تیسری وہ کتابیں جن کی عبارت مغلق اور پیچیدہ ہو تاکہ طالب علم کو وہ

فن بھی آجائے اور دقتِ نظر اور مشکل عبارت سمجھنے کی لیاقت بھی پیدا ہو۔

۲۔ سب سے مقدم فائدہ یہ ہوگا کہ قرآن مجید کے ساتھ زیادہ اعتنا ہوگی، تفسیروں کے علاوہ وہ کتابیں درسِ نصاب ہوں گی، جن میں عام طور پر علوم قرآن مجید سے بحث ہے، اور بالخصوص وہ جس سے قرآن مجید کا اعجاز ثابت ہوتا ہے، جیسے اعجاز القرآن باقلانی وغیرہ۔

۳۔ ادنیٰ درجہ میں خاص دینیات اور ادب کا لحاظ ہوگا۔

۴۔ فن ادب پر نہایت توجہ ہوگی، شعرائے جاہلی کے متعدد دیوان درس میں داخل ہوں گے، تاکہ قرآن مجید کے طرزِ بیان پر عمدہ طور پر واقفیت ہو۔

۵۔ تاریخ اسلام کے اس حصہ پر ضرور عبور کرایا جائے گا جس سے حضرت سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے اخلاق، علو ہمت، جذبۂ اسلامی اور مخلوق کے لئے خیر خواہی ثابت ہوتی ہے، جس سے قرآن مجید و احادیث کے بعض مقامات کی توضیح ہوتی ہے، اسی طرح علمائے کرام اور شاہانِ اسلام کے وہ حالات جن سے ان کی اولوالعزمیاں اور غیروں کے ساتھ ان کے اخلاق اور عمدہ برتاؤ کا لحاظ ہوتا ہے۔

۶۔ ممالک اسلامیہ کا جغرافیہ بھی اس قدر معلوم کرایا جائے گا جس سے وہ قرآن مجید اور احادیث کے مقامات کو بخوبی سمجھ سکیں، اور اس وقت کی اسلامی دنیا سے بھی واقف ہوں، بہ نسبت منطق و فلسفہ یہ دونوں علم (یعنی تاریخ و جغرافیہ) زیادہ ضروری ہیں۔

۷۔ منطق و فلسفہ میں جو کثرت سے کتابیں داخل ہو گئی ہیں، اور ملا نظام الدین کے زمانہ میں ان کا وجود بھی نہ تھا وہ گھٹا کر ادب اور دینیات کی کتابیں داخل کی جائیں۔

۸۔ علم کلام کی طرف زیادہ توجہ کی جائے گی تہافۃ الفلاسفہ، ابن رشد کی بعض تصانیف اور شرح مقاصد، شرح مواقف، اور شرح تجرید، درساً یا مطالعۃً داخل نصاب کی جائیں گی۔

۹۔ تہذیب نفس کے لئے علم اخلاق اور تصوف کی تعلیم دی جائے گی، مثلاً عوارف المعارف اور احیاء العلوم کا کچھ حصہ داخل درس کیا جائے گا۔

۱۰۔ اگر کسی فن کی مطلوبہ کتاب دستیاب نہ ہوگی تو تالیف کرائی جائے گی۔

۱۱۔ وقتاً فوقتاً عالم اسلام کے مدارس خصوصاً جامعۂ ازہر اور دار العلوم کا نصاب تعلیم منگوایا جائے گا، اور اس کے نمونہ پر نصاب درست کیا جائے گا۔

بحث و مباحثہ اور تقریر کی مشق

۱۔ تمام طلباء مہینے میں دو بار دار المباحثہ میں جمع ہو کر کسی علمی مضمون پر مباحثہ کریں گے، موضوع ایک ہفتہ پہلے ہی مقرر کر دیا جائے گا، مباحثہ کے وقت ایک مدرس موجود ہوگا تاکہ طلبہ کو قواعد مناظرہ کا پابند رکھے کسی کی تقریر میں درشتی اور خشونت نہ پیدا ہونے پائے اور کسی کے چہرے پر کسی طرح غصہ یا تکرار کا اثر نہ ہو۔

۲۔ طلبہ مہینے میں ایک بار عربی زبان میں مباحثہ کریں، یعنی مسئلہ متعینہ پر جو تقریریں کی جائیں عربی میں ہوں تاکہ عربی میں گفتگو اور بات چیت کرنے کی مشق پیدا ہو، آج کل علماء کا حال یہ ہے کہ کوئی عرب آجائے تو اس سے دس پانچ منٹ تک محاورۂ عربی میں بات چیت نہیں کر سکتے۔

۳۔ دار المطالعہ میں ہمیشہ ہر قسم کے عربی اخبارات منگوائے جائیں گے، اور تمام طلبہ پر پابندی ہوگی کہ ہر روز وقت معینہ پر ان اخبارات کا مطالعہ کریں تاکہ حال کے محاورات پر اطلاع ہو، اور ممالک اسلامی اور دیگر ممالک کے حالات و واقعات سے واقفیت ہو، اس واسطے کہ آج کل کے عربی خواں طلبہ جب کبھی کسی ملک کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں،

تو لوگوں کو ان کی غلط اور اجنبی باتوں پر تعجب ہوتا ہے، اور یہ ایک بڑی وجہ ہے کہ طلبہ اور علماء کی وقعت کم ہو گئی ہے۔

۴۔ طلبہ کو علاوہ وعظ اور مباحثے کے کسی علمی یا سیاسی یا تاریخی مضمون پر گھنٹہ دو گھنٹہ تقریر کرنا بھی سکھایا جائے گا۔

۵۔ تمام طلبہ کو انشاء پردازی کی مشق کرائی جائے گی، اور عمدہ عبارت لکھنے پر انعامات رکھے جائیں گے۔

وظائف

وظائف متعدد قسم کے ہوں گے:۔

۱۔ غریب طالب علموں کے لئے تاکہ مدرسہ میں ان کی خورد و نوش کا انتظام ہو سکے۔

۲۔ وظیفۂ لیاقت ان طلبہ کے لئے مخصوص ہو گا، جو اپنے درجہ میں سب سے اول یا دوم ہوں

۳۔ جو فیاض لوگ کسی قسم کا وظیفہ کسی مدت کے لئے مقرر کریں وہ ان کے نام سے موسوم ہوں گے۔

امتحانات

امتحان کے طریقہ پر نہایت غور اور کامل توجہ ہو گی:۔

۱۔ تمام سالانہ امتحانات خود دار العلوم کے مدرسین لیں گے، اور ہر ممتحن سے ایک تحریر لکھوائی جائے گی جس میں یہ عبارت ہو گی کہ "میں بہ قسم اقرار کرتا ہوں کہ میں امتحان میں کسی قسم کی رعایت ملحوظ نہ رکھوں گا" اس قسم کا اقرار لینا علماء کے لئے کوئی خلاف شان بات نہیں،

صحابہ بعض اوقات رواۃ صحابہ سے قسم لیتے تھے، تب ان کی روایت اور حدیث کا اعتبار کرتے تھے۔

۲۔ ممکن ہے کہ خود ناظم تعلیمات یا کوئی دوسرا مشہور عالم ممتحن قرار دیا جائے۔

۳۔ امتحاناتِ فضیلت کے ممتحن حتی الامکان، وہ علماء ہوں گے جو دارالعلوم میں مدرس نہیں ہیں۔

۴۔ طالب علموں کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ پرچے پر اپنا نام لکھیں، بلکہ صرف نمبر لکھ دیں۔

۵۔ ممتحن کے بنائے ہوئے پرچے ناظم کے پاس سربمہر آئیں گے، اور اسی طرح رکھے جائیں گے۔

۶۔ ممتحن کو مقدار مناسب کے ساتھ نقدی معاوضہ دیا جائے گا تاکہ وہ امتحان کو بیکاری کا کام نہ سمجھیں۔

۷۔ امتحان فضیلت کے پرچے طالب علموں کو عربی زبان میں لکھنے ہوں گے۔

۸۔ تحریری امتحان کے ساتھ تقریری امتحان بھی لیا جائے گا، نیز قوت مطالعہ کا بھی امتحان لیا جائے گا۔

۹۔ امتحاناتِ فضیلت کے بعد جب دستار فضیلت بندھوائی جائے گی، تو اس مجمع میں طالب علم کو کسی مسئلہ پر، جس کو علمائے حاضرین مجلس متعین کریں گے، زبانی تقریر کرنا ہوگی۔

۱۰۔ جو طلبہ کسی خاص فن فقہ، حدیث، تفسیر میں فضیلت کا امتحان دینا چاہیں تو ان کو اجازت ہوگی۔

۱۱۔ جو طالب علم امتحان میں کامیاب ہوگا، اس کو فقیہہ، محدث، مفسر یا متکلم کا خطاب دیا جائے گا، سند میں اس کی تصریح بھی کی جائے گی، اور ایک عبا بھی دی جائے گی۔

۱۲۔ ندوہ کوشش کرے گا کہ اگر ایسے کامیاب شدہ اصحاب کی کوئی سبیل معاش نہ ہو تو

گزارہ بھر کا وظیفہ اس وقت تک دے دیا جائے گا جب تک کوئی سبیل ان کی نہ ہو۔

مذکورہ بالا تجاویز کا مقصد

۱۔ سب سے مقدم یہ کہ علوم کی تعلیم اعلیٰ درجہ پر ہو اور لوگوں کو تکمیل فن کی طرف رہبری ہو۔

۲۔ ہمارے تعلیم یافتہ لڑکے ایسے مہذب اور پابند مذہب ہوں کہ دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکیں۔

۳۔ غیر قوموں کے علاوہ خود مسلمانوں میں بھی جو دن بہ دن علماء اور طلبہ کی وقعت کم ہوتی جاتی ہے، وہ دور ہو۔

۴۔ طلبہ میں دلیری، بلند ہمتی، عالی نظری اور فراخ حوصلگی پیدا ہو، جو بجز اس قسم کے دارالعلوم کے جس میں تمام باتیں نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوں حاصل نہیں ہو سکتی۔

۵۔ علوم دینیہ خصوصاً علم کلام میں کمال پیدا کیا جائے تاکہ الحاد اور دہریت کا مقابلہ پوری قوت کے ساتھ ہو سکے۔

بجٹ

اس قسم کے دارالعلوم قائم کرنے کے لئے کم و بیش دس لاکھ کا سرمایہ جمع ہونا ضروری ہے، اس قدر سرمایہ جمع ہونا کچھ دشوار نہیں، صرف قومی ہمدردی اور علم و دین کی ترقی کے لئے ہمت مردانہ درکار ہے۔

مسودۂ دارالعلوم اور تجاویز پر علماء اور اہل الرائے سے مشورہ

یہ مسودہ ۱۲ محرم الحرام ۱۳۱۳ھ کو ندوہ کی مجلس انتظامی میں پیش کیا گیا، مجلس نے یہ طے کیا کہ اسے چھپوا کر شائع کیا جائے، تاکہ علماء اور اہل الرائے کو رائے دینے کا موقع حاصل ہو، حسب تجویز مجلس اسے شائع کیا گیا، اس سلسلہ میں اسّی رائیں موصول ہوئیں، ۵۳ علمائے دین اور ۱۹ دیگر اہل علم نے اس مسودہ سے کامل اتفاق فرمایا، تین علماء اور پانچ دیگر اہل علم نے اختلاف کیا لیکن اس اختلاف کی نوعیت بنیادی نہیں تھی، بلکہ جزئی تھی، دارالعلوم کے قیام سے ان حضرات کو اختلاف نہیں بلکہ کسی نے ندوہ کے ماتحت قائم ہونے پر اشکال ظاہر کیا، کسی نے سرمایہ کی فراہمی کو ناممکن بتلایا، مسودہ دارالعلوم پر جو آراء جمع ہوئی تھیں، انھیں تجویز دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا، مسودۂ دارالعلوم کی منظوری کے بعد مجوزہ دارالعلوم کے نصاب کا مرحلہ تھا، ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ کو مولانا محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء نے مسودۂ نصاب عربی کے نام سے ندوۃ العلماء کی مجوزہ نصاب تعلیم کا خاکہ پیش کیا، اس رسالہ میں ہندوستان کے نصاب درس کے آغاز وارتقاء اور مختلف مراحل کا جائزہ لیتے ہوئے تغیر پذیر حالات کی روشنی میں ایک ایسا نصاب تجویز کیا گیا تھا، جو آج سے پچاسی سال قبل ایک انقلابی قدم اور فکر انگیز اقدام تھا، اس نصاب میں بیس علوم اور ان کی کتابوں کے ذکر کے ساتھ درج ذیل علوم کو شامل کیا گیا۔

(۱) تاریخ (۲) اصول لغت (۳) تجوید (۴) عروض (۵) اخلاق وتہذیب نفس (۶) اسرار احکام ندوۃ العلماء کی طرف سے پیش کردہ یہ پہلا نصاب تعلیم تھا جس میں اس کے

بانیوں کے فکر و تخیل کی جھلک نمایاں ہے، اور پامال راہ سے ہٹ کر اپنے اعلیٰ نصب العین اور منزل پر پہونچنے کے لئے نئی شاہراہ کی نشاندہی تھی، اس نصاب تعلیم میں جن علوم کا اضافہ کیا گیا تھا، اور جن کتابوں کو داخل نصاب کرنے کی سفارش کی گئی تھی، اس کی مفصل وجوہات اور ان کے موزوں تر ہونے کے مستحکم دلائل دیئے گئے تھے، مجوزہ نصاب تعلیم ۹ رجب ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں غور و بحث کے لئے پیش کیا گیا تھا، اور کئی نصاب سامنے آئے تھے، سہ روزہ بحث و گفتگو اور متعدد ترمیم اور اضافہ کے باوجود اس کی تکمیل نہ ہو سکی اور اس پر غور و فکر کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس منعقدہ لکھنؤ شوال ۱۳۱۲ھ سے اس کی تیسری اجلاس منعقدہ بریلی شوال ۱۳۱۳ھ کے درمیان مجلس انتظامی کے چار جلسے ہوئے، ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کے جلسہ میں مسودۂ دار العلوم پیش کیا گیا، ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامی میں ناظم ندوۃ العلماء کا مرتب کردہ نصاب تعلیم پیش کیا گیا، اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، ۱۷ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامی میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا، یہ تجویز منظور ہوئی کہ ایک سپاسنامہ مدار المہام مملکت آصفیہ حیدر آباد دکن کی خدمت میں ان کے سو روپے ماہوار عطیے کی بابت بھیجا جائے۔

مولانا حکیم عبدالحی صاحب کا بحیثیت مددگار ناظم تقرر

مجلس انتظامی کا چوتھا جلسہ ۸ رجب ۱۳۱۳ھ کو ہوا جس میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے اپنی علالت سے مجبور ہو کر استعفیٰ پیش کیا لیکن وہ نامنظور ہوا، اور اسی جلسہ میں مولانا حکیم سید عبدالحیؒ باتفاق آراء مددگار ناظم مقرر ہوئے، موصوف نے

اس خدمت کو بلا معاوضہ قبول کیا، ناظم ندوۃ العلماء مولانا مونگیریؒ، مولانا عبدالحی صاحب کی کارکردگی سے بہت خوش ہے اور انھوں نے اجلاس بریلی کے موقع پر اپنی رپورٹ میں ان کے کام کی بڑی تحسین کی اور ان کے بلا معاوضہ کارکردگی کو سراہا۔

ندوۃ العلماء کے عہدہ داران اور اراکین انتظامی کے متعیّن اوصاف

اس جلسہ میں ناظم ندوۃ العلماء نے یہ تحریک پیش کی کہ ناظم ندوۃ العلماء، صدر اور اراکین انتظامیہ کے اوصاف متعین کئے جائیں تاکہ انتخاب کے وقت بے عنوانی نہ ہو۔

حسب ذیل صفات قرار دی گئیں:۔

ناظم۔ عالم باعمل اور ندوہ کے کاموں میں بہت زیادہ توجہ کرنے والا ہو۔

صدر اجلاس۔ علمی فضیلت کے ساتھ "وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ" ہو۔

اراکین انتظامیہ دو قسم (۱) علماء (۲) غیر علماء

(الف) علماء۔ ندوہ کے عملاً ہمدرد ہوں اور اعمال ظاہری شریعت کے خلاف نہ ہوں۔

(ب) غیر علماء۔ جس کے رکن انتظامی ہونے سے عام مسلمانوں کی برہمی کا خوف نہ ہو اور ندوہ کا عملاً ہمدرد ہو۔

سادگی اور اسلاف کی پیروی

اسی مجلس میں یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ندوہ کی مہمانداری اسلاف کی طرح سادہ ہو، کیونکہ یہ امراء کی مجلس نہیں ہے بلکہ علماء اور فقراء کی تنظیم ہے، اراکین انتظامیہ کے

انتخاب اور نامزدگی کا ضابطہ طے ہوا، ناظم ندوۃ العلماء کی تحریک پر مالیاتی امور کے سلسلہ میں درج ذیل اراکین کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔

مالیات کمیٹی

۱۔ مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری خلف الرشید مولانا احمد علیؒ محدث۔

۲۔ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی۔

۳۔ مولوی یونس خاں صاحب رئیس تاولی۔

۴۔ منشی محمد اطہر علی صاحب۔

اس مجلس کے ناظم مولوی خلیل الرحمٰن صاحب منتخب ہوئے، چونکہ اہل تشیع نے اپنی اصلاح کا بار خود اپنے ذمہ لیا، اس واسطے یہ طے ہوا کہ ان کو جلسہ میں تجویز پیش کرنے اور رائے دینے اور تقریر کرنے کی تکلیف نہ دی جائے، یہ بھی طے پایا کہ مختلف مقامات پر جو حضرات ذی وجاہت اور بااثر ہوں اور ان کو ندوہ کے اغراض و مقاصد سے اتفاق اور اس کی اشاعت سے دلچسپی ہو تو ان کو معین الندوہ کا خطاب دیا جائے۔

وفود کی روانگی

ندوہ کے اغراض و مقاصد کی اشاعت مسلمانوں کے زوال کے اسباب کی تحقیق و تفتیش اور ان کو غیر شرعی مسرفانہ رسوم و رواج سے روکنے نیز مدارس کی نگرانی کے لئے مختلف مقامات پر وفود بھیجے جانے طے ہوئے، چنانچہ ۲۵ رجب ۱۳۱۳ھ کو علماء کی ایک جماعت ملک کے مختلف شہروں میں روانہ کی گئی، فتح پور، سوہ، رائے بریلی، بارہ بنکی، دربھنگہ وغیرہ مقامات پر

بڑے کامیاب جلسے ہوئے بعض مقامات پر لوگوں نے بے جا مصارف اور خلافِ شرع مراسم کے چھوڑ دینے کا تحریری وعدہ کیا۔

تحریک ندوۃ العلماء کی اس اصلاحی کوشش سے بڑا نفع ہوا، لوگوں نے تقریبات کی فضول خرچیوں سے توبہ کی، اپنے اپنے علاقہ کے دینی مدارس اور تعلیمی اداروں کی ترقی اور بقاء کا احساس ان میں پیدا ہوا، ان دوروں میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب، مولوی رحیم بخش صاحب، مولوی نور محمد صاحب، منشی اظہر علی صاحب، مولانا شاہ سلیمان پھلواری صاحب، مولوی سید مشتاق علی صاحب جیسے اہم اور ذمہ دار حضرات شریک ہوتے تھے، ندوۃ العلماء کے یہ وفود جن جن علاقوں سے گزرتے وہاں اتفاق و اتحاد، دینداری، مدارس کے قیام و ترقی، مساجد کی آبادی اور انفاق فی سبیل اللہ کا عام جذبہ پیدا ہو جاتا، یہ طریقۂ کار ندوۃ العلماء کے بالغ نظر اور ذہین بانی ارکان نے پچاسی سال قبل اپنایا تھا، اسی طریقۂ کار پر چل کر تبلیغی جماعت ایک عالمی تحریک بن گئی ہے، ناظم ندوۃ العلماء نے ان وفود کی افادیت کو اپنی رپورٹ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس قدر نفع مسلمانوں کو وفد سے پہونچ سکتا ہے، اور جس قدر اشاعت احکام اسلام کی وفد سے ہو سکتی ہے، وہ دوسرے طور پر نہیں ہو سکتی، کیونکہ ایک سال کے بعد کسی خاص مقام پر جلسۂ سالانہ کر لینے سے پوری کامیابی ندوہ کو نہیں ہو سکتی ہے، جب تک مختلف شہروں میں جا کر خود علماء وہاں کی حالت نہ دیکھیں اور مقامی خرابیوں سے مطلع ہو کر اس کی اصلاح نہ کریں، اس وقت تک مسلمانوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔"[1]

---

[1] روداد اجلاس سوم ص ۳۵-۳۶

بیرون ہند دعوت و تبلیغ

۱۲ شوال ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ ممالک غیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے منتخب انگریزی داں طلبہ کو وظائف دے کر عربی زبان اور دینیات کی تعلیم دی جائے اور مدت ان کو تبلیغ و دعوت کے لئے بیرونِ ممالک روانہ کرے، اس موقع پر مولانا شبلیؒ نے یہ تجویز پیش کی، ایک فارغ التحصیل طالب علم تکمیل کے لئے مصر بھیجا جائے، دونوں تجویزیں جلسۂ عام میں غور و خوض کے لئے ملتوی ہوگئیں۔

تیسرا اجلاس

تحریک ندوۃ العلماء جس کا روز اول ہی سے اہل علم اور صاحب دل بزرگوں نے استقبال کیا تھا، اس کا پہلا اجلاس کانپور جیسے مشہور شہر اور صنعتی مرکز میں ہوا، تو ملک کے گوشے گوشے سے علماء اور عوام نے اپنے تمام اختلافات کو بھلا کر اس کی دعوت پر لبیک کہا، ندوۃ العلماء کے اجلاس اول میں شرکت کرنے والوں نے اس اجلاس میں دیوبندی اور بریلوی، مقلد اور غیر مقلد، علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کو اس طرح باہم گلے ملتے اور شیر و شکر ہوتے دیکھا جیسے مدتوں کے بچھڑے ہوئے ملتے ہیں، ندوۃ العلماء کے دعوتِ اتحاد کی برکت اور اس کے اجلاسِ اول کی روح پرور یاد ابھی تازہ تھی کہ ندوۃ العلماء کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں نوابین اودھ کی شان و شوکت کی یادگار بارہ دری قیصر باغ" میں اپنی امتیازی شان کے ساتھ ہوا۔

لکھنؤ کے اجلاس کے بعد مختلف علاقے کے عوام و خواص کا اصرار رہا کہ آئندہ اجلاس ہمارے شہر میں منعقد ہو اور ہمیں ندوۃ العلماء کی خدمت و میزبانی کا شرف بخشا جائے، مجلس انتظامیہ نے ابتداءً کلکتہ میں اجلاس طے کیا، مگر بعض مصلحتوں کی بنا پر یہ اجلاس روہلکھنڈ کے مشہور شہر بریلی کی انجمن اسلامیہ کے صدر نشین مولوی سید اشفاق حسین صاحب

ڈپٹی کلکٹر پنشنر اور تحریک ندوہ کے پرجوش رکن حاجی شیخ قادر بخش صاحب اور مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری کی دعوت پر بہ اتفاق اراکین مجلس انتظامی بریلی میں منعقد ہوا۔

جو لوگ اس مرتبہ جلسہ کی شرکت سے بہرہ ور ہوئے تھے، اور انھوں نے گذشتہ جلسوں میں بھی شرکت کی تھی، انھوں نے اندازہ لگایا کہ اس جلسہ میں بہ نسبت سالِ گذشتہ دو پیوستہ کے دو چند لوگ تھے، اور عام طور پر مسلمانوں کا جذبۂ تعاون پہلے سے بڑھا ہوا تھا۔

نظم و انتظام

اجلاس کے نظم و انتظام کے لئے مختلف کمیٹیاں قائم کر دی گئیں تھیں۔

جماعت استقبال: اس جماعت کے کارکنوں کا کام یہ تھا کہ شب و روز ان خیموں میں رہیں جو مہمانوں کی آسائش کے لئے ریلوے اسٹیشن کے احاطہ میں نصب کئے گئے تھے، جہاں نو وارد مہمانوں کے لئے پانی کی صراحیاں، آبخورے، لوٹے، جانماز، فرش، پلنگ، کرسیاں وغیرہ سامانِ ضرورت سواری کے لئے گاڑیاں، باربرداری کے لئے قلی موجود رہتے تھے، اور جب ریل کے آنے کا وقت ہوتا تھا، اس وقت مہمانوں کے لینے کے لئے پلیٹ فارم پر جاتے تھے، دن کو پرتلے حمائل کرتے تھے، جن پر نہایت خوشخط ریشم کے کارچوب سے "خادم ندوۃ العلماء" کا لفظ لکھا گیا تھا، اور رات کو لالٹین ان کے ہاتھوں میں ہوتی تھی، جن کے آئینوں پر "ندوۃ العلماء" کا لفظ لکھا ہوا تھا، یہ لوگ مہمانوں کو بآرام تمام خیمے میں لاتے تھے، اور وہاں سے گاڑیوں پر سوار کر کے قیام گاہ تک پہونچا دیتے تھے۔

جماعت مدارات:۔ اس کی دو شاخیں تھیں، اول جماعت کا کام یہ تھا کہ ان مکانوں کو فرش، پلنگ، پانی وغیرہ ضرورت کی چیزوں سے آراستہ رکھیں اور جس وقت مہمان اسٹیشن سے آئیں، ان کو لے جاکر مکانوں میں ٹھہرائیں، دوسری جماعت کا کام یہ تھا کہ شب و روز میں کئی مرتبہ ہر شخص کی قیام گاہ پر جاکر حال دریافت کریں اور پانی وغیرہ یا جس چیز کی ضرورت ہو اس کو مہیا کریں۔

جماعت پخت طعام:۔ اس جماعت کا کام یہ تھا کہ وقت پر کھانا تیار کرکے اس جماعت کے سپرد کردے جو خورانید طعام کے لئے مقرر ہوئی تھی، خرید اجناس وظروف وغیرہ بھی اسی جماعت کی ذمہ داری میں کردی گئی تھی۔

جماعت خورانید طعام:۔ اس جماعت کا یہ کام تھا کہ سب مہمانوں کو اجتماعی طور پر ایک جگہ کھانا کھلائے اور جو صاحب کسی وجہ سے نہ آسکیں، ان کی قیام گاہ پر ان کا کھانا پہونچائیں۔

اہم شرکاء اجلاس

۲۶، ۲۷، ۲۸ شوال ۱۳۱۳ھ کے اس سہ روزہ اجلاس میں ان اہم حضرات نے شرکت فرمائی۔ مولانا لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد، مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی دہلوی، مولانا عبدالوہاب صاحب بہاری، مولانا محمد حبیب الرحمن صاحب شروانی، مولانا ابوالقاسم فضل رب صاحب، مولوی غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، مولانا شفقت اللہ صاحب بدایونی، شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی، مولانا حافظ عزیزالدین صاحب مرادآبادی، مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا عبداللہ انصاری، مولانا سید محمد شاہ محدث رامپوری،

خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل علی گڑھ۔

یہ تھے وہ حضرات جنھوں نے اس جلسہ میں دور دراز سفر کی زحمت گوارا کرکے شرکت کی تھی، مذکورہ بالا تمام لوگوں نے بالاتفاق کرسئ صدارت پہ جلوہ افروز ہونے کے لئے استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کا نام نامی پیش کیا عوام نے بھی اسے پسند کیا، اور علماء نے بخوشی سر تسلیم خم کیا۔

تقاریر صدر جلسہ و مندوبین اجلاس

مولانا محمد لطف اللہ صاحب صدر انجمن نے ایک مختصر و موزوں صدارتی تقریر فرمائی۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء کے زیر انتظام مجوزہ دارالعلوم کی ضرورت پر مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اور مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری نے تائیدی تقریریں کیں، مولانا عبدالحق صاحب حقانی نے حسرت سے فرمایا:۔

حضرات! اب روز بروز ہندوستان سے اسلامی علوم اٹھتے جاتے ہیں، سو، پچاس برس پہلے جو علماء تھے، ان کی نظیر اب نہیں ملتی، مولانا نظام الدین سہالوی، مولانا بحر العلوم شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ محمد اسحاق جیسے پھر مولانا فضل حق، مفتی صدرالدین جیسے اہل علم و فضل کہاں ہیں؟ اسلام کے یہ دُرِّ بے بہا جو اس وقت یہاں تشریف فرما ہیں، تھوڑے دنوں بعد یہ بھی نظر نہیں آئیں گے، غدر کے بعد تک کچھ متبرک صورتیں بقیۃ السلف رہ گئی تھیں، وہ بھی یکے بعد دیگرے صبح کے ستاروں کی طرح نظروں سے غائب ہوگئیں۔ ع

کیسی کیسی صورتیں آنکھوں سے پنہاں ہوگئیں

اللہ کا نام لے کر ایک دارالعلوم کی بنیاد ڈال دیجئے، جو اس زمانہ کے مسلمانوں کی یادگار باقی رہ جائے اور تاریخ میں ان کے نام نامی نیکی سے یاد کئے جائیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب متعدد مدارس اسلامیہ اکثر شہروں میں موجود ہیں تو اس دارالعلوم کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کسی کو انگریزی کا شوق ہو تو علی گڑھ کالج موجود ہے، جس پر مسلمانوں نے لاکھوں روپے صرف کیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کی تعلیم اس پرانے طریقے پر ہوتی ہے، جو آج کل رفتارِ زمانہ کے لحاظ سے قابلِ ترمیم ہے۔

درسِ نظامیہ اس وقت تک مناسب تھا، جب تک زمانہ نے پلٹا نہیں کھایا تھا، اس لئے اب ندوہ کو ایک نئے نصاب کی ضرورت پڑی، اس لئے ندوۃ العلماء چاہتا ہے کہ ایک ایسا دارالعلوم قائم کیا جائے، جس میں یہ سب نقائص دور ہوں، اور زمانۂ حال کی تعلیم اور علوم وفنون سے بقدر ضرورت واقفیت ہو۔"

مولانا شاہ محمد محدث رامپوری نے فرمایا:۔

"صاحبو! ہم میں پہلے بڑے بڑے علماء وفضلاء ہوا کرتے تھے، ہمارے شہر رامپور میں بڑے بڑے اہل کمال گذرے، یہ سب حضرات اپنی مدت حیات پوری کر کے چلے گئے "کبرنی موت الکبراء" ان کی جگہ ہم جیسے طالب علم عالم قرار پائے، اس لئے ندوۃ العلماء چاہتا ہے کہ ہم میں اگلوں کی طرح صاحب کمال پیدا ہوتے رہیں، ندوے کو فکر ہے کہ ہماری قوم میں سے علوم عالیہ جانے نہ پائیں، ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رکھا جائے کہ ہم مسلمانوں میں کون کون سے علوم باعث افتخار رہے ہیں، حدیث، فقہ، چاروں مذاہب کے اصول، فرائض، عقائد اور تصوف میں کمال، تاکہ علم صلاح اور تقویٰ کے ساتھ ہو، ایک بات گذشتہ زمانہ میں پیش آئی، بعض بدعقیدہ لوگوں نے ہمارے بزرگانِ دین کو علوم عقلیہ کے زور اور غرور پر اعتراضات

کا نشانہ بنایا تھا، تو ان کی مدافعت کی غرض سے علوم عقلیہ اور علم کلام کو ترقی دی گئی چنانچہ امام فخر الدین رازی اور حجۃ الاسلام امام غزالیؒ وغیرہ اس خدمت کو ادا کر گئے۔ اسی طرح دہریت اور نیچریت کے دفاع کے واسطے وہ علوم جو مخالف شرع نہ ہوں، ایک طبقہ نیک نیتی سے بطور فرض کفایہ حاصل کرے تاکہ علم دین کا پلہ ہمیشہ بھاری رہے۔"

مولانا غلام محمد صاحب ہوشیار پوری نے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"ندوۃ العلماء نے اب تک جو کام کئے ہیں وہ کوتاہ نظروں کے سامنے باوقعت نہ ہوں لیکن ذی فہم بزرگوں کی نگاہ میں قابل قدر اور مسلمانوں کے لئے فائدہ رساں ہیں۔ مسلمانوں کے علمی تنزل اور عملی و روحانی ادبار میں کسی شخص کو کلام نہیں ہے، اور اس صورت میں وہ ضرور اس بات کا خواہشمند ہوگا کہ ایک دار العلوم ایسا قائم کیا جائے جو مسلمانوں سے اس بلا کو دفع کرے ہم کو مسلمانوں کی فیاضیوں سے امید ہے کہ یہ دار العلوم ضرور اور جلد قائم ہوگا۔"

اس موقع پر مولانا شبلی نے پُر مغز اور مدلل تقریر میں ندوۃ العلماء کے مجوزہ دار العلوم کا نقشہ یوں پیش کیا:۔

"ندوۃ العلماء ایک مدرسہ جس کا نام دار العلوم ہوگا، قائم کرنا چاہتا ہے، اس پر عربی کے دوست اعتراض کریں گے کہ مدرسے کی بنیاد ڈالی کیا انوکھی بات کی ـــــ نئے تعلیم یافتہ کہیں گے کہ آج کل عربی کی کیا قدر ہے، وہ ہمارے کیا کام آسکتی ہے ـــــ اصل یہ ہے کہ دو باتیں ہیں جس سے یہ مدرسہ دیرپا یادگار ہو سکتا ہے:۔

۱۔ ظاہری شان و شوکت سے اس کا مکان نہایت شاندار اور مضبوط ہوگا، اور اس میں ہر کام کے لئے جدا جدا کمرے ہوں گے۔

۲۔ اس دار العلوم میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہوگا جس میں ہر طرح کی کتابیں موجود

ہوں گی، تاکہ جو طالب علم تکمیل کے بعد مطالعۂ کتب سے اپنی علمی لیاقت بڑھانا چاہے وہاں رہ کر کتب بینی سے اپنے علم کو بڑھا سکے۔

۳۔ ہم کو ایسے گروہ کی ضرورت ہے، جو ہمارے دین اور علم دین کو زندہ رکھے، بغیر پورے علمی کمال کے کسی عالم اور کسی علم کی قدر نہیں ہو سکتی، اس مدرسے میں ایک عالم کے سپرد ایک کام ہوگا جس میں اس کو شہرت عام حاصل ہو ــــ علمائے سلف کی یہ عادت تھی کہ وہ ایک ایک فن میں کمال حاصل کیا کرتے تھے، اور بقدر ضرورت اور علوم بھی جانتے تھے، اس وجہ سے ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے دار العلوم سے بھی ہر فن کے جدا جدا عالم نکلیں"۔

مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے موضوع گفتگو پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے دلچسپ انداز میں فرمایا:۔

"آج کل جس طرح یورپ سے عمدہ عمدہ ساز و سامان آرہے ہیں، اسی طرح اندرونی بیماریاں دہریت، نیچریت، الحاد وغیرہ بھی زوروں سے چلا آرہا ہے، اور مسلمانوں کی کم علمی کے باعث یہ بیماریاں ہندوستان میں روز افزوں ترقی پا رہی ہیں، ضرورت ہے کہ نئے تعلیم یافتوں کو دہریت و لادینیت کی طرف سے اب ضرور روکا جائے کیونکہ غیر مقلدیت اور شیعیت سے اس قدر اندیشہ نہیں ہے، جس قدر دہریت سے اندیشہ ہے، افسوس کہ ادھر سے دہریوں اور نیچریوں کے رسالے الحاد و زندقہ سے بھرے چلے آتے ہیں، اور ادھر سے معتزلہ جہمیہ کی رد کی کتابیں بھیجی جا رہی ہیں، یہ اس وجہ سے کہ اس کے علاوہ ہم کو کچھ معلوم نہیں، نہ ہم مخالفین کے علوم سے واقف، نہ ان کی تردید کا ہم کو سلیقہ، تو اب اس کا علاج کیا ہے؟ یہی دار العلوم قائم کرنا، اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ دار العلوم جب قائم ہو جائے گا تو انشاء اللہ دہریت اور لادینیت کو اسی طرح روکے گا جیسے ہمارے بزرگوں نے

فلسفۂ یونان کے سیلاب کو روکا تھا۔"

اس کے بعد ناظم صاحب ندوۃ العلماء کو سالانہ رپورٹ سنانی تھی لیکن ضعف وعلالت کی وجہ سے معذور تھے، ان کی رپورٹ صدر انجمن کی اجازت سے مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم نے پڑھ کر سنائی، اس طویل رپورٹ میں ایک غلط فہمی کے ازالہ کی کوشش کی گئی تھی۔

"جس زمانہ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد قائم ہوئی تھی، اس وقت اس کے دو مقصد اعلیٰ قرار دیئے گئے تھے ـــــ اصلاح طریقۂ تعلیم اور رفع نزاع باہمی ـــــ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبودی کا انحصار زیادہ تر ان ہی دو مقاصد پر ہے، مگر دو برس کے تجربے سے اندازہ ہوا کہ بعض لوگوں کو ان مقاصد کے سلسلہ میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں ہوئیں، ندوہ کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مسلمانوں کو آزادی کی تعلیم دی جائے یا سنی، شیعہ، مقلد اور غیر مقلد میں مذہب و مسلک کا اتحاد پیدا ہو جائے اور عقائد و اعمال پر ایسا اثر پڑے کہ سنی شیعہ اور مقصد غیر مقلد ہو جائیں، یا ہر مذہب کو حق یا ہر مذہب کو باطل سمجھیں یا ایک نیا مذہب معجون مرکب پیدا ہو، اور علماء امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے باز رہیں، حاشا وکلا یہ مقصد کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ اس کے بانی اس کے اراکین تمام اہل سنت وجماعت ہیں۔"

پھر اس رپورٹ میں ندوۃ العلماء کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا:۔

"ندوۃ العلماء کے مقاصد درج ذیل ہیں:۔

(۱) تعلیم کی اصلاح اور علوم دینیہ کی ترقی (۲) مسلمانوں کے باہمی نزاع دور کرنے کی کوشش (۳) مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی صلاح وفلاح کی تدبیریں سوچنا اور جد وجہد کرنا، اس سے مراد یہ نہیں کہ تمام فرقے مذہباً متحد ہو جائیں، یہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے،

مقصد صرف یہ ہے کہ اہل اسلام سے وہ فضیحت کن نزاع دور ہو جائیں جو غیروں کی نگاہ میں اسلام اور مسلمانوں کو بے وقعت کرتی ہیں اور خود ان کی علمی اور اخلاقی ترقی میں حائل ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اپنے مقصد اعلیٰ کو پورا کرنے کی غرض سے عام اہل اسلام کو دعوت دی جائے اگرچہ ان میں اختلاف ہو"

اس رپورٹ میں سال رواں میں جو پیش رفت ہوئی اس کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے، مثلاً" (۱) نصاب تعلیم کے سلسلہ میں ایک کمیٹی کا قیام اور نئے نصاب تعلیم کی منظوری (۲) دارالافتاء کے کام میں تعویق کے اسباب کا جائزہ (۳)" علماء اور عوام کے باہمی تعلقات" اس موضوع پر بہترین مقالہ لکھنے کے لئے سو روپے انعام کا اعلان (۴) قانون حجاج کی ترمیم کے لئے حکومت سے درخواست (۵) حسب ایکٹ ۲۱ ۱۸۶۰ء ندوۃ العلماء کو رجسٹرڈ کرانے پر غور (۶) ندوۃ العلماء کے لئے معتد بہ سرمایہ کی فراہمی۔

یہ تحریک بھی پیش کی گئی کہ جو مصارف بے جا اور مضر رسوم تقریبات شادی وغمی میں عام طور پر رائج ہیں ختم کر دیئے جائیں اور باہم معاہدہ ہو کہ کوئی شخص ایسی تقریبات میں شریک نہ ہو جس میں عہد نامہ کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔

ایک اہم مقالہ

اجلاس کی آخری نشست میں مولانا عبداللہ صاحب انصاری، مولانا سید محمد شاہ محدث رامپوری، اور مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی کی تقریروں کے بعد ایک اہم تحقیقی مضمون مولوی شفقت اللہ صاحب برایونی نے پڑھا جس میں اعداد وشمار کے ذریعہ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا گیا تھا اور ان کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی تھی[1]، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] یہ مفصل مضمون نقل کرنے کے قابل ہے لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں، اس مقالہ کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک ندوۃ العلماء نے کیسے باخبر اور وسیع الذہن عنصر کو جمع کر لیا تھا۔

"ان سب عیسائی فرقوں نے آپسی رضامندی سے اپنے اپنے مقدور و استطاعت کے موافق کل ہندوستان اور برما کو اپنے دین مسیحی کی اشاعت کے لئے تقسیم کر لیا ہے، مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا بریزی ٹرین چرچ اور راجپوتانہ اور ہندوریاستوں میں آئرلینڈ کا رومن کیتھولک چرچ اور مغربی و شمالی ہندوستان میں زیادہ تر امریکہ کا میتھوڈیسٹ چرچ وغیرہ۔

فقط ایک شاخ یعنی میتھوڈیسٹ اسکول آف امریکہ کی کارروائیوں کا مختصر حال یہ ہے کہ اس کے پادری تبت کے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے لے کر ہندوستان کے جنوبی حدود راس کماری تک اور بلوچستان کے مرکزی شہر کوئٹہ سے جو انگریزی عملداری کی مغربی حد ہے، جزیرۂ نما ملایا کی انتہا سنگاپور تک ۲۰ لاکھ مربع میل کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں، اور کوئی قصبہ، کوئی قریہ ہندوستان میں باقی نہیں رہا، جہاں اس فرقہ کا مشن نہ پایا جاتا ہو، اور ہر مشن کے متعلق اتنے گرجے، شفاخانے، چھاپے خانے، زمینداریاں، گرانٹ، صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کے کارخانے اور مذہبی تعلیم کے اسکول ہیں، جن کے شمار سے عقل حیران ہے"۔

مضمون نگار نے صرف مذکورہ بالا شاخ کے اعداد و شمار فراہم کر کے بتایا ہے کہ اس کے دو سو پچاس مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں، اور پھر ان شہروں کی تفصیل دی ہے کہ کس شہر میں کتنے مشن سرگرم عمل ہیں۔

یہ مضمون بڑا محققانہ، فاضلانہ اور مبصرانہ تھا، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء نے فرمایا کہ یہ امور تمام اہل اسلام بالخصوص علماء کی نہایت توجہ کے لائق ہیں، غیر قوموں کی مستعدی اور کوششوں کو ملاحظہ کر کے بیدار ہوں اور اپنے پاک مذہب اسلام کی حمایت پر مستعد ہو جائیں، ندوۃ العلماء سے جو کچھ ہو سکے گا وہ کرے گا"۔

مختلف انجمنوں کے سپاسنامے

اس اجلاس میں انجمن اسلامیہ جبلپور، انجمن اسلامیہ امرتسر، انجمن آلِ ہاشم رائے بریلی، انجمن حامیٔ ندوۃ العلماء سلطانپور، انجمن اسلامیہ بدایوں، مسلمانانِ فتحپور، سوہ مسلمانانِ اعظم گڑھ، اہل اسلام بریلی کی طرف سے ندوۃ العلماء کو سپاسنامے پیش کئے گئے، جن میں ندوہ کی خدمات کی تحسین اور اپنے بھرپور تعاون کی پیش کش تھی۔

چند تحسینی اشعار

شعراء نے عربی، فارسی، اردو میں طویل قصیدے پڑھے، جن میں ندوۃ العلماء کے مقاصد و تخیل اور اس کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جدّ افضل گل وشاداب ای صحن چمن — مرحبا جوش بہار و زیب و نسرین و سمن

اہل ایماں جوق جوق آئے ہیں اور دل شاد ہیں — شاد ہیں اہل زمیں رنجور ہے چرخ کہن

غنچۂ دل کھل گئے سب ہیں خوشی سے باغ باغ — آج ہے شہر بریلی ایک روح افزا چمن

کیا سبب ہے ایک عالم آج کیوں دل شاد ہے — کیا سبب ہے آج جو فرحت سے ہیں سب خندہ زن

کیا سبب ہے رونق افزا ہیں جو اتنے اہل فضل — کیا سبب ہے اہل دیں فرحت سے ہیں جو نعرہ زن

وجہ یہ ہے جب ہوا اسلامیوں کا حال تنگ — یہ ہوئی نوبت کہ تھے اعدائے ملت خندہ زن

آگیا دریائے لطف و رحمتِ حق جوش پر — چھا گیا اسلامیوں پر ابرِ فضل ذوالمنن

دل میں اپنے خاص بندوں کے یہ القا کر دیا — ان کے حسنِ سعی سے قائم ہوئی اک انجمن

بارک اللہ کامیاب اپنے مقاصد میں یہ ہو — ہو نزاعِ باہمی اور جہل کی یہ بیخ کن

اس کی جو بانی ہیں جن سے اس کا استحکام ہے — سب کے سب ہیں مایۂ فضل و کمال ارباب فن

ہے ان ہی سے ملت و مذہب کا اب روشن چراغ — ہے تر و تازہ انہی سے دین و ایماں کا چمن

حضرت ناظم ہیں وہ مقبولِ درگاہِ الٰہ — جو ہیں محبوبِ محبوبِ رب ذوالمنن

ہیں جناب فضل رحماں کے خلیفہ باصفا — رہبرِ راہِ طریقت ہادیٔ فرض و سنن

جب ہوں اس ندوے کے بانی لیجے خاطر خدا — مورد رحمت نہ ہو کیونکر بھلا یہ انجمن

کر لو تم ندوے کو رہبر چاہتے ہو گر فلاح — جو سنوارے دین و دنیا وہ یہی ہے انجمن

حشر تک یارب رہے سب اہل دیں میں اتفاق — حشر تک یارب کریں سب اہل دیں تکمیل فن

روز افزوں ہو ترقی دولتِ اسلام کی — کامیاب اپنے مقاصد میں رہے یہ انجمن

ایک دوسری طویل نظم کے دو شعر

آپس میں اہل ندوہ سب متفق ہیں باہم — ہیں خود میہماں سب اور خود ہی میزباں ہیں

جب ایسے متحد ہوں ہم سب کے سب مسلماں — پھر دیکھنا ہماری کیسی ترقیاں ہیں

ایک فارسی قطعہ تاریخ انعقاد اجلاس بریلی ۱۳۱۴ھ

در شہر بریلی شدہ ندوہ علماء را — زد دین نبی را بود آثار ترقی

گفتند بمن سال کدام است سلاما — گفتم کہ شرف شدہ زین ندوہ بریلی ۱۳۱۴ھ

ایک عربی قصیدے میں ندوہ کو یہ خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے

اھلاً وسھلاً ندوۃ العلماء — قد کنت فینا ایۃ الرحمٰن

امتد ظلک فی الضواحی کلھا — حتی تشیب مفارق الغربان

خزانۂ محمدیہ

۵ اجلاس بریلی ندوۃ العلماء کے مالیات کی فراہمی کے لئے ایک انعامی اسکیم جاری ہوئی،

جس کا الہامی نام "خزانہ محمدیہ" تھا، محمد سلیم الزماں خاں مجسٹریٹ درجہ اول ضلع آگرہ نے ۳۰ مارچ ۱۸۹۶ء کو ایک خط ناظم ندوۃ العلماء کے نام تحریر کیا، جس میں اپنے ایک خواب کا ذکر کیا کہ ۲۹ جنوری ۱۸۹۶ء مطابق ۱۳ شعبان المعظم ۱۳۱۳ھ شب پنجشنبہ کو میرے داہنے پیر میں شدید درد تھا، دو بجے تک نیند نہیں آئی، پھر ایک ایسی حالت پیدا ہوئی کہ نہ پوری نیند تھی نہ بیداری، اس حالت میں میں نے والد ماجد جناب شاہ محمد مجید الزماںؒ کو جن کا میں مرید بھی ہوں، راستے میں چلتے ہوئے دیکھا، میرے والد خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ کے خلیفۂ مجاز تھے، میں نے حضرت والد صاحب سے عرض کیا کہ آپ اس وقت کہاں تشریف لے جاتے ہیں، فرمایا: آج جناب خواجہ صاحب کا دربار ہے، وہاں جاتا ہوں، میں بھی ان کے ہمراہ ہو گیا، تھوڑی دور چل کر ایک عالی شان مسجد دیکھی جس میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا، اور ایک بزرگ منبر پر وعظ فرما رہے تھے، میں نے غور سے دیکھا تو حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ تھے، وعظ میں یہ بیان تھا کہ مسلمانانِ ہند نے اس سنت مؤکدہ کی تعمیل ترک کر دی، اس وجہ سے ترقی سے محروم ہیں، حضرت نے فرمایا کہ امت کا ہر فرد اپنی معاش میں سے ایک پیسے سے لے کر ہزار روپے تک بقدر استطاعت علیحدہ رکھا کرے، اور اس کا نام "خزانۂ محمدیہ" سمجھے، اس خزانے کو علماء کے اختیار میں دے دے، پھر حضرت خواجہؒ منبر سے اترے اور ایک عالیشان عمارت کی طرف تشریف لے چلے، تمام حاضرین بھی ساتھ ہو لئے، اس عمارت کے آٹھ دروازے معلوم ہوتے تھے، ہر دروازے کے اندر دفتر خزانۂ محمدیہ ہے اور وسط دفتر کا نام ندوۃ العلماء ہے ..... پھر میرے حضرت نے حکم دیا کہ تم فوراً اپنی آمدنی سے ایک رقم ماہوار علیحدہ بنام خزانۂ محمدیہ حفاظت سے رکھو، اور سالانہ آمدنی دفتر ندوۃ العلماء میں روانہ کرتے رہو، اس قدر دیکھنے پایا تھا کہ آنکھ کھل گئی"۔

سلیم الزماں صاحب مجسٹریٹ نے فی روپیہ ایک پیسہ حساب سے خود اپنی اور کئی احباب کی اعانتی رقوم ندوۃ العلماء کو بھیجی اور اس طرح اس کارِ خیر کا آغاز ہوا۔

یتیم خانہ اسلامیہ کانپور اور انجمن حمایت بیوگان بارہ بنکی کا انتظام

ان دونوں رفاہی اداروں کو جن کی کچھ وقف جائداد بھی تھی، ندوۃ العلماء کے زیر انتظام لیا گیا، یتیم خانہ کانپور کا متولی ناظم ندوۃ العلماء کو مقرر کیا گیا، وقف نامہ کی باقاعدہ رجسٹری ہو گئی، اور محلہ انور گنج میں یتیم خانہ اسلامیہ اسکول کھولا گیا، کلکٹر ضلع کانپور نے اس کا معائنہ کر کے لاوارث مسلمان یتیم بچوں کے لئے خاص ہدایت کی کہ وہ یتیم خانۂ اسلامیہ میں دیئے جائیں، دونوں اداروں میں ضروری تعلیم کے ساتھ دستکاری بھی سکھائی جاتی تھی۔

دستور العمل ندوۃ العلماء

اجلاس بریلی کے موقع پر ایک خصوصی نشست میں ندوۃ العلماء کا دستور العمل منظور کیا گیا۔ روداد اجلاس بریلی کے ساتھ ندوۃ العلماء کا یہ دستور العمل بھی شائع کیا گیا جس میں متعدد ذیلی عناوین کے تحت قواعد و ضوابط درج ہیں۔ مثلاً:۔

فرائض اراکین مجالس، کارروائی جلسۂ عام، جلسۂ انتظامیہ، انتخاب اراکین انتظامیہ، فرائض و اختیارات مجلس انتظامیہ، عہدیداران، فرائض و اختیاراتِ ناظم، ضوابط متعلق اجلاس، دستور العمل مجلس مالیات وغیرہ۔

۱۳۱۳ھ میں پیش کیا ہوا یہ دستور العمل ندوۃ العلماء کے بانی ارکان اور اس کے داعیوں کی اعلیٰ انتظامی صلاحیت اور بصیرت و دور بینی کا آئینہ دار ہے۔

ندوہ کی مخالفت

ندوۃ العلماء کا تیسرا کامیاب اجلاس اس شہر یعنی بریلی میں ہوا، جو مخالفین ندوہ کا مرکز تھا، مخالف محاذ کے قائد مولانا احمد رضا خاں صاحب نے اپنے اختلافات کی لہر اس اجلاس سے قبل ہی شروع کر دی تھی، اس سلسلہ میں افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری تھا، ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے ۱۱ رمضان ۱۳۱۳ھ کو مولانا احمد رضا خاں صاحب کو پورے خلوص اور دلسوزی کے ساتھ لکھا کہ :-

"ذرا غور فرمایئے ہماری سختی اور تشدد نے ہمارے فرقے اہل سنت اور بالخصوص احناف کو کیسا سخت صدمہ پہونچایا ہے، ہندوستان میں تقریباً تمام اہل سنت حنفی تھے غیر مقلد کا شاید نشان بھی نہ ہو، ابتداء میں ایک دو شخصوں کی رائے نے غلطی کی، انھوں نے بعض مسائل میں اختلاف کیا، ہمارے بعض حضرات نے بنظر حمایت حق انھیں مخاطب بنایا اور انھیں روکا، اگرچہ ان کی نیت خیر تھی، اور اس کا ثواب وہ پائیں گے، مگر اتنی مدت کے تجربہ نے یہ معلوم کرا دیا کہ یہ حمایت خلاف مصلحت ہوئی..... اب اخراج عن المساجد کا فتویٰ مشتہر ہوا، جب سے ہمارے گروہ کو ذلت کا سامنا ہوا، غیر مسلم حاکموں کے روبرو ہم مجرموں کی طرح پکڑے ہوئے جاتے ہیں، ہمارے دین و ایمان کی کتابیں ان کے پیروں پر

رکھی ہوئی ہوتی ہیں، ہم اور ہمارے علماء کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں، اور ہمارے مخالفین کو ڈگریاں ملتی ہیں، افسوس صد افسوس! انہیں اپنے پاک مذہب کی اس ذلت پر ذرا فکر نہیں ہوتی۔

مولانا! خدا کے لئے غور کیجئے، اور دشمنان دین کو ہم پر اور ہمارے پاک مذہب پر ہنسنے کا موقع نہ دیجئے۔"[1]

ندوۃ العلماء کے ایک اور خیر خواہ مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"لیجئے آپ حق پر ہیں، آیئے اور ہماری لغزشوں کی مخدومانہ طور پر اصلاح کیجئے ہم کو جو کچھ ہم سے لغزشیں ہوئیں اور آئندہ سیکڑوں ہوں گی ان پر ہرگز اصرار نہیں۔ مگر روٹھ کر گھر نہ بیٹھئے، ملئے اور برادرانہ گلے، شکوے روبرو کیجئے تاکہ صفائی ہو جائے۔"[2]

ندوۃ العلماء کی مخالفت کی قیادت جو حضرات کر رہے تھے، ان میں پیش پیش مولانا احمد رضا خاں، مولانا عبدالقادر بدایونی، اور مولانا نذیر احمد خاں رامپوری تھے، مسلم ہندوستان کی تاریخ میں یہ گروہ وصل کے بجائے فصل کی بنیادوں کی تلاش و جستجو، مخالفت برائے مخالفت میں ممتاز و معروف ہے، ان پر ان مصالحانہ کوششوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، اور مخالفت کا طوفان برابر بڑھتا گیا، مہذب گالیاں دی گئیں، علمائے ندوہ کی تکفیر کی گئی، اور مخالفت و بہتان طرازی کی مہم کو چالیس سے زائد مخالف کتابچے شائع کر کے تیز کیا گیا، محض ندوہ کی مخالفت کے لئے ہزاروں روپے کا وقف قائم کیا گیا، مخالفین کے رسائل کا نام اور ان میں تحریر نظم و نثر سے ان کے ذوق و وجدان اور مذاق لطیف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، رسائل میں چند کے نام ہیں: جشوہ، جذوہ، سطوہ، خذوہ۔

---

[1] مراسلات سنت و ندوہ ص ۱۶ بحوالہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۱۷۲ [2] ہدایۃ الالباء ص ۸

منظوم کلام کا نمونہ ؎

جو ہو خود عین ضلالت پہ بنائے ندوہ
کیا زمانہ کو رہِ راست پر لائے ندوہ

پیر نیچر کی یہ ہے شعبدہ بازی ساری
آگ لگ جائے اسے بھاڑ میں جائے ندوہ[1]

اور نمونۂ تحریر:۔

"اب تمام کتب ندوہ مفصلاً بالاستیعاب ملاحظہ ہوں آپ پر خود عیاں ہو جائے گا کہ آشکارا و نہاں کس قدر مخالفات شدیدہ اہل سنت سے کی گئیں، ترک مذہب اختیارِ دہریت کی کھلی کھلی دعوتیں دی گئیں، مذہب سنت و ائمۂ اہل سنت کی صریح توہین کی گئی"[2]

مخالفین ندوہ کی مہم کے جواب میں ندوہ کے حامیوں نے غلط فہمی رفع کرنے اور صحیح صورتِ واقعہ کے علم کے لئے چند رسالے لکھے، جن میں مولانا حفیظ اللہ کی "ارشاد الکملا" حکیم محمد ایوب پھلواروی کی "القول الفاصل بین الحق والباطل" مولانا سید احمد حسین رائے بریلوی (اصلاً مولانا حکیم سید عبدالحی) کی "إتمام الحجۃ علی مخالفی الندوۃ" مولانا محمد علی کی "ہدایۃ الالبا" اور مرزا حیرت دہلوی کی "مقاصد ندوۃ العلماء اور اس کی مخالفت" قابل ذکر ہیں۔

ان رسائل میں متانت و سنجیدگی سے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، مرزا حیرت دہلوی اپنے اس کتابچہ میں درد مندی سے لکھتے ہیں:۔

"مسلمان دینی علوم سے بے بہرہ ہو گئے، ان کی مسجدیں، خانقاہیں ویران پڑی ہیں، چاروں طرف دھواں دھار اعتراضات آریہ اور عیسائی کر رہے ہیں، مگر کوئی خبر نہیں، اور خبر کہاں سے ہو؟ اسلام کی تردید سے انھیں فرصت ملے تو وہ دوسرے مذاہب کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوں..... اگر مسلمان علماء کی کل تصانیف

---

[1] جزوہ لرجوم احزاب دار الندوہ ص۳۲ [2] مکتوب مولانا احمد رضا خاں بنام مولانا محمد علی مونگیری۔

جمع کی جائیں گی تو فیصدی پانچ تو کسی اور قصوں کی نکلیں، پچانوے اسلام اور مسلمانوں کی تردید و تکفیر میں نکلیں گی"[1]

مخالفین کو اس بات پر اصرار تھا کہ ندوۃ العلماء مختلف العقیدہ فرقوں کا معجون مرکب ہے، جس میں شیعہ، نیچری، وہابی، سب شریک ہیں، ندوۃ العلماء مقلدین اور غیر مقلدین کے باہمی اختلافات کو ختم کرانے میں کوشاں ہے، اور یہ بات گمراہ کن ہے، ان حضرات کے نزدیک اپنے فقہی مذہب و مسلک کو ترک کئے بغیر یہ بات ممکن نہیں تھی، بہتان اور بددیانتی، غلط بیانی اور مبالغہ آرائی سے اس گروہ نے ندوہ کی مخالفت میں بعض فتوے بھی حاصل کئے، اور ان کی اشاعت کر کے عوام کو ورغلایا، مخالفت کی اس آندھی سے دور دراز کے علاقے بھی متاثر ہوئے مولانا شبلی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"بمبئی میں اس دفعہ صرف منضج پر اکتفا کیا گیا، وہاں شدت سے یہ خیال پھیلایا ہے کہ ندوہ کفر ہے" (بنام مولانا حمید الدین ۳۶)

مولانا نے جس منضج کی طرف اشارہ کیا وہ یہ تھا کہ انجمن اسلام ہال بمبئی میں ندوہ کے اغراض و مقاصد پر ایک تقریر کی، مخالفت کے اس سیلاب بلاخیز میں مشائخ اور علمائے حق اس نوخیز تحریک کی برابر حمایت کرتے رہے "الحق یعلو ولا یُعلیٰ" کے مطابق اس متبرک انجمن کو غلبہ ہوتا جاتا ہے، اکثر علماء اور مشائخ شامل ہوتے جاتے ہیں، یہی سننے میں آیا ہے کہ مخالفین کا ایک فتویٰ بغداد شریف گیا تھا، اور غلط بیانیوں کی وجہ سے قریب تھا کہ وہاں کے علماء مغالطہ میں آجائیں مگر وہیں تائید غیبی ہوئی کہ شام کے ایک عالم اس انجمن سے واقف وہاں موجود تھے انھوں نے اصل حقیقت بیان کی، اور فتویٰ کو واپس کرا آیا۔[2]

---

[1] مقاصد ندوۃ العلماء ص ۱۳ [2] تحفۂ محمدیہ جمادی الاول ۱۳۱۴ھ ص ۵

شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نے دو مفصل تحریریں ندوۃ العلماء کی پرزور تائید اور اس میں شرکت و اعانت کی اپیل پر بھیجیں، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"ایسے پرآشوب وقت میں کہ نفاق اور بغض و عداوت کا بازار گرم اور آزادی پھیل رہی ہے، یہ بات بہت غنیمت ہے کہ ایک جماعت کثیر علماء کی محض بہ نظر خیر خواہی اسلام کی جا بجا مجتمع ہو اور سفر دور دراز کی مشقت اور مصارف گوارا کریں، مسلمانوں کی نہایت خوش قسمتی ہے کہ عرصہ تین سال سے اس قسم کا جلسہ ہند میں قائم ہوا ہے، جس کے تین جلسے کانپور، لکھنؤ، بریلی، بڑی شان و شوکت سے ہوئے علاوہ ہزاروں مسلمانوں کے صدہا علماء و مشائخ دور دور سے آکر شریک ہوئے، درحقیقت یہ تائید غیبی ہے، پروردگار عالم نے "اذا اراد اللہ شیئاً فہیأ أسبابہ" کے مجلس ندوۃ العلماء کو اصلاح و ترقی اہل اسلام کے واسطے اس آخر زمانہ میں بطور لطیفۂ غیبی کے ظاہر فرمایا، ندوۃ العلماء کو مسلمانوں کے حق میں امداد غیبی سمجھنا چاہئے اور مسلمانوں کو خلوص کے ساتھ اس میں دامے، درمے، قدمے، سخنے شرکت و اعانت کرنی چاہئے، باہمی نزاع و اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کو صدہا قسم کے نقصانات پہونچتے ہیں، اور غیر قوموں کو شماتت اور تحقیر کا موقعہ ملتا ہے"[1]

مولانا منور علی شاہ بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کو اپنے ایک مکتوب میں حضرت حاجی صاحبؒ نے تحریر فرمایا:۔

"جہاں تک حالات و اغراض ندوہ گوش زدہ فقیر ہوئے ہیں، وہ بے شک بہت ہی مفید ہیں، اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح دارین کا ذریعہ بن سکتے ہیں فقیر کی

---

[1] تحفۂ محمدیہ صفحہ ۵-۶

ہر وقت یہی دعا ہے کہ جو امر مسلمانوں کی بہبودی کا باعث ہو اس میں اللہ تعالیٰ غیبی ترقی عطا فرمائے اور اس کو حسد حاسدین و شر مفسدین سے ہمیشہ مامون رکھے' اول بھی فقیر نے ندوہ کی اعانت کے باب میں کچھ تحریر کیا تھا، اس مرتبہ پھر دوبارہ عزیزی ظہور الاسلام فتحپوری نے ایک مضمون لکھوایا ہے' انشاء اللہ تعالیٰ وہ آپ کے مطالعہ میں آئے گا مجھ سے جس قدر تائید متصور ہے کرتا ہوں[1]"

تحریک ندوۃ العلماء کے آغاز ہی میں اس مخالف مہم سے اس نو خیز تحریک کے کارکن بد دل ہونے کے بجائے بڑے عزم و ثبات کے ساتھ اپنے مقصد و مشن سے وابستہ رہے، انھوں نے اس مخالفت کو اپنے لئے فال نیک سمجھا" اتمام الحجۃ علی مخالفی الندوۃ" میں مولانا عبدالحیؒ تحریر فرماتے ہیں :-

"جب سے ہم کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ ایک عالم بریلوی (مراد مولانا احمد رضا خاں) اور دوسرے فاضل بدایونی مخالف ہو گئے ہیں' اس وقت سے ہم کو ندوۃ العلماء کی قبولیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا[2]"

اس رسالہ میں مخالفین کی ذہنیت کا مرقع یوں پیش کیا گیا ہے :-

"حضرت فاضل بدایونی و بریلوی وہی بزرگ ہیں جن کی تیز زبانی سے بہت سے سلف صالحین بھی محفوظ نہیں رہ سکے، ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی شان میں جو کچھ انھوں نے گستاخیاں کی ہیں' ان سے سب واقف ہیں' اور خود اس زمانہ میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ' مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا عبدالحیؒ کی تکفیر انھیں حضرات کے

---

[1] تحفۂ محمدیہ ص ۵-۶ [2] اتمام الحجۃ علی مخالفی الندوۃ ص ۴

زورِ قلم کا نتیجہ ہے اس واسطے ان کی تحریر و تقریر کی طرف مسلمانوں کو بالکل اعتبار نہ کرنا چاہیئے"[1]

مخالفین کی طرف سے تحریک ندوۃ العلماء کو ناکام و بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود پہلے رجب ۱۳۱۳ھ میں غازی پور میں ندوۃ العلماء کی شاخ قائم ہوئی، اس کے بعد ملک کے متعدد مقامات پر اس کی شاخیں اور ہمدرد و معاونین کے حلقے قائم ہوئے، مخالفت کا یہ گرم بازار ملک کے مختلف طبقوں کی طرف سے ندوۃ العلماء کے پرجوش خیر مقدم کی وجہ سے سرد پڑ گیا، اس تحریک کی محبوبیت اور مقبولیت کا اندازہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اس تحریر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:-

"سارے ملک میں ندوۃ العلماء کی تحریک کا غلغلہ بلند تھا، ہندوستان کے تقریباً تمام مشاہیر علماء مشائخ، اعیان قوم اور روشن دماغ فضلاء نے اس کی تائید و تحسین کی تھی، پورے ملک کی نگاہیں اس نئی تحریک پر جو علماء کے ایک مخلص و متعازن حلقہ فکر سے شروع ہوئی تھی، اور بڑے عزائم لے کر اٹھی تھی، لگی ہوئی تھیں"[2]

---

[1] ایضاً [2] حیات عبدالحی

ندوۃ العلماء کا چوتھا اجلاس

ندوۃ العلماء کا چوتھا اجلاس ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۴ھ مطابق ۲۱، ۲۲، ۲۳ مارچ ۱۸۹۷ء بروز جمعہ، شنبہ، یکشنبہ، میرٹھ میں منعقد ہوا، مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن نے صدارت کو رونق بخشی۔

حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب نے اپنے افتتاحی کلمات میں فرمایا:۔

"بھائیو! غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے اسلاف کیسے کیسے صاحب فضل و کمال تھے اور آپ کی قوم میں کیسے کیسے لوگ صاحب جاہ و جلال اور علم و ہنر میں یگانۂ روزگار تھے، افسوس زمانہ نے ایسا پلٹا کھایا کہ اہل فضل و کمال کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹایا، اب نہ وہ علم ہے، اور نہ کمال، بلکہ بجائے اس کے سراسر جہل ہے اور جدال، زمانے کی حالت دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ غالباً بعد چندے یہ گل کھلے گا کہ کوئی شخص فرائض و سنن بتانے والا بھی نہ ملے گا، مگر الحمدللہ کہ ایسے نازک وقت میں توفیق الٰہی نے ہمارے علمائے دین کو غفلت سے جگایا، اور انھوں نے بعونہ تعالیٰ اپنے "تئیں" کانبیاء بنی اسرائیل" کر کے دکھایا، ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، ہدایت خلق اللہ کی عمدہ راہ نکالی، تفاصد ان کے سراسر ہدایت ہیں، جن کو علماء کرام نے جلسات سنین ماضیہ میں بکمال فصاحت

بیان فرمایا۔"

اس کے بعد مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء کو سال گذشتہ کارروائی سنانا تھی، مگر چونکہ ناظم صاحب ممدوح اپنی علالت کی وجہ باواز بلند بولنے سے معذور تھے، اس لئے مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم نے کارروائی جناب صدر انجمن کی اجازت سے پڑھ کر سنائی۔

خلاصہ رپورٹ ناظم ندوۃ العلماء

"جناب صدر انجمن صاحب و اعیان جلسہ! قبل اس کے کہ میں حسب دستور سال گذشتہ کی مختصر کارروائی بیان کروں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کو قائم ہوئے تین برس ہو چکے، اس وقت سے اب تک اس کی نظامت کا فخر آپ نے مجھ کو بخشا ہے۔

اب میں سال گذشتہ کی مختصر کارروائی اور تجاویز منظور شدہ کی تعمیل یا عدم تعمیل کو بلا تصنع ظاہر کرتا ہوں۔

سالہائے پیوستہ کے جلسوں میں تین اہم تجویزیں منظور ہوئی تھیں۔ (۱) ترتیب نصاب (۲) دارالافتاء (۳) فراہمی سرمایہ۔

ترتیب نصاب

یہ تجویز ندوہ کے دیباچہ کا آغاز ہے اور شاید ہمارے احباب کو اس بات پر تعجب ہے کہ باوجود کئی سال کی متواتر کوششوں کے اب تک نصاب تیار نہیں ہوا، اور خود مجھ کو بھی اس کی کارروائی ظاہر کرنے میں بجز اظہار معذرت کے کوئی اور چارہ نہیں۔

"بے شک باوجود متواتر کوششوں کے نصاب اب تک تیار نہیں ہوا، مگر یہ کام

ایسا سہل بھی نہیں ہے جیسا ہمارے دوستوں نے خیال کر لیا ہے، معمولی کتابوں میں ردّوبدل کر دینا بلاشبہ آسان ہے، مگر ان ضرورتوں کے لحاظ سے نصاب تیار کرنا جن کو ہمارے علماء نے اپنی متعدد تقریروں میں ظاہر کیا ہے، دشوار اور سخت تر دشوار ہے، تاہم اب تک جو کام اس ضعیف و ناتواں کے کرنے کا تھا وہ اپنے وسیع خیال کے بموجب کیا۔

دارالافتاء

اس سال اس کے متعلق کمی سرمایہ کی وجہ سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

فراہمی سرمایہ

یہ وہ تجویز ہے جس پر ندوے کی تمام کارروائیوں کا دارومدار ہے بلکہ اس عالم اسباب میں دین و دنیا کے اکثر کام بڑے سے لے کر چھوٹے تک بغیر اس کے نہیں ہو سکتے، چہ جائیکہ ندوے کی وہ تجویزیں جن میں صرف کثیر کی ضرورت ہے، اس کے متعلق ارکان ندوہ نے کوئی خاص کارروائی نہیں کی جس سے وہ عظیم الشان تجویزیں عملی قالب میں لائی جائیں جن پر مسلمانوں کی بہبود کا دارومدار ہے۔

سال گذشتہ کے جلسۂ سالانہ میں دو تجویزیں منظور ہوئی تھیں، "تقرر واعظین برائے اشاعت اسلام" اور "قیام دارالعلوم" مگر افسوس ہے کہ امسال ان تجویزوں کے متعلق کوئی کارروائی نہیں ہو سکی، جس کی بڑی وجہ وہی ہے کہ ندوے کے پاس اس قدر سرمایہ نہیں ہے کہ وہ ان تجویزوں کو عمل میں لائے، دوسری وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس سال مختلف وجوہ سے اپنے وقت پر جلسۂ انتظامیہ نہیں ہو سکا، اس وجہ سے سرمایہ جمع کرنے کی خاطر خواہ تحریک نہیں ہوئی ورنہ ہم کو

امید تھی کہ اہل اسلام ان کاموں کے لئے ضرور توجہ کرتے، تیسری وجہ قحط وطاعون بھی ہوئی کہ لوگوں کی پریشانی دیکھ کر چندے کی کوشش کرنے میں تامل رہا۔

مجلس انتظامیہ کا سہ روزہ جلسہ ۱ر ۲ر ۳ر جمادی الاخری کو منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل تجویزیں منظور ہوئیں۔

۱۔ ندوہ کی منظور شدہ تجویزوں میں سے جو کام شروع کیا جائے، وہ وسیع پیمانے پر ہو، اور دیگر انجمنوں اور مجلسوں کے کاموں سے ممتاز ہو۔

۲۔ دارالعلوم قائم کرنے کے لئے ایک علیحدہ مجلس قائم کی جائے اور اس کے لئے جداگانہ دستور العمل مرتب ہو، اس تجویز کی روشنی میں مولانا شبلی نعمانی کے سپرد مجلس کے قواعد مرتب کرنے کی خدمت کی گئی۔

مجلس انتظامیہ کا دوسرا جلسہ ۱۹ر رجب ۱۳۱۴ھ کو ہوا اس میں بعض ضروری امور طے کئے گئے"۔

مخالفت کا بازار سرد

گزشتہ اوراق میں گزر چکا کہ سال گذشتہ کے جلسۂ سالانہ سے ندوے کی مخالفت شروع ہوئی اور بعض حضرات نے اس مخالفت کو ایسی ترقی دی کہ ہندوستان کے دور دراز مقامات تک اس کا اثر پہونچا، یہ بلاخیز طوفان اس شدت سے اٹھا تھا کہ اس کے مقابلہ میں ایسی نوعمر انجمن کا قائم رہنا سخت دشوار تھا، مگر خدا کے فضل سے ندوہ صرف قائم ہی نہیں رہا بلکہ اس نے اپنی رفتار میں نمایاں ترقی کی، اور ثابت کر دیا کہ یہ چند روزہ طوفان ایسی کشتی کو ضرر نہیں پہونچا سکتا جس کے کشتیبان قوم کے ناخدا اور مسلمانوں کی امید گاہ ہیں۔

ندوۃ العلماء کے مقاصد کی اشاعت

"اس سال باوجود مخالفت کے ندوۃ العلماء سے عام دلچسپی ظاہر کی گئی ہے، پنجاب اور پورب کے مشہور شہروں میں ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی تائید و اعانت کی غرض سے معین الندوہ انجمنیں قائم ہو گئی ہیں۔

معین الندوہ دہلی جو مولانا ابو محمد عبد الحق حقانی مصنف "تفسیر حقانی" اور مولوی حافظ عزیز الدین صاحب وکیل کی کوشش سے قائم ہوئی اس کے علاوہ ——— معین الندوہ کرنال، معین الندوہ لاہور، معین الندوہ ریواڑی ضلع گوڑگانواں، معین الندوہ غازی پور، معین الندوہ پٹنہ، معین الندوہ بانکی پور، امسال متحرک و فعال رہیں، ارکان کی تعداد بھی امسال سال گذشتہ سے خاصی زیادہ ہے، گذشتہ سال ۳۴۳ ممبر تھے اور امسال تقریباً آٹھ سو ارکان ہیں۔"

رپورٹ کے آخر میں کہا گیا کہ:۔

"اسلام اور اہل اسلام کے لئے یہ وقت بہت نازک ہے، ندوۃ العلماء ملت کی بہبودی میں جہاں تک ممکن ہے کوشاں ہے، اگر خدائے تعالیٰ کو بہبودی منظور ہے تو اس کے مقاصد پورے ہوں گے، ورنہ جو ہمارا فرض ہے اسے ہم ادا کرتے ہیں" اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ"

ایثار کی ایک عجیب مثال

"اس کارروائی کے بیان کرنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ ان حضرات کا نام نامی اور ان کی خدمات بیان کروں جنھوں نے اس مبارک انجمن کی جان سے یا مال سے یا قلم و زبان

سے مدد کی۔

اس گروہ میں سب سے اول مولوی محمد شریف صاحب وکیل غازی پور ہیں، جنھوں نے خاص اپنے رہنے کی کوٹھی میں بٹھا دیا اور بہت ادب سے فرمایا کہ یہ کوٹھی جو میں نے اپنے رہنے کے لئے بنوائی ہے، ندوۃ العلماء کی نذر ہے اور میں آپ کو قبضہ دلانے کے لئے لایا ہوں، پھر اس کا وقف نامہ لکھوا کر انھوں نے بھیجا دیا اور خود کرایہ کے مکان میں جا رہے، یہ ایسی عالی ہمتی ہے کہ جس کی نظیر میرے علم میں نہیں۔"

مدوگار ناظم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ جب کارروائی سنا چکے تو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "سال گزشتہ کی طرح امسال بھی یہ عزت مجھ کو حاصل ہوئی کہ جو روداد ابھی آپ نے سنی ہے، اس کے بابت اظہار رائے کروں ـــــ جناب ناظم صاحب نے ابتداءً جو حالات ان تجاویز کی نسبت صاف گوئی سے ظاہر کئے کہ عملی کارروائی نہیں ہوئی ـــــ اس سے یہ نہ خیال کیجئے کہ ندوۃ العلماء سال میں ایکبار غوغا مچا کر بیٹھی نیند سو جاتا ہے، اور بارہ مہینے بعد بیدار ہوتا ہے، تو معذرت کا ایک محضر قوم کی روبرو پیش کرتا ہے کہ افسوس ہے کہ اس سال بھی کوئی عملی کارروائی نہیں ہو سکی۔"

دس لاکھ روپے

"اگر ان بزرگوں کو جو سال گزشتہ کے اجلاس میں تشریف فرما تھے، یہ توقع تھی کہ سال بھر بعد جب ہم جمع ہوں گے تو جناب ناظم صاحب یہ مژدہ سنائیں گے کہ دارالعلوم اپنی عالی شان عمارت میں قائم ہو گیا، اور اس کے سرمایہ کے واسطے ہم دس لاکھ روپے فراہم کر چکے، دارالافتاء بھی جاری کر دیا گیا، جس میں علامہ مفتی اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اور اشاعت اسلام کے

مقاصد کو پورا کرنے کے لئے تمام ملک میں واعظ پھیلا دیئے گئے..... تو مجھ کو افسوس ہے کہ ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی بلکہ ہم ایسی توقع کو پورا نہیں کر سکتے، اور اگر ان کو یہ امید تھی کہ سال آئندہ ہم یہ سنیں گے کہ ندوۃ العلماء کے مقاصد حاصل کرنے کے واسطے فلاں فلاں تدبیریں کی گئیں تو میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی توقع پوری ہوئی ہے۔

حضرات! جتنے کام عظیم الشان ہیں ان کے واسطے لازم ہے کہ ان کا استحکام ان کی شان کے لائق ہو، اگر ایک عظیم الشان مکان بنایا جائے جس کی شان کی رفعت اور صورت کی دلفریبی ناظرین کو متحیر کر دے مگر اس کی بنیاد بودی اور متزلزل ہو تو بجز اس کے کہ ایک روز اس کا بانی اس کی بربادی پر تأسف کرے اور کیا ہو سکتا ہے، پس دار العلوم ہو یا اشاعتِ اسلام یہ کام ہو نہیں سکتا، جب تک پوری قوم سچے دل سے متفق اور متوجہ نہ ہو، پس اول لازم ہے کہ ہم تمام تر اپنی قوت اس بارے میں صرف کریں، اور قوم کو ان کاموں پر آمادہ کریں۔"

مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اپنی تقریر میں فرمایا:۔

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک باغ لگایا، جس میں طرح طرح کے پھول پھل تھے جن کی خوشبو مغرب میں اندلس اور مشرق میں دشتِ قبچاق تک پہونچی، اس باغ کے مالی تھے، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین، اس باغ میں جو درخت نصب تھے، وہ صلاح و تقویٰ، توبہ استغفار وغیرہ کے تھے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہ درخت تر و تازہ تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے سچے پیروؤں نے اس باغ کو سینچ سینچ کر سیراب کیا، یہاں تک کہ اس کے گلدستے تمام دنیا میں پہونچے، ان بزرگوں کے اٹھ جانے سے رفتہ رفتہ وہ باغ ویران ہو چلا آج صلاح کا درخت خشک ہو گیا، یہاں تک کہ بادِ سموم کا ایسا جھونکا آیا، جس سے اس باغ کی

شادابی و سیرابی مٹ گئی، وہ باغ جس کی خدمت کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے، وہ علم کا باغ تھا۔

یہ شادابی کی فکر میں ہیں

یہ علماء دور دراز مقامات سے آکر کیوں جمع ہوئے ہیں؟ ایک پشاور سے آیا ہے تو دوسرا حیدرآباد سے، یہ اس باغ کے شاداب کرنے کی فکر میں ہیں، ہم لوگوں کی جمعیت اسی باغ کی سرسبزی سے ہے، ہم گردش فلک سے واقف ہیں، خدا جانتا ہے کہ جب زمانے کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بدترین و جاہل ترین اقوام ہم ہیں، یہ اقرار ہم سب لوگوں کو ہے وہ باغ ہمارے ہاتھوں ویران ہوا، لیکن اب بھی یہ امید ہے کہ اگر اس باغ کی سرسبزی کی فکر کی جائے گی تو وہ شاداب ہو جائے گا، لہذا یہ سوچ کر ندوۃ العلماء کے نام سے یہ مجلس قائم کی گئی ہے۔"

جلسۂ خاص اور اہم تجاویز

اس اجلاس کے موقع پر علمائے کرام کی دو مخصوص نشستیں رکھی گئی تھیں، پہلی نشست حافظ فصیح الدین صاحب سوداگر کے بالاخانے پر منعقد ہوئی، اس میں ہندوستان کے معروف و مستند علماء شریک ہوئے جو دور دراز کی مسافت طے کر کے آئے تھے، اس خصوصی نشست میں ناظم ندوۃ العلماء نے مجوزہ نصاب تعلیم کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ گذشتہ اجلاس میں طے ہوا تھا کہ حضرت مولانا لطف اللہ صاحب کی خدمت میں تمام کاغذات اور نقشے استصواب کی غرض سے بھیج دیئے جائیں، چنانچہ اس کی تکمیل کی گئی، اور حضرت مولانا نے اپنی رائے کے ساتھ ایک نصاب مرتب کر کے واپس فرمایا ہے، اس کے بعد مددگار ناظم صاحب نے مولوی اعظم حسین صاحب صدیقی خیرآبادی

کا خط اور تجویزیں پیش کیں اور ہر تجویز پر بحث و گفتگو کے بعد فیصلہ کیا گیا۔

۱۔ تجویز اول یہ تھی کہ دار العلوم دہلی میں قائم کیا جائے اگر وہاں نہ ہو سکے تو لاہور میں، مولانا عبد الحق حقانی دہلوی نے شق اول کی تائید کی اور وجوہ ترجیح بسط و تفصیل سے بیان کئے، مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے اس سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ دہلی ہمیشہ سے فتنہ و فساد کا گھر ہے ایسی جگہ دار العلوم قائم کرنا نامناسب ہے، دوسرے یہ کہ دار العلوم ایسے مقام پر قائم ہونا چاہئے، جس کے اطراف میں رؤسا کثرت سے رہتے ہوں، اور فراخ حوصلگی سے امداد کر سکیں، میرے نزدیک دار العلوم کے لئے لکھنؤ مناسب ہے، حاضرین میں سے بجز شاہ سلیمان صاحب کے سب نے دہلی میں دار العلوم قائم ہونے پر اتفاق کیا۔

سلف کی پیروی

۲۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ سیرت و صورت، نشست و برخاست میں ندوہ کو سلف کا پیرو ہونا چاہئے، اس پر سب نے اتفاق کیا، اس تجویز میں یہ بھی تھا کہ اجلاس عام میں بلا ضرورت علماء کی نشست کے لئے کرسیوں کا اہتمام نہ کیا جائے، اس سلسلہ میں ناظم ندوۃ العلماء نے یہ وضاحت فرمائی کہ:۔

اب تک اجلاس عام میں علی العموم سب کے لئے واعیانِ ندوہ کرسیوں کا اہتمام کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ جلسۂ عام سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہمیں ان حضرات کو فائدہ پہونچانے کا موقعہ بھی حاصل ہو جو مسجدوں میں جا کر ہمارا وعظ نہیں سنتے اور وہ کرسیوں پر بیٹھنے کے عادی ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ ان کی روزمرہ نشست و برخاست اسی پر ہوتی ہے، اگر ان کے لئے یہ اہتمام نہ ہو تو کلفت کی وجہ سے وہ جلسہ کی شرکت اور استفادہ سے بالکل محروم رہیں گے چونکہ

اس غرض سے ان کے لئے کرسیوں کی نشست تجویز ہوئی تو یہ مناسب سمجھا گیا کہ وہ کرسیوں پر بیٹھیں، اور علماء ان سے نیچے فرش پر اس لئے یہ اہتمام جائز رکھا گیا، اگر یہ مقصود نہ ہوتا صرف علماء کے لئے ان تکلفات کی بالکل حاجت نہ تھی[1]

۳۔ تیسری تجویز یہ تھی کہ کثرت روشنی، آرائش اور تکلفات میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے، وہ موقوف کیا جائے، مدوگار ناظم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے اس تجویز پر فرمایا کہ روشنی سے مراد چراغاں ہے تو وہ قطعاً کسی جلسہ میں اب تک نہیں ہوئی، نہ ندوہ اس کو جائز سمجھتا ہے۔

۴۔ چوتھی تجویز یہ تھی کہ جو حضرات عقیدۃً اہل سنت والجماعت کے عقائد کے مخالف ہیں ندوۃ العلماء میں انھیں شریک نہ کیا جائے، اس تجویز پر غور و فکر اور بحث مباحثہ کے بعد طے ہوا کہ شرکت دو قسم کی ہے، ایک بحیثیت رکن دینی، دوسرے بحیثیت استفادہ، پہلی حیثیت کے ساتھ قطعاً کوئی ایسا شخص جو اہل سنت وجماعت کا عقیدۃً مخالف ہو، ندوۃ العلماء کا رکن نہیں ہے، اور نہ آئندہ بنانے کا ارادہ ہے، دوسری حیثیت میں کوئی شریک ہے تو اس کو روکنا ندوے کے مقاصد کے خلاف ہوگا۔

۵۔ پانچویں تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے جو علماء ندوۃ العلماء میں شریک نہیں ان کو شریک کرنے کی کوشش کی جائے، اس بارے میں فیصلہ ہوا کہ یہ کوشش ہونی چاہیئے، اب بھی ندوہ اس سے غافل نہیں، اس سلسلہ میں جو بھی مشورے اور تجاویز ہوں گی اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے گی۔

قاری محمد اسماعیل صاحب ساکن ٹیا محل دہلی نے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم قائم ہونے سے پہلے اس بات کی کوشش کی جائے کہ والیانِ ملک دارالعلوم کے سند یافتہ طالب علموں

---

[1] روداد اجلاس چہارم ص ۵۲

کو اپنی اپنی ریاست میں عہدے دینے کا وعدہ کریں، اس سے رؤسا کو لائق اور متدین عہدہ دار میسر آئیں گے، عام مسلمانوں کو دارالعلوم سے ہمدردی پیدا ہوگی اور نئی نسل کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی راہ ہموار ہوگی۔

اجلاس ندوۃ العلماء منعقدہ میرٹھ کی دوسری نشست میں مولوی قاضی علی احمد محمد اللہ شاہ بدایونی نے یہ تحریک پیش کی کہ انگریزی خواں طلبہ کو وظائف دے کر عربی پڑھائی جائے تاکہ وہ اسلامی علوم سے واقف ہو کر ندوے کی طرف سے ممالک غیر میں اشاعتِ اسلام کے لئے بھیجے جائیں، اس تحریک کی پرزور تائید مولانا عبداللہ انصاری صاحب داماد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے کی اور یہ تحریک بالاتفاق منظور ہوئی۔

اس کے بعد مولانا شبلی نعمانیؒ نے مقاصد دارالعلوم پر ایک بسیط مدلل و مؤثر تقریر کی جو ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی، افسوس ہے کہ یہ تقریر قلمبند نہیں ہو سکی۔

مولانا شبلی کے بعد مولانا ناظر حسن صاحب دیوبندی مدرس اول مدرسہ عبدالرب دہلی نے تقریر فرمائی، جس کے آخر میں انھوں نے ندوۃ العلماء کے قیام پر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا، انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ علماء کو فیس رکنیت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے اس پر منشی اطہر علی صاحب کاکوروی نے ندوۃ العلماء کے دستور العمل کی ان دفعات کو پڑھ کر سنایا، جن میں رکنیت کے اقسام درج ہیں، دفعہ ۸ میں صراحت تھی کہ خود مختار والیانِ ریاست، علمائے عظام اور جلیل القدر مشائخ، رکن اعزازی سمجھے جائیں گے اور چندۂ رکنیت سے مستثنیٰ ہوں گے، اس نشست میں مولوی سعد الدین صاحب نائب مہتمم مدارس بھوپال نے نواب سید علی حسن خاں صاحب کا مضمون پڑھ کر سنایا۔

مولوی ابوالقاسم فضل رب عرشی، شاعر خاص دربار نظام دکن نے اپنی فارسی نظم

پڑھی، ان کی یہ نظم اور فارسی مضمون روداد اجلاس میرٹھ کے ساتھ منسلک ہے۔

منشی امداد حسین انگریز وکیل شملہ نے ایک طویل مسدس پڑھی جس سے حاضرین محظوظ و متاثر ہوئے، مسدس کے آخری چند شعر تھے ؎

انگریز اب اس سے مانگیں یہ مل جل کے سب دعا ہم کو وہ کامیابی کرے اس قدر عطا

ندوہ کی کوششوں کا یہ چرچا ہو جا بجا چاروں طرف سے آنے لگے بس یہی صدا

ذروں نے آفتاب کا جلوہ دکھا دیا

قطروں نے مل کے دیکھ لو دریا بہا دیا

مولوی عبد الجبار صاحب عمر پوری مدرس اسلامیہ اسکول جبل پور نے اپنا عربی قصیدہ سنایا، اسی دن شام چھ بجے سے دس بجے شب تک جلسۂ عام ہوا جس میں مولانا قادر بخش صاحب سہسرامی، مولانا حکیم احسان علی صاحب مراد آبادی، مولانا جسیم الدین صاحب وکیل انجمن حمایت الاسلام مونگیر کے بیانات ہوئے۔

بینک اکاونٹ

علماء کی دوسری خصوصی نشست میں بہ نسبت پہلی نشست کے مجمع زیادہ تھا، پنجاب و پورب کے علماء ملا کر اس وقت ایکسو سے زیادہ رونق بخش مجلس تھے، پہلے یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ بینک میں حفاظت کی غرض سے بلا اخذ سود کے روپیہ جمع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بعد غور و مباحثہ کے طے ہوا کہ ایسے بینک میں جو سود قطعاً نہیں دیتا، حفاظت کی غرض سے روپیہ جمع کرنا بلا اخذ سود کے جائز ہے، بعض حضرات کی یہ رائے ہوئی کہ یہ صورت امانت کی ہے، مگر مفتی غلام رسول صاحب امرتسری نے فرمایا کہ اس کی صورت قرض کی ہوگی، اور یہ کتب فقہ

میں یہ تصریح موجود ہے کہ کفار کو قرض دینا حالتِ مصالحت میں جائز ہے اور یہ صورت معاونت کفار کی نہیں ہے، اس پر بالآخر اتفاق ہوا، اس کے بعد دستور العمل دار العلوم پیش ہوا، اور بعد غور و فکر کے یہ ترمیم و اضافہ منظور ہوا، اس کے بعد یہ طے ہوا کہ کل ارکانِ انتظامی جنھوں نے انتخاب کے بارے میں اپنی تحریری رائے نہیں بھیجی تو وہ ایک مہینہ کے اندر قلمبند کر کے ناظم ندوہ کے پاس بھیج دیں، جب سب رائیں جمع ہو جائیں تو ناظم صاحب کثرتِ آراء کے لحاظ سے یہ مشتہر کریں کہ کون کون حضرات معتمد یا رکن منتخب ہوئے ہیں۔

نشست اجلاس چہارم ۱۷ شوال ۱۳۱۴ھ ۹ بجے سے بارہ بجے تک ہوا، اس نشست کی صدارت مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی حیدر آباد دکن نے کی سب سے پہلے قاری سید حسن صاحب نے کلام مجید کی تلاوت فرمائی، اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے ایک تقریر کی، اپنی تقریر میں انھوں نے فرمایا:۔

انگریزی مدارس میں مذہبی تعلیم

"انگریزی تعلیم کی وجہ سے مذہبی تعلیم میں جو دقت اور خرابی پیش آگئی ہے، اس کی اصلاح کے لئے اب تک جو تدبیریں اختیار کی گئی ہیں، وہ سود مند نہیں ہوئیں، ان مشکلات پر نظر کر کے نواب وقار الملک نے اپنی محنت و وقت صرف کر کے اس بات کی کوشش کی کہ انگریزی مدرسوں میں مذہبی تعلیم کا وقت دیا جائے، اس کے واسطے وہ دو مہینے نینی تال میں جا کر رہے، اور آخر کو ایک حد تک کامیاب ہوئے، گورنمنٹ نے ہفتے میں دو بار نصف نصف گھنٹہ مذہبی تعلیم کے واسطے دیا ہے، اور اس کا انتظام اور نصاب درس کا رد و بدل مسلمانوں کی تجویز پر رکھا ہے۔

نواب وقار الملک نے اس کے قواعد علیحدہ چھپوا لئے ہیں جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہیں، ان کی خواہش ہے کہ ندوۃ العلماء اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے، اس کو جس طریقے سے مناسب ہو جاری کرے اور نصاب تجویز کرے لہذا میں اس کو پیش کر کے یہ تحریک کرتا ہوں کہ اس رعایت کی بابت گورنمنٹ کا اور اس کوشش کے بارے میں نواب وقار الملک کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

اس اجلاس میں مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان سے چند ذہین طلبہ کو ندوۃ العلماء کی طرف سے تکمیل علم کے لئے مصر بھیجا جائے، مولانا شبلیؒ نے اس کی تائید کی اور قوم سے علیحدہ چندہ کے لئے اپیل کی جس میں ایک سو چالیس روپے سالانہ اور بارہ سو روپے یکمشت وصول ہوئے، اس کے بعد مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی نے فرمایا:۔

"حضرات! کل ہمارے مولانا شبلیؒ نے جیسے دارالعلوم کی ضرورت آپ کے سامنے ثابت کی ہے، اس میں کچھ شبہ نہیں، اب اس کے متعلق یہ بحث پیش ہے کہ دارالعلوم قائم تو ضرور ہو مگر کہاں ہو؟ میرے نزدیک دہلی سے بہتر اس کے لئے کوئی مقام نہیں ہو سکتا، چند باتیں جو دہلی کو حاصل ہیں وہ دوسرے شہروں کو حاصل نہیں، جو دینداری اب بھی دہلی میں ہے، وہ کہیں نہیں، دنیا بھر کے وضع لباس تبدیل ہو گئے، مگر دہلی والوں کی اب بھی وہی پرانی وضع ہے، وہاں کی آب و ہوا میں خاص علم کا اثر ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین سے بڑے بڑے ذی رتبہ مشائخ پیدا ہوئے سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ دہلی ہمیشہ سے اسلامی دارالسلطنت رہا ہے، اس لئے اس کا حق تمام شہروں پر ہے، جس وقت دارالعلوم یہ کہتا ہوا اٹھے گا کہ میں تمہارے دارالسلطنت دہلی کا رہنے والا اور اس کی قدیم شان و شوکت اور علم و عمل کا تازہ کرنے والا ہوں، تم میری مدد کرو، تو اس کی یہ پر درد صدا سن کر کون ایسا شخص ہے، جس کو دارالعلوم کا کچھ خیال نہ پیدا ہوگا، بخلاف دوسرے شہروں کے کہ ان کا حق دوسرے شہروں پر نہیں، دارالعلوم کل مدارس کا بادشاہ ہوگا، تو اس کا

پایۂ تخت بھی دہلی کو ہونا چاہیئے"۔

اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے، مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوریؒ نے فرمایا: "دارالعلوم کے لئے دہلی انسب ہے، کیسے بڑے بڑے اولیاء اللہ اور علماء یہاں سے اٹھے، اور یہاں مدفون ہوئے، جن سے تمام ہندوستان فیضیاب ہوا، ہزاروں اولیاء اللہ کے اجداد کرام اسی سرزمین میں مدفون ہیں، ہر علم کا مرجع و منبع بھی یہی سرزمین ہے"۔

انگریزی پڑھائی جائے

صاحبو! جو صاحب نوکری پیشہ ہیں، ان کو ضرورت زمانہ کی وجہ سے انگریزی پڑھنا ہوتی ہے، اسی سبب سے ہمارے عزیز و اقارب بعض مدرسوں میں جا کر پڑھتے ہیں، جب وہاں سے پڑھ کر آتے ہیں تو داڑھی منڈائے، مونچھیں بڑھائے، کوٹ پتلون پہنے، ملحدانہ باتیں کرتے ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اراکین ندوہ اور معتمدین علماء اور عامۂ جلسہ نے یہ تجویز کیا کہ ایک دارالعلوم قائم ہو، اس میں سب طرح کے علم پڑھائے جائیں، منجملہ اس کے بعض کو بعد علم دین کے انگریزی سکھائی جائے یا جو انگریزی پڑھے ہوئے طلبہ ہوں ان کو اپنے دارالعلوم میں عربی پڑھائیں، تاکہ جو نقصان ان میں ہوا ہے وہ بھی دفع ہو اور غیر قوموں سے مناظرہ کرنے کی لیاقت بھی ہم پہونچے۔

صاحبو! یہ رائے میرے نزدیک بہت صائب معلوم ہوتی ہے، مگر یہ مناسب ہے کہ حدیث تفسیر اور فقہ کی کتابیں مثلاً راہِ نجات، درِ مختار، تفسیر حسینی، انگریزی میں کر دیں، اور اس کے ترجمہ کو زمرۂ علماء سے تصحیح کرا کے ان کو پڑھائیں، تاکہ انگریزی کے ساتھ مسائل سے بھی آگاہی رہے"۔

دارالعلوم کہاں قائم ہو

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام کس مقام پر ہو، اس پر ارکان نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا، اس سلسلہ میں کچھ رائیں پہلے گزر چکی ہیں، اس نشست میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے فرمایا:۔

لکھنؤ میں فائدہ ہے

"اس وقت مولانا عبدالحق صاحب نے دہلی کے جو فضائل بیان کئے ہیں، ان کا میں منکر نہیں ہوں، درحقیقت دہلی فیض کا سرچشمہ ہے اور بزرگانِ اولیائے کرام کے فیوض ظاہری و باطنی کا سب سے زیادہ میں معترف ہوں، مگر بات یہ ہے کہ دارالعلوم کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، وہ وہاں نہیں ہیں، دارالعلوم ایسے مقام پر قائم ہونا چاہئے، جہاں کے لوگوں کو علم و فضل سے دلچسپی ہو، اور وہاں کی آب و ہوا اچھی ہو، حفظ و صحت کا لحاظ بہت ضروری ہے، اور دہلی کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے، اس لئے لکھنؤ میں دارالعلوم قائم ہونا چاہئے، لکھنؤ میں قائم ہونے سے ایک فائدہ عظیم یہ ہوگا کہ اس کے نواح میں رؤساء کثرت سے ہیں، وہ اس میں بہت مدد دیں گے"۔

جواباً مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی نے فرمایا:۔

"جو کچھ مولانا سلیمان صاحب نے بیان کیا ہے اس کا باعث یہ ہے کہ آپ کو اصل حال سے واقفیت نہیں، سرکاری رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے اعتبار سے دہلی کی آب و ہوا کہیں اچھی ہے، جس قدر امراض عامہ اور وبائیہ سے موتیں لکھنؤ میں ہوتی ہیں، دہلی میں نہیں ہوتیں، اس کے علاوہ چند باتیں دہلی کو وہ حاصل ہیں جو لکھنؤ کو نہیں، جن کو میں بیان کر چکا ہوں، بالفعل

ایک مژدہ سناتا ہوں، دہلی میں نواب غازی الدین حیدر کے مدرسے کی عمارت تقریباً آٹھ لاکھ روپے کی ہے، وہ خالی پڑی ہوئی ہے، اس کے متعلق ایک جائداد بھی تھی جس سے یہ مدرسہ قائم ہوا تھا، اور اس میں مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی مدرس تھے، اس کے تعلیم یافتہ مولانا محمد قاسم صاحب ہیں، اور بڑے بڑے علماء جن کے علم و فضل کی ایک دنیا قائل ہے، یہ عمارت سرکار نظام دامت دولتہ کے اجداد کرام کی بنوائی ہوئی ہے، اور کوشش سے انشاء اللہ دستیاب ہو سکتی ہے، اس میں دار العلوم قائم کیجئے، ایسی عالیشان عمارت بنی بنائی آپ کو مل جائے گی جب اس میں دار العلوم قائم ہوگا تو امید ہے کہ نظام دامت دولتہ، اپنی سیر چشمی اور فیاضی سے اس کو دوسروں کا دست نگر نہ رکھیں گے اور اپنے اجداد کی یادگار قائم رکھنے کے لئے بہت کچھ مدد دیں گے۔"

اس تقریر کے بعد مولانا شاہ سلیمان صاحب نے کہا کہ پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ اگر دہلی کے حضرات دار العلوم سے دلچسپی رکھتے ہوں تو کیا مضائقہ ہے، اب چونکہ مولانا عبد الحق صاحب مجھ کو امید دلاتے ہیں، اس لئے میں اس خیال سے رجوع کرتا ہوں، حاضرین نے مولانا سلیمان صاحب کے رجوع کرنے پر بہت مسرت ظاہر کی اور طے ہوا کہ دار العلوم دہلی میں قائم کیا جائے۔"

اس کے بعد مولوی محمد قمر الدین صاحب مہتمم مدرسہ معینیہ درگاہ شریف اجمیر اور مولانا محمد واصل صاحب نے تقریریں کیں۔

اس کے بعد ندوے کی طرف سے رؤسائے میرٹھ کا شکریہ ادا کیا گیا، جنھوں نے ندوے کو دعوت دی اور نہایت کوشش و جانفشانی سے میزبانی کے حقوق ادا کئے۔

اجلاس میرٹھ کے موقعہ پر مختلف مقامات کی تنظیموں نے ندوۃ العلماء کو سپاسنامے پیش کئے، جن میں ندوۃ العلماء کی خدمات کو سراہا اور اپنے بھرپور تعاون و تائید کا

اعلان تھا، ان کے نام یہ ہیں:۔

انجمن معین الندوہ عظیم آباد پٹنہ، مجلس معین الندوہ بہار، مخدوم زادگان و عامۂ اہل اسلام گردولی، اہل اسلام ہوشیار پور، مسلمانان جالندھر، اہل اسلام شملہ، انجمن انوار محمدیہ امرتسر، اہل اسلام لشکر گوالیار۔

اجلاس میرٹھ کے موقع پر انجمن حمایت بیوگان اور یتیم خانہ اسلامیہ کانپور کی مختصر کارکردگی بھی سنائی گئی، اور آمد و صرف کا حساب بھی پیش کیا گیا۔

طریق فراہمی سرمایہ

قیام دار العلوم، دار الافتاء اور اشاعت اسلام کی مد میں دس بارہ لاکھ روپے سرمایہ کی ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا، اس خطیر رقم کی وصولیابی کس طرح ممکن ہے، اس پر درج ذیل تجاویز پیش ہوئیں۔

۱۔ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں میں سے (اس وقت یہی آبادی تھی) ۴ کروڑ مسلمانوں سے فی کس چار آنے وصول کئے جائیں تو ایک کروڑ روپیہ وصول ہو سکتا ہے۔

۲۔ ہر شخص اپنے اوپر لازم کرلے کہ جس وقت وہ اپنی ضرورت سے روپیہ خورد کرائے تو ایک پیسہ اس کام کے لئے علٰحدہ کر دے۔

۳۔ برادری میں اس بات پر عہد ہو جائے کہ تقریبات شادی، ختنہ، عقیقہ، نکاح وغیرہ کے موقع پر اس اہم دینی کام کے لئے بھی معتدبہ رقم دی جائے۔

۴۔ اپنی پہلی تنخواہ یا اس کا ایک حصہ ندوے کے لئے نکالیں، جیسا کہ میرٹھ کے عالی ہمتوں نے کیا ہے۔

۵۔ سوداگر اور ٹھیکیدار اپنے نفع میں سے ایک قلیل مقدار اس مذہبی خدمت کے لئے جدا کرتے جائیں۔

۶۔ مسجدوں اور عام نشست گاہوں میں مقفل امدادی صندوق رکھے جائیں۔

۷۔ لاولد مالدار مسلمان اپنی جائداد اور دیگر اموال ایسے کاموں کے لئے وقف کردیں۔

یہ چند آسان اور سہل طریقے ہیں، ان پر جا بجا عمل بھی شروع ہو گیا ہے، ندوۃ العلماء کو قائم ہوئے چار سال ہو چکے، اس کے اغراض و مقاصد کی اشاعت ہو چکی، اور اس کی آواز مسلمانوں کے کانوں تک پہونچ گئی، نوحہ خوانی کا وقت اب باقی نہیں، اب کام کرنے کا زمانہ آیا ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال
صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

اس اجلاس کی روداد میں تحریک ندوۃ العلماء کے سرپرست کی حیثیت سے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا نام نامی نمایاں ہے۔

پانچواں اجلاس

منعقدہ کانپور

۱۴ ر ۱۵ ر شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۷ ر ۸ ر مارچ ۱۸۹۸ء

۱۸۹۵ء کے مصیبت خیز قحط نے ہزاروں گھر ویران کر دیئے، اگرچہ ۱۸۹۶ء کے آخر مہینوں میں یہ ختم ہو چکا تھا، مگر ہنوز اس کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا تھا کہ بمبئی کے طاعون نے اپنے حدود سے باہر قدم نکالا، اور اضلاع پنجاب میں وارداتیں ہونے لگیں، قحط سالی اور اس کے بعد طاعون کی وبا نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، لوگ سفر سے گھبراتے تھے، حکومت نے جگہ جگہ قرنطینے لگا دیئے تھے، ایسی حالت میں اس کا اندیشہ تھا کہ ندوۃ العلماء کا عمومی اجلاس شاید کامیاب نہ ہو سکے، چنانچہ غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ صرف ارکان کا اجلاس بلایا جائے۔

یہ اجلاس ۱۴ ر ۱۵ ر شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۸ ر ۹ ر مارچ ۱۸۹۸ء میں کانپور میں منعقد ہوا، جلسہ کی باقاعدہ نشست کے بعد مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء نے تحریک کی کہ مولانا مسیح الزماں خاں صاحب استاذ حضور نظام دکن و رئیس شاہجہانپور اس جلسہ کے صدر نشین بنائے جائیں، خان بہادر منشی اظہر علی صاحب وکیل لکھنؤ نے اس کی تائید کی اور اتفاق رائے سے مولانا ممدوح صدر نشین ہوئے۔

مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کی رپورٹ مولانا سید عبدالحی مددگار ناظم ندوۃ العلماء نے صدر انجمن کی اجازت سے باآواز بلند پڑھ کر سنائی، جس میں فرمایا:۔

"ندوۃ العلماء کوئی نئی چیز نہیں ہے، جس پر رائے قائم کرنے کے لئے ہم کو صرف سلسلۂ خیالات سے کام لینا پڑے، بلکہ جس طور سے دنیا میں تمام کاموں کے نتیجے نکالنے میں علل اور اسباب پر غور کرنے اور اس کے نظائر کے حالات کی تفتیش کرنے کی حاجت ہوتی ہے، اسی طرح سے اس کے لئے بھی انھیں چیزوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اعتراضات کا جواب

۱۔ اب ندوۃ العلماء کے حالات پر غور کیجئے، اس کے قائم کرنے والے وہ حضرات ہیں جو دنیوی حیثیت سے ذی وجاہت اور ممتاز نہیں بلکہ انقلاب زمانہ اور بدنصیبی سے قوم کی نگاہیں ان پر بُری پڑنے لگی ہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی وہ عزت نہیں رہی جو دینی حیثیت سے ان کی ہونی چاہئے۔

۲۔ دوسرے ندوۃ العلماء نے جن چیزوں پر زور دینا چاہا ہے، وہ ایک حد تک دیرینہ خیال حضرات کے سمجھ میں نہیں آئیں، اس وجہ سے وہ لوگ اس سے علٰحدہ رہے۔

۳۔ تیسرے ندوۃ العلماء کی تمام کارروائیاں چونکہ مذہبی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے گورنمنٹ اس کی حمایت میں حصہ نہیں لے سکتی۔

۴۔ چوتھے ندوۃ العلماء کے مقاصد دنیوی حیثیت سے ایسے نہیں جن کی طرف سب کا رجحان ہو۔

۵۔ پانچویں ندوۃ العلماء ایسے زمانہ میں قائم ہوا ہے کہ ہر ایک جگہ انجمنیں، سوسائٹیاں بکثرت موجود ہیں، اور مقامی ضرورتیں اس میں روپیہ دینے سے

لوگوں کو باز رکھتی ہیں۔

ان سب باتوں پر نظر رکھنے کے بعد یہ الزام جو ندوۃ العلماء پر قائم کیا جاتا ہے، بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے، تاہم میں کہتا ہوں کہ اس قلیل مدت میں ندوۃ العلماء نے جو کام کیا ہے، وہ بجائے خود اس قدر ہے جو بڑی سے بڑی انجمنیں وسیع مدت میں نہیں کر سکتیں۔

ندوہ کا کارنامہ

اب آپ ندوۃ العلماء کے مقاصد پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہیں، اس کے سب سے بڑے دو مقصد ہیں: اول اصلاح نصاب و ترقی تعلیم۔ دوم رفع نزاع باہمی۔

طریقۂ تعلیم جس پر آپ بحث کر رہے ہیں کم و بیش دو سو برس سے نصاب موجودہ کے ساتھ رائج ہے، ہزاروں علماء و فضلاء جو ہمارے معتقد علیہ اور دینی و دنیوی حیثیت سے ہمارے مقتدا اور امام تھے، اس نصاب کے تعلیم یافتہ گزرے اور اس وقت جس قدر علماء موجود ہیں، وہ سب اسی نصاب کے موافق تعلیم یافتہ ہیں، اور تمام اہل اسلام جن کے قلوب میں علماء کی عظمت ہے، وہ انھیں کے پیرو و مقلد ہیں، اس وجہ سے اس نصاب پر تمام علماء و عامۂ اہل اسلام کو پورے طور پر وثوق اور اطمینان ہے پس ایسی حالت میں نصاب موجودہ کو قابل اصلاح سمجھ کر تغیر و تبدل کی کوشش کرنا آسان کام نہیں ہے، جو لوگ ندوۃ العلماء پر یہ الزام قائم کرتے ہیں کہ اس نے کئی برس کی غور و فکر کے بعد بھی نصاب تیار نہیں کیا وہ اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

دوسرے مقصد کو لیجئے، اتفاق اور رفع نزاع باہمی۔

ظاہر میں یہ نہایت دلکش الفاظ ہیں، مگر اس کے حاصل کرنے میں جو دقتیں اور

مصیبتیں ہیں، ان سے انھیں کا دل خوب واقف ہوگا، جنھوں نے کبھی دنیا میں کسی بڑے کام کرنے کا ارادہ کیا ہو۔

دو انتہا پسند طبقے

اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو مسلمانوں کی تعلیمی اور اخلاقی حالت کی تفتیش کرنی چاہیئے، امراء کی نسبت کسی قدر میں کہہ چکا ہوں، اور کچھ اب بیان کرتا ہوں، اب تک عربی کی نسبت ہندوستان کے مسلمان دو قسم کے خیال رکھتے تھے، ایک وہ جو نئی روشنی والوں کے لقب سے مشہور ہیں، وہ اس کو مہمل، بے کار، غیر ضروری سمجھتے اور عربی علوم حاصل کرنے والوں کو احمق جانتے تھے، دوسرے جو دیرینہ خیال کے نام سے مشہور ہیں، اور جن پر عربی تعلیم کا مدار ہے، ان کو چند دنوں پیشتر موجودہ نصاب اور طرز تعلیم کے ساتھ حسن عقیدت تھی، جو اس میں تغیر و تبدل کو احداث فی الدین سے کم نہیں جانتے تھے، ندوۃ العلماء جب قائم ہوا تو اس نے ان دونوں کی اصلاح کرنی چاہی، اس لئے اس نے اپنا ایک مقصد اصلاح و تقاضائے ترقی تعلیم کو قرار دیا، الحمدللہ کہ ندوۃ العلماء چند دنوں میں بہت کچھ کامیاب ہوا جس کی توقع مشکل سے کی جاتی تھی، اس نے دونوں فرقوں میں قبولیت پیدا کی اور اپنے فرائض کو بہت ذمہ داری سے انجام دیا، ندوۃ العلماء نے اس تھوڑی سی مدت میں وہ کامیابی حاصل کی جس کو دوسری انجمنیں زمانہ دراز میں بھی نہیں کر سکتی تھیں، اور ہم کو امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس طور پر رفتہ رفتہ ندوۃ العلماء کے اثر سے ملک و قوم کے سامنے ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ یہ تمام جھگڑے اور نزاعیں ایک بے وقعت افسانہ سمجھی جائیں گی، میں اس مقام پر اس کی چند نظیریں سرسری طور پر پیش کرتا ہوں۔

باہمی اختلافات میں کمی

سب جانتے ہیں کہ ایک مدت سے تقلید اور عدم تقلید کے جھگڑے کس زور و شور سے برپا ہیں، جن کی وجہ سے بڑے بڑے ہنگامے ہوئے، عدالت فوجداری تک نوبت پہونچی اور لوگوں کو سزائیں ہوگئیں، اسی طرح سے عدالتہائے دیوانی میں آمین بالجہر اور رفع یدین کے مقدمے دائر ہوئے، علماء اور کتب مقدسہ کی آبروریزی ہوئی، یہاں تک کہ لڑتے لڑتے ولایت تک مقدمے پہونچے، مگر الحمد للہ جب سے ندوۃ العلماء قائم ہوا ہے، اور اس نے نزاعوں سے اپنی ناراضامندی ظاہر کی، اس وقت سے اب تک کوئی نزاع نہیں پیدا ہوئی اور تمام مسلمان اس جھگڑے سے نہایت امن و آسائش میں بسر کر رہے ہیں۔

مولانا شاہ امانت اللہ صاحبؒ اور مولانا ابو محمد ابراہیم بانی مدرسہ احمدیہ آرہ کے درمیان ندوۃ العلماء نے صلح کرادی، اور پورب کے سب ہنگامے فرو ہوگئے، ندوۃ العلماء کا یہ کارنامہ معمولی نہیں۔

علاوہ ان سب امور کے ندوۃ العلماء کی یہ برکت کیا کم ہے کہ اب تک علماء کی جماعت میں ربط و اتحاد کا کوئی خاص سلسلہ نہ تھا، اور غالباً اسی کی وجہ سے مناظروں میں سختی اور بے مروتی سے نزاعیں پیدا ہو جاتی تھیں، اب ندوۃ العلماء کی وجہ سے یہ بات جاتی رہی اور جو علماء سال میں ایک بار جمع ہو جاتے ہیں، ان میں ایک خاص قسم کا ربط و اتحاد پیدا ہو گیا ہے، اور جو بدگمانیاں نہ ملنے کی وجہ سے پیدا ہوتی تھیں، وہ دور ہو گئی ہیں، اس لئے اب ان کی جانب سے ایک دوسرے سے منافرت پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ جب تک ان میں اتحاد باقی رہے گا، مسلمانوں میں نفاق پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

بعض ناعاقبت اندیش حضرات نے ندوۃ العلماء کی جو کچھ مخالفت کی اور علماء کی تذلیل کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، اس کے جواب میں ندوۃ العلماء نے نہایت متانت اور عالی حوصلگی سے کام لیا ہے، جن ارکان کی تذلیل و تضلیل کی گئی ہے وہ تحریر و تقریر میں بہت نام آور ہیں، اگر انھوں نے بھی ذاتی طور پر ندوۃ العلماء کی منظور شدہ تجویز کے خلاف نہیں کیا، یہ قابل تقلید کارنامہ ہے۔

ان سب باتوں پر غور کرنے سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ چار برس کے عرصہ میں ندوۃ العلماء نے جو کچھ قبولیت حاصل کرلی ہے، وہ کچھ کم نہیں ہے، اس لئے ہم امید کرسکتے ہیں، کہ ندوۃ العلماء کے ارکان اگر مستعدی اور جانفشانی سے کام کرتے رہے تو ایک زمانہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ تمام تعلیمی و اخلاقی نقائص دفع ہوجائیں گے، اور مسلمانوں کو روحانی زندگی حاصل ہوگی۔

اجلاس میرٹھ کی تجاویز کا جائزہ

پہلی تجویز جلسۂ عام میرٹھ میں یہ منظور ہوئی تھی کہ انگریزی خواں طلبہ کو وظائف دے کر عربی اور دینیات کی تعلیم دی جائے، تاکہ وہ اصول و عقائد سے واقف ہوکر ندوے کی طرف سے ممالک غیر میں اشاعت اسلام کے لئے بھیجے جائیں، جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۲۶ محرم الحرام ۱۳۱۵ھ میں یہ طے ہوا تھا کہ ــــــ چونکہ ندوۃ العلماء نے اپنے خاص اہتمام سے اب تک کوئی مدرسہ جاری نہیں کیا، اس لئے ایسے طلبہ کا مدارس اسلامیہ میں سے کسی مدرسہ میں انتظام کیا جائے، لیکن مدارس اسلامیہ کے حالات کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ اس قسم کی تعلیم و تربیت کے لئے آمادہ نہیں ہیں، جس طرح ندوۃ العلماء چاہتا ہے، اس وجہ سے اس سال تجویز کا نفاذ عملی صورت میں نہ ہوسکے گا۔

دوسری تجویز یہ منظور ہوئی تھی کہ اشاعت اسلام کی کارروائی اس طریقے سے شروع

کردی جائے کہ چند واعظان اضلاع میں مقرر کئے جائیں جہاں کے باشندے احکام اسلام سے ناواقف ہیں۔ اس تجویز کے پیش نظر اس سال چار واعظوں کا تقرر منظور ہوا تھا لیکن چند ہی روز میں ایسے اسباب پیش آئے جن کی وجہ سے ملک میں ایک قسم کی شورش پیدا ہو گئی اور ہر کام میں بدگمانی ہونے لگی اس لئے مجبوراً اس تجویز کو اس وقت تک ملتوی کیا گیا جب تک ارکان انتظامی اس کو مناسب سمجھیں۔

(۴) ندوۃ العلماء کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کا کام ندوۃ العلماء کے وفود ملک کا دورہ کرکے کریں گے۔

(۵) دارالافتاء میں امسال گذشتہ سال کی بہ نسبت زیادہ فتاوی مرتب کئے گئے امسال ۵۶۵ استفتاء کے جوابات دیئے گئے جن میں ۴۷ فتوے نہایت مشکل اور پیچیدہ تھے ان کے علاوہ ۲۳ مسئلوں کی بطور خود تحقیقات کی گئی۔

(۶) ندوۃ العلماء کی نگرانی میں ۳ شوال ۱۳۳۱ھ کو کانپور میں جو یتیم خانہ اسلامیہ کھولا گیا تھا اس کی طرف اس سال خاص توجہ کی گئی، اب بفضلہ تعالیٰ وہ روز بروز ترقی کر رہا ہے اس وقت اس میں ۴۳ بچے ہیں، جن میں ۲۵ لڑکے اور ۱۸ لڑکیاں ہیں، ان کی تعلیم و تربیت کے لئے اتالیق اور مدرس مقرر ہیں، ان بچوں کو صنعت و حرفت سکھانے کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

(۷) امسال بھی مختلف مقامات پر مجلس معین الندوہ قائم ہوئیں جن میں قابل ذکر اورنگ آباد ضلع گیا (بہار) کی انجمن معین الندوہ ہے۔

(۸) ارکان ندوۃ العلماء کی تعداد امسال خاصی بڑھ گئی، چنانچہ اس سال ۱۰۱۵ ارکان ہیں۔

(۹) ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لئے اس سال دورے نہیں ہوئے بین خط و کتابت کے ذریعہ بڑی تعداد سے رابطہ قائم کیا گیا۔

بشری طاقتوں کا مجموعہ

حضرات! ندوۃ العلماء کو لوگوں نے اگر کیمیاء گر سمجھ لیا تھا تو یہ ان کی خوش فہمی ہے اور اگر اس کو زیادہ سے زیادہ بشری طاقتوں کا ایک مجموعہ خیال کیا تھا تو بے شک طاقتِ بشری کے موافق ندوۃ العلماء نے بہت کچھ کر دیا ہے اور کرے گا، خدا کو منظور ہے تو اس کی تجویزیں ایک دن پوری ہو جائیں گی، اگر خدانخواستہ پوری نہ ہوئیں تو بھی ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، اور بقدر ہماری نیتوں کے اس کا ہم کو ثواب ملے گا۔

تجویز مقام دار العلوم

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے تحریک پیش کی کہ دار العلوم بجائے دہلی کے لکھنؤ میں قائم کیا جائے، اس تحریک کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:۔

"ندوۃ العلماء کو قائم ہوئے اب کئی برس ہو گئے اور اس کے اجلاسوں میں متعدد تجویزیں منظور ہوئیں لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک ان تجاویز کے متعلق ایسی کارروائی نہیں کی گئی، جو اس کے شایانِ شان ہو، ندوۃ العلماء نے جو تجویزیں پیش اور پاس کی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہتمام بالشان دار العلوم قائم کرنا ہے، میری رائے میں اس جلسے کو اور تمام ارکان ندوۃ العلماء کو اپنی توجہ دار العلوم کی جانب مبذول فرمانی ضروری ہے، گذشتہ سالانہ جلسے میں یہ امر زیر بحث تھا کہ دار العلوم کہاں قائم کیا جائے، اور یہ طے ہوا کہ دار العلوم دہلی میں قائم ہو، مگر سال بھر گزرنے پر بھی ہم اپنی تحریکوں کا اثر دہلی میں نہیں پاتے اور ہم میں اکثر وہاں عملی کارروائی کرنے سے قاصر ہیں، اور حق یہ ہے کہ جب تک متفقہ کوشش اس کام میں جانفشانی نہ کرے اس وقت تک دو چار ارکان اگرچہ کیسے ہی ذی اثر اور وقیع کیوں نہ ہوں اس بارِ عظیم کے متحمل نہیں ہو سکتے اور بے شک ان کے سر اتنا بڑا بوجھ رکھ دینا انصاف سے

بعید ہے یہ اسباب ہم کو بے دست و پا کر رہے ہیں کہ ہم کو فوراً عملی کارروائی شروع کر دینے کی ضرورت ہے، لہٰذا میں رائے دیتا ہوں کہ دارالعلوم کے قیام کے لئے ہم کو افسوس و حسرت کے ساتھ شاہجہاں آباد دہلی سے اپنا خیال ہٹا لینا چاہئے اور دوسرے موقع کو پسند کرنا ضرور ہے لکھنؤ کا نام ہمیشہ دہلی کے ساتھ اس تجویز میں لیا گیا ہے، اور میرے خیال میں لکھنؤ میں ایسے اسباب مہیا ہیں جن سے ہم جلد کام لے سکتے ہیں، اور میری ناقص رائے میں اگر اس جلسے نے یہ مقام منظور کر لیا تو ہم اسی ہفتے میں اپنے آپ کو دارالعلوم کی عملی کارروائی کے میدان میں پائیں گے، لہٰذا میں یہ گذارش کرتا ہوں کہ بجائے دہلی کے لکھنؤ دارالعلوم کے قیام کے لئے منظور فرمایا جائے۔

مولانا شروانی کی تقریر کے بعد مولانا غلام محمد فاضل ہوشیارپوری نے تقریر کی اور اس پر زور دیا کہ ندوۃ العلماء کا مجوزہ دارالعلوم دہلی میں قائم کیا جائے، ان کے بعد مولانا حکیم سید عبدالحئی مدظلہ ناظم نے تقریر فرمائی:۔

مدرسہ سرسبز و شاداب رہ سکے

"دارالعلوم کے لئے کسی مقام کا انتخاب آسان نہیں ہمیں ایسا مقام منتخب کرنا چاہئے جہاں مدرسہ سرسبز و شاداب رہ سکے اس کیفیت کی طرح نہ مرجھا جائے جو چند روز لہلہا کر آخر زمین کی ناموافقت اور مزارعین کی غفلت اور پانی کی قلت و نایابی کی وجہ سے مرجھا کر رہ گیا ہو، اس لئے منتظمین ندوۃ العلماء کو بہت غور و فکر سے اس کی بنا ڈالنی چاہئے ایسے عظیم الشان کاموں میں اس بات کی پابندی نہ کرنی چاہئے کہ پہلے اس کی نسبت کوئی امر طے ہو چکا ہے، اسی وجہ سے مولوی اعظم حسین صدیقی خیرآبادی نے باوجودیکہ دہلی میں دارالعلوم قائم کرنے کے محرک وہی تھے اپنی سابقہ تجویز کو واپس لے لیا ہے، دہلی باعتبار مرجعیت اور وضعداری کے دوسرے شہروں سے مرجح ہے مگر ان دقتوں کے لحاظ سے جو وہاں دارالعلوم قائم کرنے کے ساتھ پیدا ہوں گی، دارالعلوم کو صرف خیالی دارالعلوم رکھیں گی۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا سید محمد علی ناظم ندوۃ العلماء جن سے زیادہ کسی کو اس کے ساتھ

دلسوزی نہیں ہے، جہاں رہ کر اس کام کو کر سکیں وہیں دارالعلوم قائم کیا جائے اور اس کی پرواہ نہ کی جائے کہ پہلے کیا تجویز ہو چکا ہے کیونکہ یہ کوئی فرضی اور خیالی تجویز نہیں ہے، یہ عملی کارروائی ہے، جس کو سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے تاکہ آئندہ کوئی دقت پیش نہ آئے"

تجویز پر اظہار خیال فرماتے ہوئے مولانا محمد علی مونگیریؒ نے فرمایا:-

"میرے نزدیک اس تجویز کا ملتوی کرنا غیر مفید اور نامناسب ہے، دارالعلوم کے لئے اسی وقت کوئی مقام طے کر دیا جائے، خواہ دہلی ہو یا لکھنؤ تاکہ بلا انتظار اس کی کارروائی شروع کر دی جائے"

لکھنؤ کا فیصلہ

صدر انجمن نے فرمایا کہ "اس مسئلہ پر بہت بحث و گفتگو ہو چکی ہے اس لئے اب رائیں لے کر کثرت رائے پر فیصلہ ہو جائے، چنانچہ سب سے پہلے اس پر رائیں لی گئیں کہ دارالعلوم دہلی میں قائم کیا جائے یا لکھنؤ میں ـــــ اکثریت نے لکھنؤ کے حق میں فیصلہ دیا، صدر انجمن مولانا مسیح الزماں خاں صاحب نے اعلان فرمایا کہ "کثرت آراء سے یہ فیصلہ ہو گیا کہ دارالعلوم لکھنؤ میں قائم ہو، خدا کو اس میں کچھ بہتری منظور ہے، اب ارکان ندوۃ العلماء کو نہایت محنت و کوشش سے کام شروع کرنا چاہیئے"

مولوی مفتی رحیم بخش صاحب مدرس الموڑہ نے تحریک کی کہ اب ہم سب کو دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اسی میں خاطر خواہ کامیابی عطا فرمائے اس کے بعد تمام حاضرین نے الحاح و زاری کے ساتھ دعا کی۔

تجویز افتتاح درجۂ ابتدائی

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کا

درجۂ ابتدائی وسیع پیمانے پر کھولا جائے، اس کے بعد بتدریج دوسرے درجات کھولے جائیں، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ نے اس تحریک کی تائید کی کہ آج کا کام کل پر نہ اٹھا رکھا جائے، تمام حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ جب تک دارالعلوم کی ذاتی عمارت نہیں بنتی اس وقت تک کے لئے کرائے کے کسی عمدہ مکان میں دارالعلوم شروع کر دیا جائے۔

علماء پر ایک الزام کا عملی جواب

مولانا سید محمد علی مونگیری نے یہ تحریک پیش کی کہ مجوزہ دارالعلوم کے ابتدائی درجہ کے ایک سال کے مصارف کا اسی وقت انتظام ہونا چاہیئے، منشی اظہر علی صاحب نے اس کی تائید کی، مولانا شبلی نے فرمایا کہ "علماء کو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپے سے نہیں کرتے، اس واسطے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ درجۂ ابتدائی کے مصارف ارکان ندوۃ العلماء ادا کریں" مولانا مسیح الزماں خاں صاحب نے اس کی تائید کی، چنانچہ حسب ذیل علماء نے اس کے لئے چندہ پیش کیا، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب ۲۰۰ روپے، مولانا یونس خاں صاحب ۲۰۰ روپے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی ۱۲۵ روپے، مولانا شبلی نعمانی ۱۰۰ روپے، مولانا سید محمد علی مونگیری ۵۰ روپے، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری ۵۰ روپے، مولانا شاہ ابوالخیر غازیپوری ۵۰ روپے، مولانا مشتاق علی ۲۵ روپے، مولانا رونق علی ۲۵ روپے، مولوی محمد داؤد وکیل ۲۵ روپے، مولوی مفتی رحیم بخش صاحب ۲۵ روپے، اس طرح علمائے کرام کے اس بابرکت چندے سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی۔

۱۸۹۸ء میں روپئے کی جو قیمت تھی اس اعتبار سے اہل علم کی یہ قربانی قابل لحاظ ہے، پھر اس میں جو جذبہ اور خلوص کارفرما تھا، اس کی قدر و قیمت کا اس دنیا میں اندازہ نہیں کیا جا سکتا

ان گیارہ ناموں میں نو نام علماء کے ہیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ "حیات شبلی" میں یہ نام نقل کرکے تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہ فہرست دو غرض سے یہاں نقل کی گئی ہے، اس زمانہ تک علماء میں کس قدر باحیثیت اصحاب موجود تھے، جو اس قسم کی تحریک کے لئے لبیک کہنے کو تیار رہتے تھے، اور آج ذی حیثیت لوگوں میں علم دین کی کتنی کمی آگئی ہے، دوسری غرض ان بزرگوں کے ناموں کو زندہ کرنا ہے، جنھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اس عظیم الشان تجویز کو عمل میں لانے کے لئے سب سے پہلے سبقت فرمائی" جزاھم اللہ تعالیٰ"

اس کے بعد مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے یہ تحریک پیش کی کہ ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک وفد رؤسائے لکھنؤ کی خدمت میں بھیجا جائے جو وہاں پہونچ کر زمین حاصل کرے اور فی الحال کام شروع کرنے کے لئے کوئی مکان پسند کرے ـــــ مولانا شبلی نے اس کی تائید فرمائی اور باتفاق آراء یہ تجویز منظور ہوئی اس وقت ایک وفد کی تشکیل ہوئی جس میں یہ حضرات تھے، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا محمد یونس خاں صاحب دتاولی، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری، مولانا حفیظ اللہ صاحب، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری اور مولانا شبلی نعمانیؒ

ایک تجویز گورنمنٹ اسکول کانپور کے طلبہ کو دینیات کی تعلیم دینے کے سلسلے میں تھی، ندوۃ العلماء اس تعلیم کا بندوبست کرے، حکومت نے بھی یہ درخواست منظور کرلی ہے، تجویز کے محرک مولانا حکیم سید عبدالحیؒ تھے، اس کی تائید کرتے ہوئے مولانا شبلیؒ نے فرمایا "میرا قیام اگر کانپور میں ہوتا تو میں نہایت خوشی سے اس کو قبول کرلیتا، انھوں نے مولانا عبداللطیف صاحب

مفتی ندوۃ العلماء سے یہ درخواست کی کہ وہ یہ خدمت انجام دیں، مفتی صاحب نے بخوشی اس کو منظور کر لیا۔

۱۵ شوال کو تیسری نشست میں مولانا عبدالحی صاحب نے یتیم خانہ اسلامیہ کانپور کی رپورٹ پیش کی، بعد مولانا شبلی نعمانی نے شاہ امانت اللہ فصیحی خانپوری کی وفات پر تعزیتی تقریر کی اور فرمایا "مولانا مرحوم میں ایسی بہت سی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ علماء میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، وہ جس عظمت و شان، بلند نظری اور عالی حوصلگی سے بسر کرتے تھے اس سے اسلامی شان کا جلوہ نظر آتا تھا" اس کے بعد مولانا مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔

وفد کی لکھنؤ روانگی

ندوۃ العلماء کے مجوزہ دارالعلوم کے لئے لکھنؤ میں مناسب قطعۂ زمین کے معائنہ کے لئے ایک وفد ۱۶ شوال ۱۳۱۵ھ روز پنجشنبہ ۱۰ مارچ ۱۸۹۸ء کانپور سے لکھنؤ روانہ ہوا، وفد ان ارکان پر مشتمل تھا مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب، مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی، مولوی حاجی محمد یونس خاں صاحب، مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارنپوری، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری، مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب، مولوی غلام محمد صاحب ہشیارپوری، اسی تاریخ کو ۱½ دن کو وفد لکھنؤ پہونچ کر خاں بہادر منشی اطہر علی وکیل و آنریری مجسٹریٹ لکھنؤ کا مہمان ہوا، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری فرزند منشی امتیاز علی صاحب مرحوم وزیر بھوپال کو وفد کی اطلاع ہو چکی تھی، اس لئے وہ خیر مقدم کے لئے موجود تھے، ارکان وفد نے ان سے مل کر مدعا کی تجویز سے مطلع کیا اور خواہش ظاہر کی کہ کوئی وسیع قطعہ زمین کا جو دارالعلوم کی تمام ضرورتوں کو کافی ہو اور شہر کی آبادی سے دور ہو، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے عنایت کریں

منشی احتشام علی صاحب نے کشادہ دلی سے کہا کہ شہر سے متصل میری مقبوضہ زمینیں ہیں، وہیں ایک بروہ حسن باڑی جو شہر کی مغربی جانب واقع ہے، دوسری وہ زمین جو آفاق باغ سے متصل ہے، وفد نے اسی وقت موقع پر پہونچ کر زمینوں کو دیکھا اور بروہ حسن باڑی کی زمین پسند کی، دوسرے دن لکھنؤ ہی میں مجلس انتظامی کا جلسہ مولانا حافظ عبدالمجید صاحب فرنگی محلی کی صدارت میں ہوا، جس میں حاجی شیخ قادر بخش صاحب رئیس فیض آباد کی تحریک اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی تائید سے یہ تجویز منظور ہوئی کہ دارالعلوم کے متعلق ابتدائی کارروائیوں کے اہتمام کے لئے درج ذیل حضرات کی ایک کمیٹی بنائی جائے، مولانا حافظ عبدالمجید صاحب فرنگی محلی، مولانا عبدالرؤف صاحب فرنگی محلی، خان بہادر منشی اطہر علی صاحب وکیل، منشی احتشام علی صاحب، راجہ تصدق رسول خاں صاحب تعلقدار جہانگیر آباد، مولوی حکیم عبدالعزیز لکھنوی، خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب رئیس سندیلہ، مولوی عبدالعلی آسی مدراسی، سید حسن شاہ لکھنوی، اس مجلس کا نام "معین مجلس اشاعت العلوم" قرار پایا، اور منشی احتشام علی رئیس کاکوری اس کے سکریٹری مقرر ہوئے، نقشۂ دارالعلوم کے سلسلہ میں یہ طے پایا کہ اس کی تیاری کا بندوبست معین مجلس اشاعت العلوم کے ذمہ ہے۔

اسی جلسہ میں باتفاق آراء مولانا شاہ امانت اللہ مرحوم کی جگہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مجلس اشاعت العلوم کے معتمد مقرر ہوئے۔

آخر میں منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے ایک پرفضا اور وسیع زمین عطا کی۔

افتتاح دارالعلوم ندوۃ العلماء

لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے فیصلے اور اس کی مستقل عمارت کے لئے

زمین کے انتخاب کے بعد چونکہ اس زمین میں تعمیر کے لئے کافی وقت درکار تھا، اور گذشتہ جلسۂ مجلس انتظامی میں یہ طے کر دیا گیا تھا کہ دار العلوم کے ابتدائی درجات کافی الفور افتتاح کر دیا جائے، اس لئے منشی احتشام علی صاحب کاکوروی نے محلہ گولہ گنج میں واقع خاتون منزل نامی ایک عمارت نو ہزار روپے میں خرید کر ندوے کے حوالہ کر دی، ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء تک ندوۃ العلماء کا مرکزی دفتر کانپور ہی میں تھا اس فیصلہ کے بعد کہ دار العلوم کو لکھنؤ میں کھلنا ہے اور اس کے افتتاح کے لئے عارضی مکان بھی خرید لیا گیا، ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ مطابق ۲ ستمبر ۱۸۹۸ء کو ندوہ کا دفتر کانپور سے لکھنؤ منتقل ہو گیا، اور اس کے بعد ۹ جمادی الآخرہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۸۹۸ء کو اسی خاتون منزل میں دار العلوم کا عملی افتتاح ہو گیا، اور اس کے ابتدائی درجات کھل گئے، ۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۶ھ مطابق ۴ اکتوبر ۱۸۹۸ء کو اس افتتاح کے اعلان کی تقریب ایک عظیم الشان جلسہ کی شکل میں اسی نئے مکان میں منعقد ہوئی، اس جلسہ میں ممتاز اہل علم اور سربرآوردہ حضرات بڑی تعداد میں شریک ہوئے، افتتاح دار العلوم ندوۃ العلماء کی روداد میں ایسے ایک سو پچیس[۱۲۵] ممتاز شرکاء کی نام بنام فہرست ہے، جن میں یہ حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

۱۔ مولانا عین القضاۃ صاحب شاگرد رشید مولانا عبد الحی فرنگی محلی۔

۲۔ مولانا حافظ ابو الغناء عبد المجید صاحب نبیرۂ حضرت بحر العلوم۔

۳۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی۔

۴۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی۔

۵۔ مولانا شاہ ابو الخیر غازیپوری۔

۶۔ مولانا مسیح الزماں خاں شاہجہانپوری۔

۷۔ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری۔

۸۔ مولانا حفیظ اللہ صاحب۔

۹۔ مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنوی۔

۱۰۔ مولانا عبدالعلی آسی مدراسی۔

۱۱۔ مولانا محمد ادریس نگرامی۔

۱۲۔ مولانا شاہ منور علی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ۔

۱۳۔ مولانا محمد ایوب پھلواروی۔

۱۴۔ مولانا مفتی عبداللطیف۔

۱۵۔ مولانا سید عبدالحی حسنی

۱۶۔ مولانا عبدالشکور کاکوروی۔

۱۷۔ منشی اطہر علی صاحب۔

۱۸۔ منشی احتشام علی صاحب۔

۱۹۔ مولوی حکیم عبدالعزیز لکھنوی۔

۲۰۔ محمد نسیم صاحب وکیل ہائی کورٹ۔

۲۱۔ شیخ مشیر حسین صاحب تعلقدار گدیہ۔

۲۲۔ شیخ قادر بخش آنریری مجسٹریٹ۔

۲۳۔ شیخ اصغر علی تاجر عطر لکھنؤ۔

ندوۃ العلماء اور انگریز حکام

اس تقریب میں انگریز حکام مسٹر ہارڈی کمشنر اور مسٹر گری صاحب ڈپٹی کمشنر نے بھی شرکت کی، جن کا استقبال غیر علماء ارکان منشی اظہر علی صاحب، منشی احتشام علی صاحب اور حکیم عبدالعزیز صاحب نے کیا، ندوۃ العلماء کے ابتدائی دور کی بعض تجاویز میں حکومت کے لئے اظہار تشکر، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عمارت کا انگریز گورنر کے ہاتھوں سنگ بنیاد، ایک خاص تعداد کے لئے خلجان کا باعث ہوتا ہے اس لئے آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس دور کے حالات اور ارکان ندوۃ العلماء کے موقف پر روشنی ڈالتے چلیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو جن آزمائشوں سے گزرنا پڑا، اس کا تفصیلی ذکر اوپر آچکا ہے، انگریز حکمراں مسلمانوں کی ہر قسم کی سرگرمی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، خاص طور پر کسی ایسی جماعت سے جس کی قیادت علماء کے ہاتھ میں ہو، اُسے اپنا اقتدار خطرے میں نظر آتا تھا، کیونکہ انگریز جانتے تھے کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد اور دین و ضمیر کی آزادی کے لئے سرفروشی کا جذبہ اسی طبقہ کی وجہ سے زندہ ہے اور یہ جذبہ علماء ہی کے ہاتھوں پروان چڑھتا ہے، نشو و نما پاتا ہے، ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور جنگ شاملی کی شکست کے بعد اس معرکہ کی قیادت کرنے والے علماء نے ایک نئے محاذ کی تیاری شروع کر دی، دارالعلوم دیوبند کا قیام اسی (STRATEGY) کی ایک کڑی ہے، یہ پسپائی اور خود سپردگی نہیں تھی بلکہ ایک نئی منصوبہ بند صف آرائی تھی، تحریک ندوۃ العلماء کے روشن دماغ بانیوں کی دوررس نظر نے بھی اس حکمت عملی کو پیش نظر رکھا، ایک مستحکم حکومت و اقتدار سے مسلح معرکہ آرائی اور کشمکش و بغاوت مسئلہ کا حل نہ تھا، اس میں ناکامی کا زخم بھی تازہ تھا، حالات دیرطلب اور دوررس منصوبے کے متقاضی تھے، ان مخلصین نے ملت کی توانائی

کو بے جا صرف کرنے کے بجائے اس میں اضافہ کی کوشش، ملت کی صفوں میں اتحاد اور دین و علم سے آراستگی کو اپنی جد و جہد کا موضوع بنایا، دار العلوم دیوبند اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے بانیوں کے فکر و عمل کا سرچشمہ ایک ہی تھا، مولانا سید سلیمان ندوی کے گہربار الفاظ میں:۔

"دلی میں اسلامی حکومت کا آفتاب جب ڈوب رہا تھا تو اسی کے مطلع سے اسلام کا ایک اور آفتاب طلوع ہو رہا تھا، یہ شاہ ولی اللہؒ کا خانوادہ تھا، سچ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی پیشین گوئی کے مطابق اس کے بعد جس کو جو کچھ ملا اسی دروازے سے ملا، ہندوستان میں ردِّ بدعت کا ولولہ، ترجمۂ قرآن پاک کا ذوق، صحاح ستہ کا درس، شاہ اسماعیل اور مولانا سید احمد بریلوی کا جذبۂ جہاد، فرق باطلہ کی تردید کا شوق، دیوبند کی تحریک، ان میں سے کون چیز ہے جس کا سررشتہ اس مرکز سے وابستہ نہیں"[1]

تحریک ندوۃ العلماء کا علمی اور روحانی سلسلہ بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خانوادہ سے جا ملتا ہے، مارہرہ ضلع ایٹہ کے مردم خیز قصبہ کے مولوی بزرگ علی صاحب دہلی جا کر اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے جو شاہ عبد العزیز صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحب کی درس گاہوں میں بہہ رہا تھا۔

مولانا بزرگ علی صاحب کے آغوش میں جو ہونہار پلکر بڑھے ان میں دیوہ ضلع بارہ بنکی کے ایک سعادتمند مفتی عنایت احمد صاحب تھے، مفتی صاحب ابتدائی کتابیں دوسرے علماء سے پڑھ کر دلّی گئے اور شاہ اسحاق صاحبؒ سے حدیث کا درس لیا اور وہاں سے علی گڑھ آکر مولانا بزرگ علی صاحب سے تکمیل کی اور وہیں مدرس ہو گئے، ان کے حلقۂ درس میں پلکھنہ ضلع علی گڑھ سے ایک صاحبزادے آکر درس میں داخل ہوئے، جن کو آگے چل کر دنیا نے

---

[1] حیات شبلی ص ۲۹۹-۲۹۸

استاذ العلماء مفتی لطف اللہ صاحب کے نام سے جانا۔

علی گڑھ میں مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کے درس کا فیض ۱۲۸۹ھ سے ۱۳۱۲ھ تک ۲۷ برس مسلسل جاری رہا، ندوۃ العلماء کے اکثر بانی ارکان کو مولانا لطف اللہ صاحبؒ سے شرف تلمذ حاصل ہے، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی و ناظم ندوۃ العلماء، مولانا عبدالحق حقانیؒ مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا مفتی عبداللطیف صاحب، مولانا نور محمد پنجابی، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، یہ وہ حضرات ہیں، جن کا نام تحریک ندوۃ العلماء کے ضمن میں بار بار آتا ہے، یہ سب حضرات مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کے تلامذہ میں تھے، مولانا لطف اللہ صاحب کی دو اور خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں، ایک یہ کہ انھوں نے عمر بھر کسی کی تکفیر نہیں کی، دوسری یہ کہ اپنے کانپور کے قیام ہی کے زمانہ میں انگریزی سے اتنے حرف شناس ہو گئے تھے کہ تار پڑھ لیتے تھے، اس کے یہ معنی ہیں کہ دارالعلوم ندوہ جو بننے والا تھا، اس کی صورتِ مثالی پہلے ہی ذات گرامی میں موجود تھی۔

اس سلسلہ کا رابطۂ عقیدت ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا، جس کا نام نامی حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا، یہ فیض بھی دہلی کے اس خانوادہ سے آیا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، اور شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی سے شرف تلمذ اور حضرت شاہ محمد آفاق صاحب مجددی سے شرف بیعت حاصل تھا، تیرہویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں یہ ذات گرامی سارے ہندوستان کی روحانی عقیدت کا مرکز تھی، سنت سنیہ، فقر و غنا، نور و معرفت کی تمام خوبیاں اس ایک ہستی میں جمع ہو گئی تھیں، مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے اکثر تلامذہ گنج مرادآباد کے فیض ارادت سے سرفراز تھے۔

مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے، جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا[1]، دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ تینوں کا تعلیمی و روحانی شجرۂ نسب حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شجرۂ طوبیٰ پر ختم ہوتا ہے، تینوں کے بانی اور ممتاز ترین اساتذہ اسی خاندان سے استفاضہ و تلمذ کا تعلق رکھتے ہیں[2]۔

ایک ہی علمی، روحانی، فکری اور عملی سرچشمہ سے فیض یاب انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی مختلف تعلیمی، اصلاحی اور علمی تنظیمیں غیر ملکی غاصب قوت کے آگے سرنگوں کبھی نہیں ہوئیں، انھوں نے مغربی استعمار کے غاصبانہ کرتوت، ظالمانہ روش، اور عالم انسانیت کے لئے اس کی ہلاکت خیزی کو ایک لمحہ بھی فراموش نہیں کیا اور مغربی تہذیب و معاشرت کے سیلاب کے مقابلے میں ڈٹ گئے، البتہ انھوں نے وہ طریقۂ کار اپنایا جو زیادہ دور رس منصوبہ بند اور نتیجہ خیز تھا، بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کی مہم میں برادرانِ وطن کے دوش بدوش بلکہ جانی مالی قربانیوں میں ان سے بڑھ کر حصہ لینے والے یہی بوریا نشین تھے، اس ملک پر انگریزوں کے کامل تسلط کے بعد بھی جس طبقہ نے پوری خودداری، بے نیازی، اور تملق و چاپلوسی سے دور رہ کر اپنی زندگی گزاری ان میں سرفہرست وہ علمائے حق ہیں، جن کے ذہن و دماغ پر شاہ صاحب کے علم و فکر، حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے جذبۂ جہاد و سرفروشی، علماء صادق پور کی قربانی اور اپنے اسلاف کے استغناء کے انمٹ نقوش تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اس افتتاحی جلسے میں مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی عدم شرکت اور مولانا عبدالحی صاحب کی خیر مقدمی تقریر کی غیر موجودگی اور رپورٹ کو نہ پڑھنا خود اس بات کی

---

[1] حیات شبلی ص ۲۹۹ تا ۳۰۲ باختصار [2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حیات شبلی" کے مذکورہ صفحات۔

غماز ہے کہ یہ حضرات بدرجۂ مجبوری اپنی مجلس میں انگریز حکام کی حاضری گوارا کرتے تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مقصد

اس جلسہ میں ناظم ندوۃ العلماء کی تحریر کردہ رپورٹ منشی اطہر علی صاحب وکیل نے پیش کی، اس رپورٹ میں قیام دارالعلوم کے چار مقاصد بیان کئے گئے تھے۔

۱۔ علوم وفنون کی تکمیل۔

۲۔ علوم دینیہ خصوصاً علم کلام جس کی اس وقت نہایت ضرورت ہے اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کرنا، تاکہ دہریت اور الحاد کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جاسکے، علم فقہ میں تبحر پیدا کرنا، تاکہ عبادات ومعاملات میں ان کے فتاوے مستند اور واجب العمل ہوں۔

۳۔ مسلمانوں میں اسلامی اخلاق اور شائستگی پیدا کرنا، اور ان کو عمدہ اطوار اور عادتوں کا خوگر بنانا کیونکہ حقیقی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک ہم اپنے اسلاف کی عادتوں کو اختیار نہ کریں۔

۴۔ طلبہ میں عالی ظرفی وفراخ حوصلگی پیدا کرنا، جو بغیر اس قسم کے دارالعلوم کے جس میں تمام باتیں شان وشوکت کے ساتھ ہوں، اور طلبہ کو پست حوصلگی اور بے توقیری کے ساتھ بسر اوقات کرنے سے مستغنی کر دیا جاوے، حاصل نہیں ہوسکتی۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم کے تین حصے کر دیئے گئے:۔

درجۂ ادنیٰ

اس درجہ کی خواندگی تین سال رکھی گئی جس میں قرآن مجید، حدیث، فقہ، اور علم کلام کی بنیادی واقفیت پیدا ہو۔

درجۂ متوسط

اس کی مدت خواندگی پانچ سال، یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو علوم و فنون میں مرتبۂ فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

درجۂ تکمیل

اس سے مقصود صرف مطالعہ میں کمال پیدا کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ قوتِ مطالعہ کے ساتھ مسائل کا استیعاب اور تبحرِ علمی مقصود ہے۔

انتظام دارالاقامہ

دارالاقامہ (ہاسٹل) میں دو قسم کے طلبہ داخل کئے جاتے ہیں: (۱) جن کے سرپرست مصارفِ طعام و رہائش کے لئے آٹھ روپے ماہوار دیتے ہیں، (۲) وہ طالب علم جن کے مصارف دارالعلوم ادا کرتا ہے، ان کے علاوہ جو طلبہ شہر کے ہیں، یا شہر میں رہ کر اپنے قیام و طعام کا نظم کرتے ہیں، ان کے لئے بلا معاوضہ تعلیم کی سہولت ہے، طلبہ کو یکجا کھانا کھلایا جاتا ہے، نماز باجماعت کی پابندی، ایک قسم کا لباس (یونیفارم) جو شرعی اور پاکیزہ ہو سب پر لازمی ہے، ڈسپلن، پابندیٔ وقت، اصول پسندی، شائستگی اور تہذیب و اخلاق کا پورا لحاظ رکھنا ہوگا، نظام الاوقات لازمی ہوگا۔

اس کے بعد اس رپورٹ میں طریقۂ تعلیم کا مفصل تعارف ہے، رپورٹ کے بعد مولانا سید الزماں صاحبؒ اور مولانا حفیظ اللہ صاحب نے جو اس دارالعلوم کے پہلے مہتمم قرار دیئے گئے تھے،

ان طلبہ کو یکے بعد دیگرے نام بنام پیش کیا، جو اس وقت مدرسہ میں داخل ہو چکے تھے، یہ سب طلبہ ایک لباس (یونیفارم) میں تھے، اور بہت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ سلام کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔

اس موقعہ پر مولانا عبدالعلی آسی مدراسی مالک اصح المطابع نے فارسی، عربی، اردو میں چار تاریخی قطعۂ تہنیت پیش کئے، اس کے بعد مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے تقریر کی، ان کی تقریر کے دوران لوگوں نے خود بخود چندہ دینا شروع کیا، لوگوں کے اصرار پر دوسرے دن بھی جلسہ ہوا اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے تقریر کی، آخر میں ایک کمسن بچے نے مناجات پڑھی، اور وہ دارالعلوم وجود میں آیا جسے مستقبل میں عالم اسلام کا ممتاز تعلیمی ادارہ بننا تھا، اور جس کے فضلاء کو مشرق و مغرب میں ایک نئے دور کا آغاز کرنا تھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اوّلین مدرس

مولانا حفیظ اللہ صاحب (مدرس اعلیٰ و مہتمم)، مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کاکوروی، مولانا مفتی عبداللطیف صاحب سنبھلی، اور مولانا سید عبدالحی صاحب، ان چار حضرات پر درس و تدریس کا بار ڈالا گیا، چند دنوں بعد مولانا حفیظ اللہ صاحب کی عدم موجودگی میں ان کی جگہ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی (استاد مولانا شبلی نعمانیؒ) کو ان کی جگہ پر صدر مدرس مقرر کیا گیا۔

چھٹا اجلاس

ملک گیر طاعون و قحط اور مختلف اسباب کی بنا پر ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس محدود پیمانہ پر کیا گیا تھا، اس کی وجہ سے ندوے کے مقاصد کی اشاعت اور مالی اعانت میں کمی آگئی معترضین کو بھی یہ کہنے کا موقعہ مل گیا کہ "ندوہ ٹوٹ گیا" ان تمام وجوہات کی بنا پر طے کیا گیا کہ سالانہ اجلاس بڑے پیمانے پر کیا جائے۔

ندوۃ العلماء کا چھٹا اجلاس ۱۳، ۱۴، ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶، ۲۷، ۲۸ مارچ ۱۸۹۹ء روز شنبہ، یکشنبہ، دوشنبہ، شاہجہانپور میں منعقد ہوا، اس اجلاس میں پانچ سو مہمان بیرون جات سے تشریف لائے تھے، جس میں بریلی، بدایوں، مراد آباد، امروہہ، پیلی بھیت، وغیرہ اضلاع روہیلکھنڈ کے لوگ بکثرت تھے۔

مختلف انجمنوں کے نمائندے

مختلف تنظیموں اور انجمنوں کے یہ نمائندے شریک اجلاس تھے: انجمن حمایت الاسلام لاہور، منشی شمس الدین صاحب جنرل سکریٹری انجمن خادم علوم اسلامیہ اور مدرسۂ نعمانیہ جنرل سکریٹری مفتی مولوی حکیم محمد سلیم اللہ صاحب، وجوائنٹ سکریٹری مولوی تاج الدین احمد صاحب

مختار چیف کورٹ پنجاب اور وکیل انجمن مولوی ابوالفیض محمد حسن صاحب فیض مدرسۂ اسلامیہ ڈیرہ غازی خاں، مولوی محمد ابراہیم صاحب لاہوری، مولوی محمد محمود صاحب مدرس اول انجمن معین الندوہ پٹنہ کی طرف سے مولوی یوسف حسن صاحب برادر مولوی حکیم عبدالباری صاحب نگرنہسوی اور سید علی اسلم صاحب پھلواروی اور انجمن معین الندوہ بانکی پور کی طرف سے مسٹر محمد سلیمان صاحب بیرسٹرایٹ لاء تشریف لاکر شریک جلسہ ہوئے۔

صدارت

مولانا مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہانپور نے تحریک کی کہ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری خلیفہ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی مدظلہ العالی صدارت کو قبول فرمائیں، مولانا سید محمد علی ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے تائید کی اور بالاتفاق مولانا ممدوح صدر انجمن منتخب ہوئے، مولانا احمد حسن صاحب نے ایک مختصر اور مناسب تقریر کی اس کے بعد آداب جلسہ پڑھ کر سنائے گئے، جو ہر اجلاس میں پڑھنے کا معمول تھا، ان آداب میں سے چند یہ تھے۔

۱۔ زمرۂ علماء میں جو حضرات بیٹھیں گے ان کو اس بات کی پابندی کرنا ہوگی کہ ان کی وضع علماء کے شان کے خلاف نہ ہو۔

۲۔ جلسہ میں کسی امیر و رئیس کی تعظیم کے واسطے علماء نہیں اٹھیں گے۔

۳۔ جلسہ میں اشتہار تقسیم کرنے کی کسی کو اجازت نہ ہوگی، بجز ان اشتہارات کے جو ندوۃ العلماء کی جانب سے تقسیم کئے جائیں۔

صدارتی کارروائی کے بعد حافظ محمد اسماعیل صاحب سکریٹری معین الندوہ شاہجہانپور

نے اپنی استقبالی تقریر میں فرمایا:۔

"جناب صدر انجمن، پیشوایانِ ملتِ محمدیہ! میں اس وقت شاہجہانپور کے مسلمانوں کی طرف سے وکیل ہو کر آپ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ صاحبوں نے انتقاد جلسۂ ندوۃ العلماء بمقام شاہجہانپور منظور فرما کر یہاں کے مسلمانوں پر جو احسان کیا ہے اس کا شکریہ ادا کروں، لیکن افسوس ہے کہ میں اس خدمت کے انجام دینے کے قابل کسی طرح اپنے آپ کو نہیں پاتا، آپ صاحبوں کے احسانات اپنی مردہ اور افسردہ قوم پر ایسے نہیں ہیں کہ جن کا احاطہ ہو سکے، اور نازک زمانہ میں جو آپ نے مسلمانوں کو گرداب جہالت سے نکالنے اور ان کی آئندہ دینی اور دنیوی بہبودی کے لئے ہمہ تن وقف ہو کر وہ کمر باندھی ہے کہ اگر اس کی مثال تلاش کی جائے تو سوائے قرونِ اولیٰ کے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔

سب سے اہم کام

مجلس ندوۃ العلماء نے سب سے پہلے اس بات پر غور کیا کہ مسلمانوں کے تنزل اور ادبار کے کیا اسباب ہیں، اور انھوں نے بہت صحیح خیال کیا کہ یہ ساری خرابیاں مسلمانوں میں بوجہ نقصانِ تعلیمی کے پیدا ہوئے ہیں، قدیم طریقے کی تعلیم کو مسلمانوں نے اس بنا پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ زمانہ موجودہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ناکافی ہے، اور نئی تعلیم کے حاصل کرنے میں اس وجہ سے پہلو تہی کی گئی کہ اس میں احتمال مذہب کے نقصان کا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو سب سے اہم کام ہے وہ یہی صیغۂ تعلیم کی اصلاح و درستی ہے

اور اسی پر مسلمانوں کے تمام کاموں کا مدار ہے۔

پس اے بزرگانِ دین و اکابر ملت خیر الانام! آپ نے جو اس امر اہم اور نازک اور مشکل خدمت کو اپنے ذمہ لیا ہے اس کی شکر گزاری ہم نہیں کر سکتے تھے، مزید براں آپ نے انعقاد جلسۂ ندوۃ العلماء بمقام شاہجہانپور منظور فرما کر وہ احسان کیا ہے کہ جس کے بار سے ہم کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے!"

اس کے بعد مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء نے سالانہ رپورٹ صدر انجمن کی اجازت سے پڑھ کر سنائی، انھوں نے کہا۔

"جناب صدر انجمن و دیگر داعیان و ارکان ندوۃ العلماء! میں حسب دستور سالہائے گذشتہ اس وقت آپ کے سامنے ندوۃ العلماء کی وہ تمام تجویزیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو جلسۂ پنجم میں منظور ہوئی تھیں، اور سال زیر بیان ان کی تعمیل نہیں ہو سکی۔

قحط اور طاعون

قبل اس کے کہ میں ان تجویزوں اور کارروائیوں کو پیش کروں اس بات کا ظاہر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ سال گذشتہ میں قحط اور طاعون اور اسی قسم کے دوسرے حوادثات اتفاقیہ کی وجہ سے جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۲۹ شعبان ۱۳۱۵ھ کی تجویز کے موافق ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے کی شرکت کے لئے دعوتِ عام نہیں دی گئی بلکہ ۱۴ و ۱۵ شوال ۱۳۱۵ھ کو کانپور میں بجائے جلسۂ عام کے جلسۂ خاص منعقد کیا گیا اور اس میں امور تصفیہ طلب پیش کئے گئے، جو بہت غور و فکر اور مباحثے کے بعد طے ہوئے اگرچہ جلسۂ عام ان ضروری اور قابلِ لحاظ مصلحتوں کی وجہ سے ملتوی رکھا گیا، مگر چونکہ ندوۃ العلماء کے اکثر چیدہ رکن اس جلسے میں

موجود تھے اور اس میں نہایت ضروری امور طے ہوئے، جن پر عملی کارروائی کا مدار تھا، اس لئے ہم کو اپنی مجبوری کا زیادہ افسوس نہیں ہوا۔

مذکورہ بالا جلسہ میں تین تجویزیں منظور ہوئی تھیں:۔

۱۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ دارالعلوم بجائے دہلی کے لکھنؤ میں قائم کیا جائے۔

۲۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ بالفعل دارالعلوم کا درجۂ ابتدائی کھولا جائے، پھر بتدریج اس کے اور درجے کھولے جائیں۔

۳۔ تیسری تجویز یہ تھی کہ حسب تجویز نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کہ گورنمنٹ اسکول کانپور کے تمام طلباء کو دینیات کی تعلیم دلانے کے لئے کانپور کے رؤساء کو توجہ دلائی جائے، اس تجویز کی منظوری کے بعد کانپور کے رؤساء کی ایک مجلس منعقد کی گئی جس نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا۔

جناب صدر انجمن! یہ جلسہ اگرچہ معمول کے موافق عالیشان نہیں ہوا مگر جو تجویزیں دارالعلوم کے متعلق اس میں منظور ہوئیں وہ بے شبہ عالیشان تھیں، اور اس بات کی حاجت تھی کہ ہمتِ مردانہ کے ساتھ ان کے نفاذ کی کوشش اور تدبیر کی جائے، اسی وجہ سے اس جلسہ میں ایک جماعت علماء کی منتخب کی گئی جو لکھنؤ جاکر اس کا انتظام کرے، چنانچہ ۱۶ر شوال ۱۳۱۵ھ کو یہ وفد کانپور سے روانہ ہوکر لکھنؤ پہونچا اور خان بہادر منشی اظہر علی صاحب وکیل کی حسن توجہ اور منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی فراخ حوصلگی سے دارالعلوم کے واسطے ایک نہایت ہموار اور خوش منظر قطعہ آراضی حاصل ہوا، اس موقعہ کے حاصل ہونے کے بعد ۱۷ر شوال ۱۳۱۵ھ کو جلسۂ انتظامیہ منعقد کیا گیا اور جلسۂ مذکور نے اس موقعہ پر دارالعلوم کا بنانا منظور کیا، اس جلسہ میں بغرض فراہمی سرمایہ و نگرانی امور مختص المقام کے

لکھنؤ میں ایک مجلس معین اشاعت العلوم کے نام سے قائم کی گئی، اور اس کے سکریٹری منشی احتشام علی صاحب قرار پائے، اس مجلس نے راجہ سیتلا بخش کا مکان واقع گولہ گنج لکھنؤ خرید لیا۔

مکان مل جانے کے بعد ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ کو کانپور سے دفتر ندوۃ العلماء لکھنؤ آیا، اور اسی مکان میں ترتیب دیا گیا، اور ایک اعلان شائع کر دیا گیا کہ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۶ھ سے دار العلوم کے درجۂ ابتدائی کا کام شروع کیا جائے گا۔

دار الافتاء کا انتظام جیسا کہ مرکوز خاطر ہے، اس سال بھی نہیں ہو سکا تاہم جو طریقہ اس کے چلانے کا اختیار کیا گیا ہے، وہ اطمینان کے قابل ہے، دار الافتاء بھی کانپور سے لکھنؤ آیا اور دار العلوم کا انتظام کیا گیا۔

یتیم خانہ اسلامیہ کے حالات میں اس سال کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔

اس سال بھی چند مقاموں پر مجلس ہائے ماتحت قائم ہوئیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مجلس اشاعت العلوم لکھنؤ (۲) معین الندوہ جالندھر (۳) معین الندوہ پھلور ضلع جالندھر (۴) معین الندوہ پانی پت (۵) معین الندوہ وزیر آباد ضلع گجرانوالہ (۶) معین الندوہ سلام پور ضلع پٹنہ (۷) معین الندوہ شاہجہانپور۔

مولانا عبد الحی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء جب رپورٹ سنا چکے تو مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے فرمایا:۔

"ندوۃ العلماء نے عملی کارروائی کی بنیاد ڈالدی ہے، خان بہادر منشی اطہر علی صاحب اور منشی احتشام علی صاحب کا شکریہ..... کہ انھوں نے دار العلوم کی طرف دل سے توجہ فرمائی۔

اگر دار العلوم میں کوئی دلچسپ چیز ہے تو دار الاقامہ ہے، جہاں چھوٹے چھوٹے بچے

ایک ساتھ پڑھتے ہیں، ایک ساتھ رہتے ہیں، ایک ساتھ کھاتے پیتے ہیں، ایک ساتھ کھیلتے ہیں، خوشخطی، فارسی اور ورزش بھی سکھائی جاتی ہے، سرمایہ کے نہ ہونے سے دارالعلوم ہنوز متزلزل حالت میں ہے، لیکن ہم کو مالی مشکلات سے بددل نہ ہونا چاہئے۔"

جلسۂ خاص

۸ تا ۱۰ بجے شب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کی محل سرا کے بالاخانے پر اس جلسہ کا اہتمام کیا گیا، علماء کو پہلے سے اطلاع دی جا چکی تھی، اور انجمنوں کی جانب سے جو وکلاء تشریف لائے تھے، ان کو بھی اطلاع دی گئی تھی، چنانچہ یہ سب حضرات تشریف لائے، اس جلسے کا اصلی موضوع یہ ہے کہ تعارف کی وجہ سے ارتباط باہمی کو استحکام ہو، اس کے سوا جو فوائد اس جلسے سے حاصل ہو سکتے ہیں، وہ محتاج بیان نہیں، حسب معمول چائے نوشی پر جلسہ ختم ہوا۔

دوسری نشست ۲۷ مارچ ۱۸۹۹ء کو صبح ۱۱ بجے دن منعقد ہوئی، صدر انجمن کی اجازت سے مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء نے دارالعلوم کی رپورٹ پیش کی۔

دارالعلوم قائم ہو گیا

"جناب صدر و اعیان و ارکان ندوۃ العلماء و رؤسائے شاہجہانپور! آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے تین برس پہلے اس روہیلکھنڈ کے صدر مقام بریلی میں جب دارالعلوم اسلامیہ کی تجویز پیش کی گئی تھی، تو آپ نے نہایت مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا تھا، اور وہ تجویز جو ہمارے دینی و دنیوی بہبودیوں کا زینہ ہے، خوشی سے منظور کی تھی، آج اسی روہیلکھنڈ کے دوسرے مشہور اور

نامور شہر شاہجہانپور میں مجھکو اس بات کا موقع حاصل ہوا ہے کہ میں آپ کی اس منظور شدہ تجویز کی عملی کارروائی کا اظہار کروں اور آپ کو مبارک باد دوں کہ جس تجویز کو آپ نے سالِ پیوستہ میں منظور کیا تھا، اس کی بنیاد ڈالدی گئی، اور لکھنؤ میں جو اودھ کا صدر مقام اور آپ کے روہیلکھنڈ سے متصل ہے، دارالعلوم کا ابتدائی درجہ قائم کر دیا گیا، جب دارالعلوم کی تجویز کو مسودہ کے شکل میں چھپوا کر بغرض استصواب علماء و اہل الرائے اہلِ اسلام کے شائع کیا گیا تھا، اکثر علماء و رؤساء اور اہلِ الرائی مسلمانوں نے پسندیدگی اور اعتراف کی نظر سے دیکھا ہے، اور انجمن ہائے اسلامیہ خصوصاً انجمن حمایت الاسلام لاہور اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے عام و خاص جلسوں میں اس سے اتفاق کیا اور مشائخ کرام نے اس کو بطیفۂ غیبی اور منجانب اللہ خیال کیا، جلسۂ خاص منعقدہ ۱۷ شوال ۱۳۱۵ھ کانپور کے فیصلہ کے مطابق ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۶ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۸۹۸ء کو لکھنؤ میں دارالعلوم اسلامیہ کی شاخوں میں سے درجۂ ادنیٰ کھول دیا گیا، اور جلسۂ انتظامیہ کی رائے سے افتتاح کی تقریب میں ۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۶ھ روز چہارشنبہ کو دارالعلوم کا جلسہ نہایت پرتکلف اور پرشان طریقے سے کیا گیا جس میں علمائے فرنگی محل اور رؤساء و عمائد شہر بکثرت شریک تھے، دارالعلوم کے قائم کرنے سے مقصود اصلی ہمارا یہ ہے کہ جو نقائص عربی کے موجودہ طریقۂ تعلیم میں پائے جاتے ہیں، وہ دور کئے جائیں اور تعلیم کے ساتھ تربیت پورے طور پر کی جائے، جس کی نایابی سے عربی تعلیم کا معیار اس زمانے میں بہت گھٹ گیا ہے اور اسی کے ساتھ زمانے کی ضرورتوں کا بھی ہم اندازہ کرتے رہیں، پس ضروری ہے کہ ہم مدرسین کی ایک کافی جماعت تیار کریں اور خاص خاص علوم کا ان کو ذمہ دار قرار دیں تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ ان علوم و فنون میں اپنے بلاغ نظر کو بڑھائیں اور طلبا پر اس کا اثر ڈالیں۔

نظام تعلیم

حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ دار العلوم کا جس غرض سے قائم کیا جانا تجویز ہوا ہے، اس کے حاصل کرنے کے لئے پہلے سے دار العلوم کے تین حصے کر دیئے گئے ہیں، تاکہ باعتبار تفاوتِ اذہان اور وقت و فرصت کے ہر شخص فائدہ اٹھا سکے، اول درجۂ ادنیٰ جس کی مدت خواندگی تین سال کی رکھی گئی ہے اور اس کے نصاب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ علوم عربیہ اور دینیات میں بقدر ضرورت طلبا کو مہارت ہو جائے، مقصود یہ ہے کہ طالب علم عربیت سے اس قدر آشنا ہو جائے کہ جب چاہے اس کو ترقی دے سکے، اور قرآن شریف، حدیث، فقہ اور عقائد سے بھی واقف ہو جائے، اس کے بعد اگر وہ آگے بڑھنا چاہے تو اس کے لئے درجۂ متوسط موجود ہے کہ اگر وہ کسبِ معاش کے لئے کوئی اور کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس بات کا موقع رہے کہ جب چاہے کتب بینی اور مطالعہ کے ذریعہ سے اپنی استعداد بڑھا سکے، اور دین و مذہب کے متعلق بقدر ضرورت وہ کسی کا محتاج نہ رہے یا اگر وہ اس کے بعد انگریزی پڑھے تو قطع نظر قابلیت الحاد و دھریت کے حملوں سے محفوظ رہے۔

دوم درجۂ متوسط، جس کی مدتِ خواندگی پانچ سال ہے ان لوگوں کے لئے جو علم و فنون متداولہ میں مرتبۂ فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس درجہ سے فارغ ہونے پر طالب علم کو ہر علم میں کافی استعداد اور قوتِ قریبہ پیدا ہو جائے گی، اور وہ جس علم میں چاہے گا تبحر اور کمال پیدا کر سکے گا، ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے طلبہ متنبی یا حریری پڑھ جائیں، مگر دو سطریں عربی کی نہ لکھ سکیں، یا لکھنا آجائے مگر پانچ منٹ عربی میں گفتگو نہ کر سکیں، یا منطق میں علامہ ہو جائیں مگر حساب و ہندسہ سے ناآشنا رہیں، یا یہ ہم علم و فضل قرآن مجید کو تجوید و قرأت سے

نہ پڑھ سکیں، ہم چاہتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث کے ساتھ بہت زیادہ اعتناء کیا جائے۔

سوم درجۂ اعلیٰ، جس کی مدت خواندگی دو سال ہے اس میں صرف قوتِ قریبہ اجتہاد استعداد پیدا کرنا مقصود نہیں بلکہ قوتِ مطالعہ کے ساتھ استیعاب مسائل اور تبحر علمی مدنظر ہے، اس لئے اس درجہ میں شوق و میلان طبیعت کے لحاظ سے کسی علم خاص میں تکمیل کرائی جائے گی کیونکہ سب علموں میں ایک شخص کو پورا کمال نہیں ہو سکتا، اور اس درجہ کی تحصیل کے بعد طالب علم کو خاص لقب دیا جائے گا مثلاً مفسر، محدث، فقیہ، اور ادیب وغیرہ، پس ان تینوں حصوں سے ایک حصہ یعنی درجۂ ادنیٰ بالفعل کھولا گیا ہے، اگرچہ کھولا جانا حقیقت میں اس وقت کہا جا سکتا ہے، جب کہ اس کے واسطے کافی سرمایہ جمع ہو جائے، اور جو اندازہ اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے اس اندازہ کے موافق کام ہونے لگے، تاہم اس وقت قلیل مدت میں جو چھ مہینے سے زیادہ نہیں ہے، جس طریقے سے اس کی کارروائی ہوئی ہے، اور جو انتظام اس وقت تک کیا گیا ہے، اس کی کیفیت آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے، اگر آپ ہمت اور سرچشمی سے کام لیں گے تو ہم کو امید ہے کہ انشاء اللہ العزیز اس میں جو کمی ہے وہ پوری ہو جائے گی، اور ہم کو حوصلہ ہوگا کہ ہم خدا کی مدد سے درجۂ فضیلت اور درجۂ تکمیل بھی کھولدیں، اور مسلمانوں کی روحانی زندگی کے واسطے وہ آبِ حیات اور ان کی قومیت کے قالبِ بے جان کے لئے وہ اکسیر کا کام دے، مولانا نے آخر میں ایک بڑے اور وسیع کتب خانے کے قیام پر بھی زور دیا۔

اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکن پور نے اپنا مضمون جو دار العلوم کی ضرورت پر لکھا تھا، پڑھ کر سنایا، مضمون کا خلاصہ درج ہے:۔

صدر انجمن بزرگان دین و اعیان! مجلس ندوۃ العلماء جن مقاصد کو حاصل کرنے کی

درپے ہے ان میں ایک دارالعلوم بھی ہے، گذشتہ برسوں کے دوران ندوۃ العلماء نے اس تجویز کو ملک و قوم کی خدمت میں پیش کیا ہے، سالانہ جلسوں میں ہزاروں آدمیوں کے سامنے دارالعلوم پر تقریریں کی گئیں، ایک رسالہ مسودۂ دارالعلوم کے نام سے چھاپ کر شائع کیا گیا، اس کے ہزاروں نسخے مفت تقسیم کئے گئے، سب سے بڑھ کر مجسم طریقۂ اعلان وہ وسیع اور عظیم الشان مکان ہے، جو لکھنؤ گولا گنج میں واقع ہے، اور جس میں دارالعلوم کے درجۂ ابتدائی کی تعلیم ہو رہی ہے۔

حضرات! قوم اہل اسلام جن اجزا سے مرکب ہے، ان پر اگر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو صاف عیاں ہوتا ہے کہ ہماری قوم برخلاف اور اقوام عالم کے ایک ایسی قوم ہے، جس کا شیرازۂ جمعیت نہ نسل ہے، نہ ملک، بلکہ مذہب اور صرف مذہب ہے مسلمان اپنی حیات و بقاء میں مذہب کے محتاج رہیں گے۔

لہذا یہ ضروری ہے کہ قوم میں ایسے بزرگ ہمیشہ اور کافی تعداد میں موجود رہیں جو مذہب کے اصول و فروع سے واقف ہوں اور وہ ہر طبقے تک مذہب کا حیات بخش اثر پہونچائیں۔

تباہی کا سبب

جن لوگوں نے مسلمانوں کی گزشتہ اور موجودہ حالت پر غور کیا ہے، ان کو یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت روز بروز زبوں ہوتی جاتی ہے، ان کے معاملات یوماً فیوماً راست بازی سے دور ہوتے جاتے ہیں، اس کا سبب کیا ہے؟ تعلیم جدید کے حامی بے تامل بول اٹھیں گے کہ تعلیم کی کمی سے یہ خرابیاں برپا ہیں، جس وقت تعلیم پھیلی یہ تمام برائیاں اس طرح

کافور ہو جائیں گی جس طرح آفتاب کی شعاعیں رات کے اندھیرے کو مٹا دیتی ہیں، ان کا مطلب تعلیم سے تعلیم جدید ہے لیکن یہ جواب سرسری اور واقعات سے بعید ہے، آج سے چالیس یا پچاس برس پیشتر تعلیم جدید کا نام بھی بہت کم لوگ جانتے تھے، لیکن آج سے بہت زیادہ مسلمانوں کے اخلاق درست تھے، ان کے معاملات میں بہت زیادہ راست بازی تھی۔

ایک سبب اس تباہی کا غالباً یہ کہا جائے کہ علم دین کی کمی ہے، یہ جواب بھی صحیح نہیں، آج دینی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، کثرت سے مدارس موجود ہیں، اصل سبب یہ ہے کہ ملک اور قوم میں اب ویسے پاکیزہ مشرب وسیع العلم علماء موجود نہیں رہے، جیسے چالیس پچاس برس پیشتر تھے، یہ بزرگ مذہبی ہدایتوں کی مجسم تصویر اور صفات و اخلاقِ اسلامی کے سراپا نمونہ ہوتے تھے، ان کے فیض صحبت سے اہل علم دین و اسلام کی پابندی اور اخلاقِ محمدی کی پیروی سیکھتے تھے۔

سرسید کی شہادت

سرسید احمد خاں سے بڑھ کر تعلیم جدید کا مؤید کون ہو سکتا ہے؟ انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس نہم واقع ۱۸۹۴ء میں اپنے لکچر میں کہا تھا۔

گذشتہ زمانہ میں ہمارے بزرگوں کی حالت نہایت عمدہ اور بے نظیر تھی، گذشتہ زمانے کی سویلیزیشن جسے یاد کر کے ہم کو رونا چاہیئے، ہمارے بزرگوں کو نصیب تھی، اخلاق، محبت، مروت دوستی کا برتاؤ، نیک دلی، فیاضی، متانت، چھوٹوں کے ساتھ الفت، بڑوں کا ادب، غریبوں کے ساتھ ہمدردی، قومی یگانگت سب ان میں جمع تھے، قدیم تعلیم دنیوی و دینی کا ایسا مستحکم اور قابل ادب سلسلہ تھا جس کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں پائی جاتی، ایک مقدس بزرگ عالم دن رات بلا خیال دنیوی فائدے کے خدا کی رضامندی اور اپنی قوم اور اپنے مذہب کے لوگوں کی

تعلیم کے لئے ایک مسجد کے کونے یا خانقاہ کے حجرے یا اپنے مکان کی کوٹھری میں بیٹھا پڑھاتا تھا پھر غریب سے غریب آدمی پڑھنے آئے یا بادشاہ کا بیٹا سب کی تعلیم میں مساوی برتاؤ کرتا تھا، اخیر زمانہ میں بھی ایسے بزرگ تھے کہ ان کی صحبت کی برکت سے طالب علموں کے اخلاق درست ہوتے تھے، نیکی ان کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔

تعلیم کا اہم مقصد

سب سے بڑا مقصد تعلیم و تربیت سے انسان میں نیکی و اخلاق اور انسانیت اور آدمیت پیدا کرنا ہے، وہ ہم کو اپنے بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتا تھا، انقلاباتِ زمانہ سے نہ اب وہ زمانہ ہے، نہ اب وہ لوگ جن کی صحبت سے ہم تربیت پاتے تھے، غدر ۱۸۵۷ء نے جس کا الزام بدقسمتی سے مسلمانوں پر لگایا گیا، رہا سہا جو کچھ تھا سب برباد کر دیا!

ویسے علماء کیوں نہیں

اب یہ امر غور طلب ہے کہ ویسے علماء کیوں نہیں پیدا ہوتے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہم کو ایک نظر اس بات پر ڈالنی چاہیئے کہ جن علماء کی کمی قوم میں ہے وہ کیونکر پیدا ہوتے تھے؟

جن گذشتہ علماء کا میں حوالہ دے رہا ہوں ان کی طالب علمی کے زمانے میں اصطلاحی مدارس کا نام بھی ملک میں بہت کم لوگ جانتے ہوں گے، اس زمانے میں ملک کے مختلف شہر مثلاً دہلی، لکھنؤ، رامپور علم کے مرکز ہو رہے تھے، ان شہروں میں ہر فن کے اساتذہ و ماہرین اپنے اپنے مقام پر درس دیتے تھے، علوم کے طالب اور فنون کے شائق ملک کے مختلف اطراف سے ان شہروں

میں آتے اور ہر فن کے اساتذہ سے اس فن کو حاصل کرتے۔

دہلی مرحوم کا آخری دور

دہلی مرحوم کے آخری دور پر بطور نمونہ ایک سرسری نظر ڈالنی چاہیئے، مثلاً تصفیۂ قلوب و روحانی صفات کے حصول کے لئے خانقاہ شریف تھی، جہاں میاں صاحب مرحوم کی درسگاہ تھی، مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے یہاں قریباً ہر فن کی تعلیم ہوتی تھی، قانون کے نبض شناس حکیم امام الدین خاں صاحب تھے، فارسی کی تکمیل کے لئے مرزا غالب کا دیوان خانہ تھا، غرض باطنی اور ظاہری کمالات کے چشمے نہیں، زخار دریا جاری تھے، جن سے طلباء سیراب ہوتے تھے۔

علماء میں ایسے نمونے بھی تھے، جو علوم عربیہ میں فاضل، ادب فارسی و عربی بلکہ اردو پر قادر، طب میں صاحبِ دستگاہ، ظریف الطبع اور اس کے ساتھ مرتاض و تہجد گذار ہوتے، افسوس کہ اب وہ علمی مجالس ویران ہوگئیں، جن سے کمال کے بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔

علماء کی بے اثری

مدارس عربیہ کی طرز تعلیم، نئی امت کے علماء کی طرز زندگی اور اخلاقی حالت بہت کچھ عربی تعلیم کی راہ میں خلل انداز ہوئی ہے، سالہا سال طلباء مدارس میں رہتے ہیں، پڑھتے پڑھاتے سفید ریش ہو جاتے ہیں، سب کچھ پڑھتے ہیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا پڑھتے ہیں، جب دستار فضیلت باندھ کر مدرسہ چھوڑتے ہیں، اور اہل ملک سے ملتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حضرات اجنبی دیس سے آئے ہیں، جو زبان میں، حرکات و سکنات میں، خیالات میں اہل ملک کے ساتھ میل نہیں کھاتے۔

علماء کی باہمی نزاعوں نے اس مقدس طبقے کے وقار و اثر کو بہت کچھ نقصان پہونچایا ہے، جو لوگ اس تعلیم کو اچھا سمجھتے ہیں، وہ نتیجۂ تعلیم سے بد دل ہو جاتے ہیں۔

موجودہ نصاب اور ندوہ

موجودہ نصاب عربی کے نقائص کے نسبت وقتاً فوقتاً مجلس ندوۃ العلماء میں بحث ہوئی ہے، اور اکابر علماء مدرسین نے ان نقائص کو علانیہ ظاہر و تسلیم کیا ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ ضرورت زمانہ نے مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی طرف مائل کر دیا ہے، ان طلباء کو علوم دین سے واقف و مانوس کرانا بہت ضروری ہے، ان تمام مدارج کی تکمیل وسیع انتظام کے بغیر ممکن نہیں، ندوۃ العلماء اپنے عالی شان دار العلوم کو جن اصولوں پر قائم کرنا چاہتا ہے، وہی ان ضرورتوں کو پورا کر سکیں گے۔

قوم میں پھر صحیح زندگی پیدا ہوگی

جن صاحبوں نے ندوۃ العلماء کے دار العلوم کا مسودہ دیکھا ہے، اور وہ مختلف تحریریں اور تقریریں دیکھی ہیں، انھیں اس کا یقین ہو گیا ہوگا کہ اگر فضل الٰہی شامل ہے، اور اس نے مسلمانوں کے دلوں کو دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف متوجہ کر دیا تو انشاء اللہ جس قسم کے علماء کو آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں، وہ پھر پیدا ہونے لگیں گے، اور ان کے انفاس کی برکت سے قوم میں پھر راست بازی دینداری، معاملات کی خوبی و صفائی پیدا ہوگی، "وما ذلک علی اللہ بعزیز"

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی جب اپنی تقریر ختم کر چکے تو خان بہادر منشی محمد اظہر علی صاحب وکیل و شیر قانونی انجمن تعلقداران اودھ نے دار العلوم کے واسطے سرمایہ جمع کرنے کی

تجویز پیش کی اور فرمایا:۔

"حضرات! جو دلچسپی مجھ کو ندوۃ العلماء سے ہے وہ ظاہر ہے، میرا قیام لکھنؤ میں ہے لکھنؤ اس وقت بلحاظ آبادی کے ہندوستان میں چوتھے نمبر کا شہر ہے، مگر میری رائے میں افلاس اور فلاکت میں نمبر اول ہے، اس وقت تک جو کچھ لکھنؤ میں اس عجلت کے ساتھ کیا گیا ہے وہ تمام حالات پر نظر کرتے ہوئے کم نہیں ہے، دارالعلوم کے واسطے مکان ۹ ہزار روپیہ میں خرید لیا گیا ہے، جس کی خریداری میرے برادر عم زاد منشی احتشام علی خلف الرشید منشی امتیاز علی صاحب بہادر وزیر ریاست بھوپال نے کی۔

میں بھی ندوۃ العلماء کی خدمات جو ہو سکتی ہیں کرتا ہوں، شہر لکھنؤ کی ایک مسلمان خاتون نے دارالعلوم قائم ہونے کی شہرت سنی تو اپنی جائداد کا بڑا حصہ ایک وصیت کے ذریعہ دارالعلوم میں دے دیا۔

روپیوں کا ڈھیر

اس تقریر کا حاضرین پر ایسا اثر ہوا کہ چندے کی کارروائی شروع ہو گئی، سب سے پہلے شیخ عبدالرحیم صاحب کلکٹر و سکریٹری انجمن معین الندوہ میرٹھ نے مبلغ پانچسو دس روپے پیش کئے، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی تقریر سے کچھ ایسا جوش پیدا ہو گیا کہ روپیہ مینہہ کی طرح برسنے لگا، چندہ دینے والوں کے ہجوم اور پیش قدمی نے سب کو متاثر کیا، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب چندہ دینے والوں کا نام اور پتہ لکھتے جاتے تھے، مولانا مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہاں پور نام لکھوا رہے تھے، حافظ محمد اسمٰعیل وکیل شاہجہانپور اس کا اعلان کرتے جاتے تھے، اور مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری روپیہ لیتے جاتے تھے،

چندہ دینے والوں کا اس قدر ہجوم ہو جاتا تھا کہ بار بار معذرت کے ساتھ روکنا پڑتا تھا چندے کی شکلیں روپیہ اور پیسے پر محدود نہیں تھیں، روپیہ پیسے، کپڑے، گھڑیاں، رومال، دوشالے، گاؤں، زمین غرض کہ جس سے جو ہو سکتا تھا دے رہا تھا۔

گاؤں، کھیت اور زمینیں

مولوی عبدالواجد خاں صاحب نقشبندی نے نصف موضع خمرہ پور دارالعلوم کے واسطے عنایت فرمایا، دوسرا نصف حصہ مولانا مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہانپور کی طرف سے اعلان کیا گیا، احمد حسن خاں صاحب رئیس شاہجہانپور نے مصری پور کی معافی جو پانچسو روپے کی ہے عنایت کی۔

محمود خاں صاحب نے ایک کھیت وقف کیا، حاجی محمد سعید خاں صاحب سوداگر شاہجہانپور نے اپنے والد ماجد محمد نعیم خاں صاحب مرحوم کی طرف سے دارالاقامہ کا ایک کمرہ بنوانے کے لئے تین سو روپے دیئے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے اپنے عم بزرگوار نواب عبدالشکور خاں صاحب رئیس بھیکن پور کی جانب سے ایک ہزار روپے کا اعلان کیا، منشی اطہر علی صاحب نے ایک ہزار روپے، منشی احتشام علی صاحب کی طرف سے پانچسو روپے دینے کا وعدہ فرمایا، اس مجمع میں جو لوگ مزدور پیشہ تھے، انھوں نے اپنی ایک روز کی مزدوری ندوہ کو دے دی۔

جلسۂ عام

اجلاس کے موقع پر ہر روز و شب میں جلسۂ عام ہوتا رہا جن میں ان مقررین نے

تقریریں کیں، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیارپوری، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا محمد ابراہیم لاہوری، مولانا عبدالجبار صاحب عمرپوری، ابوالفیض مولانا محمد حسن صاحب فیضی۔

محمد احسان خاں صاحب نے اردو کی رباعیاں سنائیں ؎

دوست دشمن پہ کچھ نہیں موقوف — جس کو دیکھو مطیع و فرماں ہے
سچ یہ ہے مہر دفتر ندوہ — غیرت خاتم سلیماں ہے
نام اس کا مجمع علمائے سعید ہے — ندوہ کوئی مقام فریب و غل نہیں ہے
نسبت ہے آسمان زمیں سے؟ فلک گیا — یاں وہ نجوم ہیں کہ جہاں اک زحل نہیں

اس کے بعد مولوی حکیم ابویحییٰ محمد صاحب شاہجہانپوری نے ایک مضمون پڑھا جس میں مسلمانوں کو صنعت و تجارت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اعداد و شمار کے ذریعہ سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو ظاہر کیا ہے، مسٹر محمد سلیمان بیرسٹریٹ لانے جو انجمن معین الندوہ بانکی پور کی طرف سے اس اجلاس میں نمائندہ تھے، درد و اثر میں ڈوبی ہوئی تقریر کی اور کہا کہ مجھے پہلے ندوہ کے مقاصد اور فوائد سے واقفیت اور دلچسپی نہ تھی، لیکن دو دن سے جو نظارہ دیکھ رہا ہوں اس سے میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی ہے، میں اپنی زندگی کو ندوہ کے مقاصد کے لئے وقف کرتا ہوں جو کام میرے لائق ہو مجھ سے لے لیا جائے۔

مولوی عبدالرحیم نامی ایک واعظ ندوہ کے سخت ترین مخالفوں میں تھے، وہ اس غرض سے اجلاس میں شریک ہوئے کہ ندوہ کے رد میں رسائل تقسیم کریں، اور جلسے میں انتشار پیدا کریں، لیکن اجلاس کی کارروائی دیکھ کر وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان مخالف رسالوں اور کتابوں کو مجمع میں چاک کر دیا، اس کے بعد انھوں نے تقریر کی اور ندوہ کی مخالفت سے توبہ کی۔

اہم تجاویز

(۱) شاہجہانپور کی گورنمنٹ اسکول میں تعلیم دینیات کا انتظام کیا جائے (۲) نواب محسن الملک نے علی گڑھ یونیورسٹی کا خاکہ بغرض استصواب بھیجا ہے، وہ چند اہل الرائے کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ غور کر کے ایسا نصاب مرتب کریں جو مسلمانوں کے دینیات وعلوم مشرقیہ کی ضرورتوں کو پورے طور پر حاوی ہو، اور بعد تجویز اس نصاب کو جلسۂ انتظامیہ میں پیش کریں، اور جلسۂ انتظامیہ بعد غور وبحث کے جو امر طے کرے وہ نواب محسن الملک کے پاس منجانب ندوۃ العلماء بھیجا جائے۔

شعراء کا خراج عقیدت

اس اجلاس میں مولوی عبدالجبار صاحب عمرپوری، مولوی حکیم شیخ احمد صاحب جنیکر رئیس بمبئی نے عربی قصائد پیش کئے، منشی طفیل الدین صاحب بدایونی اور منشی نظام الدین صاحب نے اردو قصیدے پڑھے، چند اشعار نقل ہیں ؎

جو ہوئے اس شہر میں ندوہ کے آنے کا سبب ۔۔۔ دے جزائے خیر اس کی ان کو رب العالمین

اے خدا ندوہ کو دن دونی ترقی ہو نصیب ۔۔۔ آتش حسرت میں گو جلتے رہیں سب حاسدین

آفتاب علم کا مرکز بنے دارالعلوم ۔۔۔ لے سبق تہذیب کا اگر گروہ جاہلین

حاضر دربار ندوہ عرض کرتا ہے سلام ۔۔۔ ہم زبان وہم بیاں ہو جائیں سارے حاضرین

اور منشی نظام الدین صاحب بدایونی کے قصیدے کے چند اشعار ؎

شاید بہار آئی اسلام کی چمن میں ۔۔۔ پھولے نہیں سماتے مومن جو پیرہن میں

روہیلکھنڈ تجھ کو شاباش و آفریں ہے ندوہ کا آج جلسہ ہے پھر ترے چمن میں
ڈالی بنائے ندوہ جس نے بحسن نیت برکت اسے خدا دے اس کوشش حسن میں
فرزانۂ یگانہ وہ عبد حیؒ دانا عالم علوم دیں کے کامل ہر ایک فن میں
کرتے ہیں ہم دعا یہ ندوہ کے حق میں ہر دم برکت تو دے خدایا اس پاک انجمن میں
دار العلوم ندوہ یارب کرے ترقی
شہرت ہو خوب اس کی امصار اور دمن میں

کتب خانہ ندوہ کے لئے پہلا گراں قدر عطیہ

اجلاس ختم ہونے کے بعد شہر کے عوام و خواص کی طرف سے وعظ و تقریر کے لئے اصرار ہوا، مختلف مقامات پر جلسے ہوئے، مولوی عبد الواجد خاں صاحب کے ہاں جلسے میں مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے وعظ کے بعد خواتین نے نقد اور زیور وغیرہ چندے میں دینا شروع کر دیئے، صاحب خانہ کی اہلیہ نے سات ہزار روپے کی مالیت کی جائداد دار العلوم کے لئے وقف کی، اسی موقع پر عبد الرافع صاحب ڈپٹی کلکٹر گونڈہ نے اپنا نفیس کتب خانہ جس کی قیمت کا اندازہ دس ہزار روپے کیا گیا، دار العلوم کو دینے کا اعلان کیا۔

شاہجہاں پور کے اجلاس کے بعد رؤساء بریلی کی خواہش پر مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سید عبد الحی اور دوسرے حضرات پر مشتمل ایک وفد بریلی گیا، وہاں کئی جلسے ہوئے اور ندوہ کا خاصا تعارف ہوا، یہی وفد چندوسی (مراد آباد) بھی گیا، جہاں دو جلسے ہوئے لوگوں نے جوش و خروش کے ساتھ ان میں شرکت کی اور چندہ بھی دیا، نواب حسن خاں صاحب رئیس مراد آباد جو جلسے میں شرکت کے لئے اپنے

گھوڑے پر آئے تھے ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اپنا گھوڑا ندوہ کی نذر کر دیا، اسی سفر میں رؤسائے امروہہ خصوصاً نواب وقار الملک کی دعوت پر یہ وفد امروہہ پہونچا یہاں جلسے میں مولوی شاہ نظام الدین احمد صاحب جھجھوی، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اور مولانا سید عبدالحی صاحب مدوگار ناظم نے ندوۃ العلماء اور ضرورت دارالعلوم پر تقریریں فرمائیں، وفد نے عید الاضحیٰ تک یہاں قیام فرمایا۔

مجلس انتظامیہ کے جلسے

اجلاس شاہجہانپور کے بعد ندوۃ العلماء کے مجلس انتظامیہ کے چار جلسے ہوئے جن میں زیادہ تر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب درس، طریقۂ تعلیم، نظم و نسق دارالاقامہ، انتخاب مدرسین وغیرہ پر غور و خوض کیا گیا۔

۱۔ اس سال مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی (استاذ مولانا شبلی نعمانی) کا بحیثیت مدرس اول تقرر ہوا۔

۲۔ طلبہ کے علاج معالجہ کی خدمت حکیم خورشید علی صاحب لکھنوی نے اعزازی طور پر منظور فرمائی۔

۳۔ دارالعلوم کے انتظام کے لئے ایک کارکن کمیٹی مجلس دارالعلوم کے نام سے قائم کی گئی۔

۴۔ وقف شدہ جائدادوں کے متعلق قانونی کارروائیوں کے لئے ناظم ندوۃ العلماء کی طرف سے مولانا مسیح الزماں خاں شاہجہانپوری، مولوی عبدالواجد خاں رئیس شاہجہاں پور، مولوی عبدالحی صاحب وکیل چندوسی، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری اور مولوی غلام محمد صاحب ہوشیارپوری کو مختار مقرر کیا گیا۔

۵۔ مولانا فتح محمد صاحب نائب لکھنوی کو محاسب مقرر کیا گیا تاکہ وہ ہفتہ وار حساب کو جانچا کریں۔

۶۔ امسال ایک اہم تجویز منظور کی گئی کہ دارالعلوم میں انگریزی زبان کی بھی تعلیم دی جائے اور اس کا ایسا خاکہ بنایا جائے جس سے معلوم ہو سکے کہ دارالعلوم میں اس کی تعلیم کس طریقے سے ہو سکے گی، اس تجویز کو ۱۴ شعبان ۱۳۱۷ھ کے جلسۂ انتظامیہ میں پہلی بار مولانا شبلی نے مولانا غلام محمد ہوشیارپوری کی تائید سے پیش کیا، مولانا محمد علی ؒ ناظم ندوۃ العلماء انگریزی کے نہ صرف حامی تھے، بلکہ داعی تھے، لیکن تدریجی طور پر اور اس حد تک کہ اس سے اصل درسیات کو نقصان نہ پہونچے، ندوہ کے اجلاس ہفتم منعقدہ پٹنہ میں مولانا سید عبدالحی ؒ نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی اس میں اعلان فرمایا کہ دارالعلوم میں انگریزی تعلیم کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

اس وقت اکیس ۲۱ مقامات پر معین الندوہ نام سے مجلسیں قائم ہوئیں، شملہ کی انجمن معین الندوہ کی کارگذاری سب سے بہتر رہی، اس نے سیکڑوں روپے وصول کر کے دفتر ندوۃ العلماء کو روانہ کئے، اس میں مولانا غلام محمد صاحب شملوی کی بیش بہا خدمات اور انتھک محنت کو بہت دخل تھا۔

شاہجہانپور کی انجمن معین الندوہ نے گورنمنٹ اسکول شاہجہانپور میں دینیات کی تعلیم کا نظم و انتظام اپنے ذمہ لیا، اس کے مصارف صدر انجمن معین الندوہ مولوی شاہ عبدالواجد خاں صاحب رئیس شاہجہاں پور کی فیاضی سے پورے ہوتے تھے۔

دفتر کو اس سال جو خطوط باہر سے آئے ان کی تعداد گیارہ سو سینتالیس ۱۱۴۷ تھی، اور جو دفتر سے روانہ کئے گئے ان کی تعداد دو ہزار پانچسو ستر ۲۵۷۰ تھی، چندہ دہندگان کی تعداد (۱۸۹۴) تھی

ایک دعا گو سرپرست کی رحلت

کارکنانِ ندوۃ العلماء کو اس سال شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی رحلت کا صدمہ جھیلنا پڑا، وہ ندوۃ العلماء کے سرپرست و مربی تھے اور قیام ندوۃ العلماء سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اپنی دعاؤں توجہ سے ندوۃ العلماء کو تقویت پہونچاتے رہے، ندوۃ العلماء کے حالات سننے کے لئے ہر وقت مشتاق رہتے، اور جب خط پہونچنے میں دیر ہوتی تو خود دریافت حال فرماتے۔

اسی سال کا دوسرا حادثہ، شمس العلماء مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کا انتقال تھا، جو ملک العلماء مولانا عبدالعلی بحر العلوم کے پرپوتے، بزرگانِ فرنگی محل کی یادگار اور ندوۃ العلماء کے رکنِ اعزازی تھے۔

یکم ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۲۹ جولائی ۱۹۰۰ء کو مجلس انتظامیہ نے مولانا مسیح الزماں صاحب کی تحریک اور مولانا شبلی کی تائید سے فیصلہ کیا کہ چونکہ اکثر علماء بطور خود فتوے لکھتے ہیں، لہذا دار الافتاء کے مصارف برداشت کرنے کی حاجت نہیں، اسی جلسہ میں مولانا خلیل الرحمن صاحب نئے مہتمم مقرر ہوئے، اور تربیت و نگرانی کا کام مولانا عبداللطیف صاحب کے سپرد ہوا۔

نتیجۂ امتحان

دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے بعد پہلا سالانہ امتحان ۲۰ تا ۲۵ شعبان ۱۳۱۷ھ کو ہوا، مولانا عبدالحق صاحب قاضی ریاست بھوپال، مولانا مفتی عبداللہ صاحب پروفیسر

اورنٹیل کالج لاہور، مولانا محمد طیب صاحب مدرس اعلیٰ مدرسۂ عالیہ رامپور، مولانا عبدالجبار صاحب عمرپوری، مولانا عبدالعزیز صاحب فرنگی محلی، بشیرالدین احمد صاحب ہیڈ ماسٹر اسکول کاکوری ممتحن قرار پائے، ان ممتحنین نے دارالعلوم کے معیار تعلیم اور طلبہ کے استعداد کی بڑی تحسین کی، منجملہ ۶۰ طلبہ میں سے ۵۲ طلبہ نے اس پہلے سال کے امتحان میں شرکت کی۔

طلبہ کی قابلیت اور استعداد کا صحیح اندازہ ان معائنوں سے بھی ہو سکتا ہے، جو صاحب علم اور اہل الرائے حضرات نے دارالعلوم کے معائنے اور طلبہ سے ملاقات کے بعد تحریر فرمائے، اس پہلے سال میں کئی اہم شخصیتوں نے دارالعلوم کا معائنہ کیا، ان میں نواب محسن الملک بھی تھے، وہ کتاب المعائنہ (VISITOR,S BOOK) میں لکھتے ہیں:۔

"جو شخص عربی مدارس اور ان کے طریقۂ تعلیم سے واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ نہایت خوبی سے موجودہ نصاب میں اصلاح کی گئی ہے، طریقۂ تعلیم میں بھی پرانے مدرسوں کی تقلید نہیں کی گئی، بلکہ اس طریقے پر عمل کیا گیا جس سے لڑکے اصلی استعداد حاصل کریں، اور بے سود لفظی بحث میں اپنا وقت ضائع نہ کریں، چونکہ اس مدرسہ کے منتظم اپنے علوم سے بھی واقف ہیں، اور نئے طریقۂ تعلیم سے بھی، جس کو علمائے روم و مصر نے پسند کیا ہے، آگاہ ہیں، اور مولوی محمد فاروق چریاکوٹی خوش قسمتی سے ان کو مل گئے ..... لڑکوں کا امتحان میرے سامنے لیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ ان کو پڑھایا جاتا ہے، اور وہ ان کے حافظے ہی میں نہیں رہتا بلکہ دماغ میں بھی ... میں اس قسم کی تعلیم کو اپنے مسلمان بچوں کے لئے نہایت مفید سمجھتا ہوں، اور اس مدرسے کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

محسن الملک ۳۰ اگست ۱۹۰۰ء

آمد و خرچ

اس سال یعنی شوال ۱۳۱۶ھ سے رمضان ۱۳۱۷ھ تک کل آمدنی ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کی مع گزشتہ بقایا چودہ ہزار ایک سو انہتر روپے چودہ آنے چھ پائی ہوئے اور کل صرف دونوں کا دس ہزار چار سو پچہتر روپے چودہ آنے دو پائی ہوا، دارالعلوم کے خاص مصارف چھ ہزار چار سو اسی روپے پانچ آنے ایک پائی ہوئی، اس میں دو ہزار روپے وہ بھی ہے جو علی الحساب تعمیر دارالاقامہ کے واسطے خزانے سے برآمد ہوا۔

گنگا اور سون کے سنگم پر

یہ ذکر اجمالاً گزر چکا کہ ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء کو ندوۃ العلماء کا ایک وفد جس کے ارکان مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری، مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری، مولانا شاہ امانت اللہ غازی پوری، مولانا ابوالخیر صاحب غازی پوری اور مولانا شبلی نعمانی تھے، پٹنہ روانہ ہوا، وفد نے دو جلسوں سے خطاب کیا پٹنہ گورنمنٹ کالج بانکی پور کے جلسے میں تقریباً چار ہزار مسلمان شریک تھے، اس میں دوسرے علماء کے بعد مولانا شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کے تعارف اور اس کے دارالعلوم کی اہمیت پر ایسی پُراثر اور مدلل تقریر فرمائی کہ نئے تعلیم یافتہ حضرات کے دلوں میں اتر گئی، اس جلسے سے علماء اور نئے تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان باہمی اتحاد و معاونت کی راہ ہموار ہوئی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے سحر نگار قلم نے اس کیفیت کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے:۔

"علمائے ندوۃ العلماء نے شروع سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو مانوس کرنے کی جو کوشش کی اس کا ظہور اس مقام پر ہوا جو مسلمانوں کی روشن خیالی کا زبردست مرکز ہے، یعنی بانکی پور.....

.....جب مولوی سید شرف الدین کے ڈرائنگ روم میں قدیم و جدید تعلیم کے قائم مقام اول مرتبہ ملے تھے، جاڑے کی شب تھی، علماء پہلے سے رونق افزا تھے، جب سیاہ اوور کوٹوں سے ہال میں تاریکی پیدا ہوئی تو چونکہ ہمارے محترموں کی نگاہ کے سامنے اول مرتبہ یہ سماں آیا تھا، اس لئے کسی قدر منقبض ہوئے، مگر گفتگو نے جلد اصل حال سے پردہ اٹھا کر ظاہر کر دیا۔ ع

کہ آب چشمۂ حیوان درون تاریکی است

تاریک کوٹوں کے اندر عقیدت مندی اور نور خلوص سے روشن دل چھپے ہوئے تھے۔"[1]

بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "اسی جلسے میں اجلاس پٹنہ کی بنیاد پڑی۔" "اس اجلاس نے خیالات قدیم و جدید کے دو دریا اس طرح باہم ملتے دیکھے جس طرح گنگا اور سون کے سنگم پر یہ مشہور اور تاریخی شہر واقع ہے۔"[2]

ندوۃ العلماء کا یہ اجلاس بڑی شان و شوکت کے ساتھ ہوا، ندوہ کے اجلاس اس کے مقاصد و تخیل کی طرح قدیم صالح اور جدید نافع کا امتزاج ہوتے تھے، اس کی وجہ سے مختلف مکاتب فکر اور مذہب و مسلک کے حضرات اس میں بڑی کشش محسوس کرتے تھے، ندوۃ العلماء کے جلسوں کی یہ بڑی کامیابی تھی کہ اس میں علماء، وکلاء، بیرسٹر، صحافی ادیب، تاجر اور طلبہ سب دوش بدوش حصہ لیتے تھے، پٹنہ کا اجلاس اس کا بہترین نمونہ تھا یہ اجلاس نومبر ۱۹۱۰ء میں ہوا لیکن یہ اپنے نظم و ضبط دینی روح اور جدید وسائل سے استفادہ کی بنا پر اب بھی قابل تقلید ہے، اس اجلاس میں

---

[1] روداد اجلاس میرٹھ ص ۳۵ [2] حیات شبلی ص ۳۱۲

ایک پریس گیلری بھی تھی جس میں اس دور کے مشہور اخبارات "امرت بازار پتریکا" "مہارنیوز بھاگل پور" "وکیل امرتسر" "پنجاب آبزرور" وغیرہ کے ایڈیٹر اور رپورٹر بیٹھ کر کارروائی قلمبند کرتے تھے۔ اس اجلاس کی مختصر روداد جو اس کی مفصل مطبوعہ روداد سے اخذ ہے پیش ہے۔

ساتواں اجلاس

ندوۃ العلماء کا اجلاس ہفتم مورخہ ۱۰ر ۱۱ر ۱۲ر رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ۴ر ۵ر ۶ر نومبر ۱۹۰۰ء روز یکشنبہ، دوشنبہ، سہ شنبہ کو عظیم آباد پٹنہ میں منعقد ہوا معین الندوہ بانکی پور کے جلسے میں اجلاس ندوہ کا عظیم آباد میں منعقد ہونا طے ہوا تھا۔

ریاست بہار کے مرکز پٹنہ جیسے تاریخی شہر میں اجلاس ندوۃ العلماء کی پہلی نشست ۱۰ر رجب کی صبح سے شروع ہوئی، قاری عبدالرحمٰن صاحب کی تلاوت قرآن کے بعد مولانا شاہ رشید الحق صاحب عادی قادری سجادہ نشین خانقاہ پٹنہ اور صدر انجمن استقبالیہ نے خطبۂ مسنونہ کے بعد اپنی تقریر شروع کی، اور فرمایا کہ یہ شہر بڑا خوش نصیب ہے جس میں آج اس قدر علماء اور مشائخ جمع ہیں، جن میں سے ہر ایک شبلیِ وقت اور جنیدِ زمانہ ہے، اس کے بعد آپ نے تحریک کی کہ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری خلیفہ مولانا حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ اس جلسے کے صدر انجمن قرار دیئے جائیں، چنانچہ سب نے مولانا موصوف کی صدارت سے اتفاق ظاہر کیا اور موصوف مسند صدارت پر رونق افروز ہوئے، صدر جلسہ نے مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب قادری سے فرمایا کہ ان کی جانب سے جلسہ کا افتتاح کریں۔

مولانا محمد سلیمان صاحب نے اپنے دستور کے مطابق "اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا"

پر مؤثر تقریر کی، آپ نے فرمایا:-

نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی صلح

ندوۃ العلماء کے مقاصد و اغراض کی حقیقت یہی ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی اور اخلاقی برائیاں دور ہو جائیں، اور اسلام کی ترقی ہو، اس میں سب سے زیادہ ضرورت اصلاحِ تعلیم کی ہے، اس لئے ندوۃ العلماء نے اس کی پہلے ہی فکر کی ہے، لیکن اشاعت ہو تو کیونکر۔ مغربی علوم کے تعلیم یافتہ اور مشرقی علوم کے تعلیم یافتہ میں نہایت ہی درجہ کا تنفر ہے، مگر الحمد للہ اس جلسے میں اور ہمارے اس شہر میں دونوں قسم کے حضرات مجتمع ہیں، اور نہایت صلح و صفائی کے ساتھ ایک دوسرے کی تقریر سننے پر آمادہ ہیں، لہذا میں کہوں گا کہ مدت کے بچھڑے ہوئے مل گئے، اور آج دونوں میں صلح ہو گئی، کون سی صلح مقلد اور غیر مقلد کی؟ کون سی صلح شیعہ اور سنی کی؟ نہیں ہرگز نہیں، اس سے بھی بڑھ کر قابل قدر صلح اور مہتم بالشان صلح، یعنی نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی صلح، دینی و دنیاوی علوم کی صلح، جس کی مسلمانوں کو اشد ضرورت تھی، اور بغیر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہرگز ترقی نہیں کر سکتے تھے، اور کشاکش میں کام خراب ہو رہا تھا، آج کی صلح پر ہم مبارک باد دیتے ہیں ؎

للہ الحمد میان من و او صلح فتاد
حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

دنیوی تعلیم کے مقتدا یہ حضرات نئے تعلیم یافتہ اور مذہبی تعلیم کے مقتدا یہ مقدس علماء لیجئے پھر کیا ہے "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً" دونوں نصیب ہو گیا، اب ہاتھ ملائیے اور پڑھئے "وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"

اہم شرکاء اجلاس

مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی، مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم، مولانا شاہ نظام الدین احمد صاحب جھجھری، مولوی سید شرف الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا بانکی پور، مولانا فاروق صاحب عباسی چریاکوٹی، مولوی نصیر الدین حسین بیرسٹرایٹ لا، شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر پنجاب آبزرور، مولانا شاہ عین الحق صاحب صاحبزادہ شاہ علی حبیب علیہ الرحمۃ پھلواروی مولانا شاہ منیر الدین صاحب رئیس اسلام پور، مولانا حکیم محمد اسحاق خاں صاحب دربھنگوی، مولانا سید سلیمان قادری چشتی، مولانا شبلی نعمانی "اپنی علالت کی وجہ سے اس اجلاس میں شرکت نہیں فرما سکے۔

استاذ الاساتذہ مولانا سید سلیمان ندوی" تحریر فرماتے ہیں:۔

"ندوے کے چھٹے اجلاس شاہجہانپور اور ساتویں اجلاس پٹنہ میں مولانا شریک نہ تھے.... .... یہ ان کی زندگی کے سخت سال گذرے، ۱۸۹۹ء میں اکثر بیمار اور ۱۹۰۰ء میں خانگی معاملات میں نہایت سرگرداں و پریشان رہے۔" (حیات شبلی ص ۳۵۰-۳۵۱)

اس کے بعد حسب دستور سالانہ رپورٹ پیش کی گئی، جسے مولانا عبدالحی مددگار ناظم نے پڑھ کر سنایا:

اپنے مرکز سے باہر

"جناب صدر انجمن وارکان ندوۃ العلماء، اعیان صوبۂ بہار!

ندوۃ العلماء کا پہلا قدم ہے جو اپنے مرکز سے نکل کر دوسرے صوبہ میں آیا ہے، اب تک ندوۃ العلماء کے چھ جلسے ہو چکے ہیں، اور وہ سب ممالک مغربی و اودھ میں ہوئے، اس واسطے زیادہ تر

اسی صوبہ کے مسلمانوں کو ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شریک ہونے اور اس سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے، ندوۃ العلماء جن ضرورتوں کے پورا کرنے کو قائم کیا گیا ہے اور اس سے جو فوائد مسلمانوں کو حاصل ہو سکتے ہیں، وہ اس قدر زیادہ ہیں، جن کو میں اس وقت بیان نہیں کر سکتا صرف دو مقصدوں کی طرف آپ کا خیال میں رجوع کرانا چاہتا ہوں:۔

(۱) اصلاح نصاب و طریقۂ تعلیم (۲) رفع نزاع باہمی علماء۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انہی دو مقصدوں کے ساتھ مسلمانوں کی دینی و دنیوی ترقی وابستہ ہے، اسی وجہ سے جس مبارک وقت میں ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی ہے، اس وقت یہی دو مقصد پیش نظر تھے، پھر رفتہ رفتہ اور مقاصد اضافہ کئے گئے، انہی دو مقصدوں کو پیش نظر رکھ کر ندوۃ العلماء کی شش سالہ کارروائیوں کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے ان مقصدوں کے حاصل کرنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے، ندوۃ العلماء نے اپنے مقاصد کے وسیع دائرے سے امور سیاسیہ کو مطلقاً باہر رکھا ہے، اور یہ اس کے دستور العمل ہی کا جزو نہیں ہے، بلکہ اس نے اپنی شش سالہ کارروائی سے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اس کے قول اور عمل میں کچھ تفاوت نہیں ہے، ندوۃ العلماء کے ارکان اس بات کو اچھے طور پر سمجھتے ہیں کہ اہل اسلام کی ترقی میں جو چیز حارج ہے، وہ جہالت و نااتفاقی ہے، اس وجہ سے انھوں نے انہی دونوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی کارروائی کا آغاز کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے اپنا دلچسپ مضمون "ندوۃ العلماء اور اس کی ضرورت" سنایا اور لوگوں نے اس دلچسپی کے ساتھ سنا کہ بعض بعض موقعوں پر جلسوں کو دُہرانے کی فرمائش کی۔

ندوی طلبہ کا امتحان

اس کے بعد مولوی شاہ نظام الدین احمد صاحب جھجری نے مولوی سید شرف الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا بانکی پور کی خواہش ظاہر کی کہ دارالعلوم کے جو طلبہ اس وقت موجود ہیں ان کا اسی جلسہ میں امتحان لیا جائے تاکہ حاضرین دارالعلوم کے طریقۂ تعلیم کا اندازہ کر سکیں، سب نے اس رائے سے اتفاق کیا، اور صدر انجمن کی اجازت سے واجد علی طالب علم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے چند آیتیں کلام مجید کی نہایت خوش الحانی اور قرأت کے ساتھ تلاوت کیں، سارا مکان مرحبا مرحبا جزاک اللہ کی آواز سے گونج اٹھا، اس کے بعد سید شرف الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا نے کسور مرکب کے ضرب کا ایک سوال دیا، پھر دیر کیا تھی، سلیٹ پر کھٹا کھٹ پنسلیں چلنے لگیں، اور بات کی بات میں سبھوں نے جواب لکھ کر رکھ دیا، اور لطف یہ کہ سب کا جواب صحیح تھا، اس کو دیکھ کر ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدا بلند ہوئی، پھر مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی نے اردو کا یہ جملہ عربی میں ترجمہ کرنے کے واسطے دیا "آج ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس ہے خان بہادر مولوی فضل امام صاحب دیر کر کے تشریف لائے" طلباء نے فوراً اس کا ترجمہ کر دیا۔

پھر ایک طالب علم محمد خالد نے درخواست کی کہ ان کو کچھ وقت دیا جائے کہ وہ اپنا عربی مضمون سنائیں صدر انجمن نے اجازت عطا فرمائی، اور انھوں نے اپنا عربی مضمون سنایا، ایک بارہ سالہ طالب علم نے تقریر کی اجازت طلب کی، سچ یہ ہے کہ اس بچے نے قوم کو جس طرح للکارا بڑے بڑے مقرروں سے نہیں ہو سکتا، تمام جلسے پر محویت طاری تھی۔

تقریر مولوی نصیر الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا

حضرات! میں جس تحریک کی تائید کے لئے کھڑا ہوا ہوں، اس کو آپ خود معلوم کر سکتے ہیں

میرے کہنے کی حاجت نہیں، کیونکہ میری صورت سوال ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں کا یہ جوش تھا کہ "گر جاں طلبی مضائقہ نیست" اور ہائے افسوس اب اسلام کی یہ حالت پہونچی کہ اس کے ہمدرد "زری طلبی سخن دریں ست"!

کہتے ہیں، آہ! وہ کیسے مسلمان تھے، جنھوں نے اسلام پر اپنی جانیں فدا کر دیں، صرف اپنی ہی نہیں، اپنی چہیتی اولاد کی جانیں، ایک مسلمان وہ تھے، اور ایک ہم ہیں، جان کا معاملہ تو اب رہا نہیں، مال پر دار و مدار ہے، اور مال ہمیشہ جانوں پر فدا ہوا کرتا ہے۔

مگر ہائے ہماری قوم، اس امتحان میں پوری نہیں اترتی، میں جس کام کے لئے کھڑا ہوں اس کے بالکل تیار نہ تھا۔

اپنی جان اور مال قربان کر دوں

میں انہی انصاریوں کی اولاد میں ہوں جو اپنی جانیں اور اپنے مال ہمیشہ سے اسلام پر فدا کرتے رہے ہیں، ہمارے پرجوش نوجوان کا اس جملے پر پہونچنا تھا کہ فرطِ گریہ سے آواز بیٹھ گئی اور سارے جلسے میں جوش پیدا ہو گیا (ہمارے نوجوان نے جوش میں آکر اپنی سونے کی گھڑی مع چین جو ساڑھے تین سو روپے کی تھی دے ڈالی) میں اس وقت اس لئے کھڑا ہوا ہوں کہ انصاریوں کی طرح اپنی جان اور اپنا مال قوم اور اسلام پر فدا کر دوں، وہ اسلام جس کو ہمارے آباء نے اپنے خون سے سینچ کر پالا تھا، کیا ہم اس کو ذلیل دیکھ سکتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں، ہمارے معزز علماء کی پگڑیاں اتر جائیں، اور ہم کپڑے پہنے رہیں (پھر ہمارے پرجوش نوجوان نے اپنا کوٹ اور جاکٹ اتار کر دے ڈالا) اگر ہم اسی پاک نسل سے ہیں، تو ہم کو ان کا نمونہ بننا چاہئے، ہم اس جلسہ کو مشاعرہ بنانے کے لئے نہیں آئے ہیں،

ہم یہ دکھانے کو آئے ہیں کہ ہم میں اسلام کی کتنی محبت اور کتنی وقعت باقی ہے اگرچہ ہم ذلیل حالت میں ہیں، مگر آبائی جوش اب تک ہم میں باقی ہے، آبائی خون اب تک ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے، ہم ٹوٹی دیواریں ہیں یا اس کی تصویریں ہیں، ہمارے پیشوا گدائی کو نکلیں اور ہم کھڑے دیکھتے رہیں، بھائیو! اب بھی سنبھلو! اب بھی اٹھو! ان قومی بھکاریوں کی جھولیاں بھر دو، ان اسلامی گداگروں کا دامن بھر دو کہ پھر دوسرے در تک ان کو جانا نہ پڑے! ہائے ہم مدینہ سے ملک فتح کرنے کو نکلے تھے، کاسۂ گدائی لے کر نہیں، ہم اسلامی شان و شوکت لے کر چلے تھے، بھیک مانگنے کو نہیں، ہائے یہ ہمارے مقدس علماء بڑی بڑی درس گاہوں میں درس دیتے ہوتے، تبلیغ اسلام فرماتے ہوتے، مگر ہماری غفلتوں کے نتیجے سے اور ہمارے ہی لئے انھیں آج در در بھیک مانگنا پڑی، آہ! ہم کیا تحریک کریں اور کس بات کی تائید کریں، ہم اپنے ہوش میں نہیں ہیں، ہم سے یہ دیکھا نہیں جاتا کہ یہ نورانی صورتیں ہمارے دروازے پر گداگری کریں، (خدا جانے یہ پچھلا جملہ کس سچے دل سے نکلا تھا کہ سارے جلسے میں کہرام مچ گیا کوئی اپنے ہوش میں نہ تھا، عمامے کپڑے، گھڑیاں، روپے مینہ کی طرح برسنے لگے۔)

کتب خانہ کی ضرورت و اہمیت

جلسۂ سوم میں شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے کتب خانہ کی ضرورت و اہمیت پر ایک مبسوط اور پر مغز علمی تقریر کی اور پوری تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:۔

کہاں ہیں وہ مردانِ باہمت کہ اپنے دفینوں کو کھود کر نکالنے کے لئے تیشۂ فرہاد ہاتھ میں لے لیں، وہ کتب اسلامی کہ جو فی الحقیقت ہر پہلو سے زر و جواہر سے زیادہ مرتبت رکھتے ہیں، دنیا کو دکھائیں، اپنی پرانی کتابوں کو طاق نسیاں سے اتار کر ان کی گرد جھاڑیں، ان کی بوسیدہ جلدیں

گو کتاب کے اصلی نشان سے کچھ واسطہ نہیں رکھتیں، ایسی ہی ضروری ہیں جیسے انسان کے لئے موزوں و مناسب لباس اور ایک دفعہ پھر "افریقہ شمالی" کے مشہور کتب خانوں "قرطبہ" اور "غرناطہ" کے دارالعلوم اور "بغداد" کے بیت الحکمت کا نقشہ دنیا کو دکھا دے، ایک معقول اسلامی کتب خانہ مہیا کرنا ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد میں ایک اہم غرض ہے اور میں نے آج آپ صاحبان کی توجہ اس غرض کی طرف خصوصیت سے دلائی ہے، میں امید کرتا ہوں کہ آج یہاں بھی چندہ شروع ہوتے ہی کئی اہل دل جو اس ضرورت کو محسوس کریں گے وعدہ لکھوائیں گے کہ وہ کتنی کتابیں کتب خانہ ندوۃ العلماء کو وقف کریں گے ؎

سچ تو یہ ہے سوائے عالم کے　　کوئی قدر کتاب کیا جانے

اجلاس کی مختلف نشستوں میں عربی، فارسی اور اردو کی کئی نظمیں پڑھی گئیں جن میں ندوۃ العلماء کو شعراء نے خراج تحسین پیش کیا، سید فضل حق صاحب آزاد کے ترکیب بند کا آخری شعر تھا ؎

جسے کہتے ہیں ندوہ اس طرح روشن ہو نام اس کا
کہ ہو اسلامیوں میں ناظم الملت قوام اس کا

اور ؎

عظیم آباد میں اے دوستو ندوہ نہیں آیا
خدارا اوج پر اسلامیوں کی قسمتیں آئیں

مرزا کمال تجر طہرانی نے اپنے فارسی قصیدہ میں ندوہ کو خراج تحسین پیش کیا ؎

خوشا بر حال ایں دانشوران ندوہ اے مردم　　کہ دارایند جملہ دانش و عرفان و ایقاں را
الٰہی زندہ و خرسندہ ماند ناظم ندوہ　　رساید ایں خدمت او بہ ہزاراں مجد پایاں را

اجلاس پٹنہ میں مولانا محمد فاروق صاحب جاسی چوپا کوٹی نے علم پر ایک قابل قدر تحریر پڑھ کر سنائی ان کے بعد مولوی سید شرف الدین صاحب بیرسٹر نے "انسان کے مقصدِ وجود" پر مفصل تقریر کی جس میں انھوں نے تحریک ندوۃ العلماء اور دار العلوم کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا:۔

دو انتہا پسند گروہ

"عربی اور انگریزی، دونوں کے طرز تعلیم کے نقصان نے ایسی ایسی خرابیاں پیدا کر دی ہیں جس کے نتیجے ہیں اور بھگتنے پڑیں گے، انگریزی تعلیم یافتہ نے عربی تعلیم کو دیکھا تو ان کو علوم جدیدہ سے بے بہرہ پایا، ان کے دلوں سے عالم کی وقعت جاتی رہی، اس لئے ان سے یہ مستفید ہونے سے رہے، ڈر تو یہ ہے کہ آئندہ ان کے دلوں سے مذہب کی بھی وقعت جاتی نہ رہے، عربی تعلیم یافتہ نے انگریزی تعلیم یافتہ کو دیکھا تو عربی دانی سے بالکل ہی بے بہرہ پایا، قرآن و حدیث سے مطلق بے خبر تعمیل اوامر و نواہی میں بے پرواہی اور خود رائی پائی، ان سے تنفر کرنے لگے، قوم میں یہ ایسی نفاق کی صورت پیدا ہو گئی ہے جس سے ہمارے دین و دنیا دونوں ہی کی تجارت گھاٹے میں ہے۔

ندوۃ العلماء کا تجویز کردہ علاج

یونیورسٹی اور عربی مدارس کے طرز تعلیم کی خامیوں نے ہماری دینی اور دنیاوی ترقیوں کو روک دیا ہے، ہمارے جسمانی اور روحانی امراض کو ندوۃ العلماء نے سمجھا اور اس کے علاج کی تدبیریں سوچیں، ڈیڑھ برس ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں ندوۃ العلماء نے ایک دار العلوم قائم کیا گذشتہ مہینے میں نے لکھنؤ اور دار العلوم کو دیکھا وہاں جانے سے پہلے ہمارا خیال تھا کہ دار العلوم

کا مکان کوئی معمولی جھونپڑا ہوگا اور کثافت تو یقینی ہوگی، مگر ماشاء اللہ وہاں تو دس ہزار روپے کا ایک وسیع مکان خریدا گیا ہے جس میں طلبہ کی ورزش، خورد و نوش اور تعلیم و تعلّم کے سامان عمدگی سے مہیا کئے گئے ہیں، دارالاقامہ کے ہر کمرہ میں الماریاں بنی ہوئی ہیں، ایک جگہ دوائیاں رکھی ہوئی ہیں، اور یہ سب اسی پانچ روپے میں، حق یہ ہے کہ ان اللہ والوں نے یہ دارالعلوم نہیں کھولا ہے، علم کا ایک تعویذ نکالا ہے، جس کو گھول کر پلا دیتے ہیں، بورڈنگ کے بچوں کو نہایت تندرست ہشاش بشاش پایا۔

• دارالعلوم کی عمر ابھی ڈیڑھ ہی برس کی ہے، لڑکوں کا امتحان لیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے کم مدت کی تعلیم میں معلموں نے کیا کمال پیدا کیا ہے۔

تعاون کی اپیل

جب ہم ندوۃ العلماء کے اعلیٰ مقاصد سے واقف ہو چکے ہیں تو اس کے کاموں میں ہاتھ بٹانا لازمی ہے، تعلیم کی اہمیت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لئے امداد و زر کی ضرورت پر زور دے کر آپ نے چندہ کی تحریک کی اور آپ نے فرمایا کہ شاہجہانپور کے جلسے میں ایک صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تھے، اور چندے میں دے کر پا پیادہ واپس چلے گئے تھے، آپ بھی اسی جوش اور ہمت سے کام لیں اور اپنے تعاون سے اہل شاہجہانپور کو شرما دیں۔"

اس تقریر کے بعد عام چندے کی مہم شروع ہوئی اور لوگوں نے جوش و خروش اور ایثار و جذبے سے اپنی بساط سے زیادہ چندہ فراہم کیا۔

حسرت آمیز گھڑی

جلسے کے اختتام کے موقع پر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کھڑے ہوئے، اور انھوں نے نہایت پر درد لہجے میں فرمایا:۔

"بزرگان عظیم آباد! جس افسوسناک وقت کے آنے کا کھٹکا تھا، اور جو حسرت آمیز گھڑی آنے کو تھی آخر آ ہی گئی، ابھی جلسہ ختم ہونے کو ہے، اور یہ بزم درہم برہم ہوا چاہتی ہے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کروں۔

حضرات! ابتدا ہی سے میں اس ندوۃ العلماء کے ناچیز خدام میں ہوں اس لئے شروع سے آج تک جتنے جلسے لکھنؤ وغیرہ میں ہوئے، سب میں شریک ہوا، میں نے نہ صرف ندوۃ العلماء کے جلسے دیکھے ہیں، بلکہ مسلمانوں کی دوسری انجمنوں میں بھی شریک ہوتا رہا ہوں اور ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی بہت سے جلسے دیکھے ہیں اس وجہ سے اس قسم کی مجالس کا جو مجھے تجربہ ہے وہ کم نہیں ہے، میں بلا تصنع سچے دل سے کہتا ہوں کہ جو حالت میرے دل پر یہاں طاری ہوئی اور جو اثر یہاں پیدا ہوا ایسا کہیں نہیں پیدا ہوا"

آخر میں انھوں نے ندوۃ العلماء کی طرف سے میزبانوں کا ایسے مؤثر الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور ایسے پُر درد جملوں میں الوداعی تقریر کی کہ دلوں پر تیر و نشتر کا کام کر گئے۔

مولوی نصیر الدین صاحب بیرسٹر پٹنہ کے پورنے کھڑے ہو کر نہایت ہی شستہ الفاظ میں شکریہ کا جواب دیا۔

مولوی شاہ محمد رشید الحق صاحب سجادہ نشین خانقاہ پٹنہ عصا ٹیک کر کھڑے ہوئے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ ندوۃ العلماء کی ترقی کی دعا فرمائی اور

جلسہ برخاست ہوا۔

مہمانوں نے ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا، اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے ؎

دم رخصت زباں تو کھل نہ سکی
دل کی باتیں ہوئیں نگاہوں میں

ندوہ کی طرف سے حکومت کی بدگمانی

تحریک ندوۃ العلماء کے عروج کا زمانہ تھا، صوبہ متحدہ کا انگریز لفٹیننٹ گورنر میکڈانلڈ مسلمانوں پر تیز نظر رکھتا تھا، ندوۃ العلماء کے ایک بڑے حامی منشی اظہر علی صاحب کاکوروی مرحوم لکھنؤ کے مشہور و ممتاز وکیل اور انجمن تعلقداران اودھ کے مشیر قانونی تھے، ان کی سندیلہ کے ایک چودھری صاحب سے حریفانہ کشمکش تھی، چودھری صاحب نے اس موقع کو منشی صاحب کو شکست دینے کے لئے غنیمت سمجھا، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لفٹنٹ گورنر تک تحریک ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں سیاسی بدگمانیوں کی شکایتیں پہونچائیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ندوۃ العلماء کے اہم ارکان نے صوبہ بلکہ برطانوی ہندوستان کو چھوڑ دیا، منشی اظہر علی صاحب مرحوم حیدرآباد چلے گئے، وہاں سے پھر انھوں نے مدینۂ طیبہ ہجرت کی، زندگی بھر وہیں مقیم رہے، انتقال بھی وہیں ہوا، اور جنت البقیع میں آسودۂ خاک ہوئے۔

انھیں دنوں ندوۃ العلماء کے ناظم اور روح رواں مولانا سید محمد علی ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۸ھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی قائم مقام ناظم ہوئے، ان کا قیام دہلی میں رہا، اور وہ بھی ایک ہی سال میں مستعفی ہو گئے۔

مولانا شبلی مرحوم ان دنوں علیل یا خانگی پریشانیوں میں مبتلا تھے، لیکن ان کے

حالات یا سرگرمیوں سے بے خبری ان کے احباب کے لئے باعث تشویش تھی، مولانا حالی مرحوم نے اپنے ۱۶ر جولائی ۱۹۰۹ء کے ایک مکتوب میں مولانا شروانی کو لکھا "مدت سے شمس العلماء مولانا شبلی کا حال معلوم نہیں، ندوۃ العلماء کی نسبت عجیب عجیب افواہیں سنی جاتی ہیں، مگر معتبر ذریعہ سے کوئی بات آج تک نہیں سنی گئی، لفٹنٹ گورنر کے دل میں اس کی طرف سے شکوک کا پیدا ہونا معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے"۔

آٹھواں اجلاس

منعقدہ کلکتہ

۲۲، ۲۴، ۲۵، ۲۶ شعبان المعظم ۱۳۱۹ھ ۵، ۶، ۷، ۸ دسمبر ۱۹۰۱ء

بنگالی مسلمانوں کی پسماندگی

روداد اجلاس ندوۃ العلماء میں کلکتہ کے آٹھویں اجلاس کی روداد کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے :-

"ندوۃ العلماء کا آٹھواں سالانہ جلسہ ہندوستان کے دار السلطنت کلکتہ میں ہوا، نشیبی صوبہ کے حالات بالائے ہند کے حالات سے بہت کم ملتے جلتے ہیں، مردم شماری کے رو سے مسلمان اس صوبہ میں کچھ کم نہیں ہیں، مگر افسوس کہ ہر حیثیت سے برادران وطن کے مقابلہ میں گرتے جاتے ہیں، بنگالی ہندوؤں نے نہ صرف مغربی علوم و فنون میں ترقی کی بلکہ اپنے مذہب اور اپنی زبان کو حد درجہ فروغ دیا، بنگلہ زبان کو انھوں نے اپنی قومی زبان سمجھ کر علوم و فنون کے ذخیروں سے مالا مال کر دیا، سیکڑوں بنگالیوں کا ہم نام سنتے ہیں، جو نئے نئے مضامین پر کتابیں لکھتے ہیں، اور انھیں کے دوش بدوش مسلمانانِ بنگال اپنے اسلاف کے علمی ذخیروں سے

کام لینے کی بھی قابلیت نہیں رکھتے۔

لطف یہ ہے کہ کلکتہ، ڈھاکہ اور چاٹگام وغیرہ بنگال کے بڑے بڑے شہروں میں پانچ مدرسے عربی تعلیم کے لئے موجود ہیں، جن کا ایک لاکھ چھ ہزار روپے سالانہ بجٹ ہے، جس میں سے پچاس ہزار حکومت دیتی ہے اور چھپن ہزار محسن فنڈ سے وصول ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ہندوستان کے جس عربی مدرسے کو جا کر دیکھئے اس میں بنگالی طلباء زیادہ نظر آئیں گے، مگر اس سے خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا، ملک کی آب وہوا کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں پر یکساں پڑنا چاہئے تھا، مگر ان میں حیرت انگیز فرق ہے۔

ندوۃ العلماء کی صدا

ان حالات میں اور ایسے مقام پر ندوۃ العلماء کا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لینا اور اپنی صدا ان کے کانوں میں ڈال دینا بہت بڑی کامیابی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ کلکتہ میں ندوۃ العلماء کا اجلاس بہت وسیع پیمانے پر ہوا، چار ہزار مسلمانوں سے کم کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے، ندوۃ العلماء کے اجلاس عام طور پر تین دن ہوا کرتے تھے، مگر کلکتہ میں داعیان جلسہ کے اصرار سے چار دن تک جلسے ہوتے رہے اور چوتھے دن دوپہر کے بجائے لوگوں کے مزید اصرار سے شب میں جلسۂ عام اور وعظ کا جلسہ رکھا گیا، مولوی سید شمس الہدیٰ صاحب ایم۔ اے وکیل ہائیکورٹ نے جو تقریر ارکان ندوۃ العلماء کے شکریئے میں کی اس میں فرمایا کہ "ندوۃ العلماء کے اجلاس نے مسلمانانِ بنگال وکلکتہ کی آنکھیں کھول دیں اور ان کو اپنی پسماندگی کا سخت افسوس ہوا اور وہ سمجھے کہ ندوۃ العلماء کیا چیز ہے اور کیا کر رہا ہے" نواب سید امیر حسن خاں صاحب سی، آئی، ای سابق پریسیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ نے ارکانِ ندوۃ العلماء اور مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"دنیاوی تعلیم کی جانب مائل کرنے اور توجہ دلانے کے بہت سے اسباب موجود ہیں، ایسی صورت میں دینی اور اسلامی تعلیم کی جانب مائل کرنے کے لئے ایک خاص جماعت کی ضرورت تھی، الحمدللہ اس ضرورت کو ندوۃ العلماء نے پورا کر دیا، میں نے بچشم خود دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جاکر طلبہ کا امتحان لے کر دیکھا ہے، ندوۃ العلماء نے جو نصاب مرتب کیا ہے اور اس کے دارالعلوم میں جس عنوان و طرز پر تعلیم دی جاتی ہے وہ قابل اطمینان اور بہت ہی مفید ہے"

کلکتہ، پنجاب اور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے دور تر مقام ہے تاہم صوبجات مذکورہ کے علماء کثرت سے شریک جلسہ ہوئے اور انجمن حمایت الاسلام لاہور، انجمن نعمانیہ لاہور، انجمن معین الندوہ امرتسر، شملہ، پانی پت، بانکی پور، اسلام پور، مونگیر اور مدرسہ احمدیہ آرہ و دیگر اسلامی انجمنوں کے وکلاء خصوصیت کے ساتھ تشریف لائے تھے۔

آغاز کارروائی جلسہ

ندوۃ العلماء کے اجلاس ہفتم منعقدہ عظیم آباد پٹنہ کے بعد ہی مجلس انتظامیہ نے ندوۃ العلماء کو اس بات کا خیال دلایا گیا کہ اجلاس ندوۃ العلماء کا کلکتہ میں انتظام کیا جائے، اسی خیال سے مولوی شاہ نظام الدین صاحب کا کلکتہ تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں پر ندوۃ العلماء کے مقاصد و اغراض ظاہر کئے جن کو سن کر رؤسائے کلکتہ نے اپنی ہمدردی اور دلچسپی ظاہر کی اور معین الندوہ کے نام سے ایک مجلس قائم کی جس کے سکریٹری خان بہادر مولوی بدرالدین حیدر صاحب اور صدر نواب بہادر مولوی سید امیر حسن خان سی۔ آئی۔ اے منتخب ہوئے۔

اس مجلس نے ۴ ہر ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ کو آئندہ اجلاس کی دعوت دی اور

انتظام دعوت کے لئے ایک اور مجلس قائم کی جس کے ناظم مسٹر غلام حسین عارف آنریری مجسٹریٹ اور صدر جسٹس سید امیر علی صاحب سی۔ آئی۔ ای اور ارکان میں رؤساء، علماء اور عمائدین شہر منتخب ہوئے۔

اسی زمانہ میں مولانا شاہ ابوالخیر صاحب فرزند و جانشین مولانا شاہ امانت اللہ صاحب مرحوم اور مولانا غلام محمد صاحب ہوشیارپوری کلکتہ تشریف لے گئے، ان حضرات کے تشریف لے جانے سے اجلاس کی سرگرمیوں میں ترقی اور تیزی پیدا ہوئی، مولانا شاہ ابوالخیر صاحب کی تقریروں سے باشندگان کلکتہ کو ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد سے واقف ہونے کا اچھا موقع ملا، اس مجلس نے غور و فکر کے بعد ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶ شعبان ۱۳۱۹ھ مطابق ۵، ۶، ۷، ۸ دسمبر ۱۹۰۱ء یہ چار تاریخیں اجلاس کے لئے مقرر کیں۔

جلسۂ عام

پہلے سے یہ امر قرار پا چکا تھا کہ جلسۂ عام تین روز تک دن کو منعقد ہو اور یکشنبہ کو شب میں جلسۂ عام کیا جائے، اس قرارداد کے موافق ایک بجے دن سے جلسۂ اول شروع ہوا، مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری نے صدر جلسہ کو منتخب کرنے کے واسطے تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"صاحبو! ہماری ظاہر بین آنکھوں کے سامنے سے حضور عالی جاہ صلعم کی ذات پاک پوشیدہ ہے اور ظاہری کاروبار، ظاہری صدر انجمن پر موقوف ہے لہذا ایک ایسے شخص کو صدر انجمن قرار دینا ضروری ہے، جو ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نیابت کر سکے، کون نہیں جانتا کہ ہمارے سرکار نے علمائے دین کو اپنا وارث اور نائب قرار دیا ہے، انھیں میں سے

کسی بزرگ محترم کو جو برگزیدہ اور مقدس ہوں اس وقت کے جلسے کے لئے صدر منتخب کر لینا چاہئے، میں تحریک کرتا ہوں کہ مولانا مفتی غلام رسول صاحب امرتسری جو فضل و تقدس اور سن و سال کے اعتبار سے صاحب التعظیم ہیں اس جلسہ کی صدارت قبول فرمائیں، مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلویؒ نے اس کی تائید فرمائی اور باتفاق رائے حاضرین مولانا ممدوح رونق افروز صدارت ہوئے۔

مختلف اجلاس اور اس کے صدر

یہ تو جلسۂ عام تھا، اب جلسۂ اول جس کے لئے تاریخ اور دن مقرر کئے گئے تھے، کی باری آئی، اس لئے کہ اصل تو یہی جلسہ تھا۔

جلسۂ اول منعقدہ شب جمعہ ۲۴ شعبان ۱۳۱۹ھ ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک ہوا، اس کے صدر مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی دہلویؒ تھے، جلسۂ دوم منعقدہ شب شنبہ ۲۵ شعبان ۱۳۱۹ھ کو ہوا، اس کے صدر بھی جناب مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی تھے۔

پھر جلسۂ عام روز شنبہ ۲۵ شعبان ۱۳۱۹ھ ۲ بجے سے ۴ بجے تک جلسۂ دوم اور سوم کے درمیان ہوا، اس کے صدر نشین مولانا شاہ محمد رشید الحق صاحب عمادی قادری سجادہ نشین خانقاہ پٹنہ تھے۔

جلسۂ سوم شب یکشنبہ ۲۶ شعبان ۱۳۱۹ھ ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک منعقد ہوا، اس کے صدر نشین مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی تھے، جلسۂ چہارم ۲۶ شعبان ۱۳۱۹ھ روز یکشنبہ ۸ بجے سے ایک بجے تک منعقد ہوا، اس جلسے کے صدر نشین مولانا شاہ محمد رشید الحق صاحب عمادی قادریؒ تھے۔

پھر جلسۂ عام شب دوشنبہ ۲۷ شعبان ۱۳۱۹ھ ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک منعقد ہوا،

اس کے صدر مولانا شاہ محمد رشید الحق صاحب عمادی قادریؒ تھے۔

اس سال جلسے میں صدارت بدلتی رہی ہے، اسی ترتیب سے یہاں پر اسمائے گرامی ان حضرات کے درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ مولانا مفتی غلام رسول صاحب امرتسریؒ۔

۲۔ مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب دہلویؒ۔

۳۔ مولانا شاہ محمد رشید الحق صاحب عمادی قادری سجادہ نشین خانقاہ پٹنہ۔

اب تمام اجلاس کے اہم شرکاء کے اسماء سن لیجئے۔

(۱) مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری (۲) نواب بہادر سید امیر حسن خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای (۳) مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی (۴) مولانا شاہ منیر الدین صاحب رئیس اعلام پور (۵) شمس العلماء مولانا ابوالخیر محمد صدیق صاحب پروفیسر پریسیڈنسی کالج کلکتہ (۶) قاضی علی احمد صاحب بدایونی (۷) مولانا سید شرف الدین بیرسٹر ایٹ لا بانکی پور (۸) مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (۹) مولانا حکیم عبدالرب صاحب دہلوی (۱۰) مولانا عبدالقدیر صاحب بی۔ اے (۱۱) مسٹر ابوالفضل عبدالرحمٰن صاحب (۱۲) مولانا وحید حسن صاحب سکریٹری محمڈن یونین کلکتہ۔

اہم تقریروں کی تلخیص

مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا: "عقائد و عبادات، معاملات اور تہذیب اخلاق جس پہلو سے دیکھئے، ہر طبقہ کی حالت اپنے اسلاف اور قدماء کی حالتوں کے اعتبار سے گری ہوئی ہے، طرح طرح کے فسادات اور نقائص پیدا ہو گئے ہیں، کج فہمی سے

عقائد میں افراط و تفریط پیدا ہو گئی ہے، عبادات سے خلوص و اہتمام جاتا رہا، بد اخلاقی اور بد معاملگی ایسی عام ہو گئی کہ تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ رہ گئے ہیں، علماء کرام کی ایک دردمند اور سمجھدار جماعت نے اس کو سمجھا انھوں نے دلیری اور ہمت، دلی قوت اور خدا کی تائید و حمایت پر بھروسہ کر کے اعلان کر دیا، صاف صاف لفظوں میں کہ ہماری حالت کی اصلاح ہو سکتی ہے، اور مسلمان پھر سنبھل سکتے ہیں، اس کی رحمت سے کسی حال میں ناامید ہونا اور اس کی قدرت سے کسی امر کو بعید سمجھنا سخت غلطی ہے..... ہمارے پاس کامل حکیم اور حاذق طبیب کا دیا ہوا نسخہ قرآن ہے، جو تمام خوبیوں پر حاوی ہے، جب تک یہ نسخہ ہمارے پاس ہے، اس وقت تک ہم کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں یعنی ہمارا مذہب اور دین فنا نہیں ہو سکتا آپ نے اس تحریک کا ہاتھ نہ بٹایا اور اسے یونہی چھوڑ دیا تو آپ کے ساتھ آپ کا اسلام بھی رخصت ہو جائے گا۔"

اس کے بعد مولانا ابو محمد عبد الحق صاحب دہلوی صدر انجمن اجلاس ہشتم کھڑے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

مخالفین سے گذارش

"دو ایک مولوی صاحبان جو اپنے نفسانی اغراض سے ندوے کے مخالف ہیں، اور مسلمانوں کو اس سعادت عظمیٰ سے روکتے ہیں، اور بجائے اس کے کہ کوئی قومی و ملی کام کر کے دکھاتے، کفر کی کل سے صدہا ہزارہا مسلمانوں اور بڑے گروہ علمائے کرام کو کافر و بے دین بناتے پھرتے ہیں۔

یہ کس کے خیال میں آسکتا ہے کہ صدہا علمائے کرام جن کی عمروں کے بیش بہا حصے دین و مذہب کی خدمت اور اسلام کی تائید میں گزرے ہیں، یکبارگی دین فروشی پر تیار ہو جائیں،

اور بے نورانی صورتیں جن کے چہروں پر اسلام کے انوار چمک رہے ہیں، معاذ اللہ کفر کی تاریکی میں پڑ جائیں، ندوہ کوئی پولیٹکل امور میں دخل دینے والا جلسہ نہیں، ندوہ کو سب سے اول اپنے گھر کی اصلاح مقصود ہے۔

ندوہ کے مقاصد

ندوہ کے یہ چند مقاصد ہیں، علماء کا باہمی میل جول، محبت و اتحاد قائم کرانا، قوت علماء متفرق ہے کوئی سلسلہ اور ارتباط نہیں ایک بال کو ہر ایک توڑ سکتا ہے، اور بہت سے بالوں کی رسی بڑا شہ زور بھی بڑی مشکل سے توڑے گا، لشکر جو ملکوں کو فتح کرتا ہے، اور جس پر سلطنت کی بنیاد ہے، وہ ایک دو بہادروں کا نام نہیں وہ ایک مجموعے کا نام ہے جس میں مختلف اشکال اور خیال اور قوت کے لوگ جمع ہوتے ہیں ان کو جدا کر دیجئے، پھر وہ کچھ نہیں کر سکتے..... اس سے اور بھی بہت سے فوائد ہیں از ان جملہ یہ کہ مسلمانوں پر اثر ڈالنے والا اس مجلس سے کوئی زبردست مؤثر خیال میں نہیں آسکتا، پھر مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کی بابت جو کچھ زمانہ حال کے مناسب تدابیر عمل میں لائے جائیں ان سے بہت کچھ قوم فائدہ اٹھا سکتی ہے، بخلاف اور مجالس کے ان کی روشنی ان کے کمرے سے بھی باہر نہیں جا سکتی۔

(۲) مسلمانوں کے باہم جھگڑے اور بے جا مخالفتیں دور کی جائیں۔

(۳) نصاب عربی کی درستگی..... اب درس عربی میں وہ نئی کتابیں بھی داخل کرنی چاہئیں جو علوم جدیدہ کو حاوی ہوں اور نیز فن ادب اور دینیات و تاریخ، جغرافیہ و ریاضی جدید کی بھی اشد ضرورت ہے..... گویا علماء کی نسل بگڑ گئی اور اب اس باغ میں وہ بار آور پودے نہیں جیسے پہلے لگا کرتے تھے، اس لئے ندوۃ العلماء نے اس کا

احساس کرکے ایک دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جس میں یہ جملہ علوم پڑھائے جائیں اور جملہ نقصانات کا تدارک کیا جائے۔

(۴) علوم عربیہ کو جو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے اس کی فکر کی جائے..... اگر قوم اپنی ہمت و امداد کے پانی سے اس پودے کو نہ سینچے گی تو یاد رکھنا کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے علوم اور اسلام بھی رخصت ہو جائیں گے۔

(۵) مسلمانوں کو کشمکش سے رہائی دینا۔

(۶) اشاعتِ اسلام اور عام مسلمانوں تک دین کی تبلیغ"

انھوں نے تقریر ختم کی اور ساتھ ہی جلسہ برخاست کر دیا۔

روز جمعہ ۲۲ شعبان ۱۳۱۹ھ کو ناخدا کی مسجد میں جلسۂ عام ہوا، مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری نے ایک گھنٹہ تک نہایت درد سے وعظ کہا اور ندوۃ العلماء کے مقاصد و اغراض شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے۔

جلسۂ دوم

جلسۂ دوم شب شنبہ ۲۵ شعبان ۱۳۱۹ھ کو منعقد ہوا، اس کے صدر نشین حضرت مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی دہلوی ہی تھے، مولانا سید عبدالحی مددگار ناظم ندوۃ العلماء نے ندوۃ العلماء کی سالانہ رپورٹ پیش کی۔

اس کے بعد مولانا شاہ مسیر الدین صاحب رئیس اسلام پور تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

دین وعلم لازم وملزوم

"ایسے عظیم الشان جلسے کا مقصد صرف مضمون آرائی اور واہ واہ نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ علماء اور عامۃ المسلمین کے باہم تعلقات پر غور و بحث کرنا اور اس بحث سے صحیح اور پختہ نتیجہ نکالنا اور پھر اس پر استقلال کے ساتھ قائم رہ کر عمل کرنا چاہیئے!..... مسلمانوں کی حالت تمام عالم میں خراب ہے اس کا انحصار کچھ ہندوستان تک ہی نہیں لہذا اس کی جانب ہر فرد مسلمان کو توجہ لازم ہے..... مذہب صرف عاقبت ہی میں کارآمد نہیں، بلکہ دنیا میں بھی انسان کو انسان صرف مذہب ہی بنا سکتا ہے۔

عامۃ المسلمین جب تک مسلمان ہیں انھیں سے گہرا تعلق رہے گا کیونکہ قومیت مسلمانوں کی دین پر مبنی ہے، اور دین اسلام و علم دین مثل لازم و ملزوم کے ہیں.....

مسلمانوں کی ترقی کا تمام دارومدار جس تخیل پر ہے، وہ مذہب ہے اگر ان کا یہ تخیل سرد پڑ گیا یا مر گیا تو قوم بھی مر جائے گی"

اس کے بعد حاجی نور محمد زکریا صاحب نے مختصر تقریر فرمائی، انھوں نے فرمایا:۔

"ہم مسلمانوں کے دین و مذہب اور دینی و دنیوی ترقیوں کا مدار قرآن پاک کے عمل پر ہے اور قرآن پاک کا سمجھنا علوم عربیہ کے جاننے پر موقوف ہے لہذا مسلمانوں کو باعتبار دین و مذہب اور بلحاظ اپنی دینی و دنیوی ترقیوں کے علوم عربیہ کو قائم رکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی سخت حاجت ہے"

اس کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا۔

نونہالوں کا امتحان

اجلاس کی تیسری نشست میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کے امتحان کی تحریک سید شرف الدین صاحب بیرسٹر نے پیش کی، مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم اور مولانا فاروق صاحب مدرس اعلیٰ نے چند طلبہ کو پیش کیا، شمس العلماء مولوی ابوالخیر محمد صدیق پروفیسر پریسیڈنسی کالج کلکتہ نے عربی عبارت ترجمہ اور ترکیب کرنے کو دی، طلبہ نے اس خوبی سے ترجمہ کیا اور خاطر خواہ جوابات دیئے کہ حاضرین دنگ رہ گئے، مسٹر خلیل احمد صاحب ایم۔اے نے فارسی کے درج ذیل تین اشعار عربی منظوم ترجمہ کرنے کو کہا ؎

بیا گر خلد خار آساں برآرم　　چہ سازم بخارے کہ در دل نشیند

ہر گیاہے کہ از زمیں روید　　وحدہٗ لا شریک لہٗ گوید

پانچ منٹ میں طلبہ نے ان اشعار کا مطلب خیز با محاورہ منظوم عربی ترجمہ کر دیا، سب لوگ متأثر ہوئے، خصوصاً مولوی ابوالخیر محمد صدیق صاحب کو از حد مسرت ہوئی۔

جلسۂ عام

روز شنبہ ۲۵ شعبان ۱۳۱۹ھ ۲ بجے سے ۸ بجے تک اجلاس عام پھر منعقد ہوا، اس کے صدر نشیں مولانا شاہ محمد رشید الحق صاحب عمادی تھے، انھوں نے اثناء تقریر میں فرمایا کہ:۔

"حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق اسلام پوری ترقی کے بعد پھر تنزل میں آگیا ہے، اور اس پر غربت چھا گئی ہے، مگر غربت سے افلاس اور محتاجی مراد نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ سچے اور دیندار مسلمانوں کی قلت اور بے انتہا قلت ہو گئی ہے!..... اس حالت کو

دیکھ کر غیرت الٰہی پھر جوش میں آئی اور اس نے چند علماء کو یہ ہمت دی کہ وہ خدا کے واسطے کھڑے ہوں اور مسلمانوں سے مدد چاہیں ــــ انہی علماء کی انجمن کا نام ندوۃ العلماء ہے۔"

اجلاس سوم شب یکشنبہ ۲۶ شعبان ۱۳۱۹ھ سے ۸ سے ۱۱ تک منعقد ہوا اس کے صدر نشین مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب دہلوی تھے تلاوت کلام پاک کے بعد جناب صدر انجمن نے یہ تحریک پیش فرمائی کہ:۔

اہم تجاویز

"حسب دفعہ ۵۶ دستور العمل ندوۃ العلماء کے ایک مجلس خاص منتخب کی جائے، جو ندوۃ العلماء کے دستور العمل پر غور و فکر کر کے اس کی ترمیم کرے کیونکہ اس وقت جو دستور العمل موجود ہے وہ ابتداء میں ضرورت کے موافق بنایا گیا تھا، اب وہ ضرورتیں بدل گئیں"

ندوہ کے بلند بانگ دعویٰ کو جانچنے کے لئے لوگوں نے چند طلباء کا امتحان لیا جس میں تمام حاضر طلباء نے اپنی مستعدی تعلیم اور ذہانت و قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر ایسا بٹھایا کہ لوگ عش عش کر اٹھے ــــ اس کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا۔

اجلاس چہارم

روز یکشنبہ ۲۶ شعبان ۱۳۱۹ھ ۸ سے ۱۱ بجے تک منعقد ہوا، مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب کی تحریک اور قاضی علی احمد صاحب بدایونی کی تائید سے مولانا شاہ محمد رشید الحق صاحب عمادی قادری صدر جلسہ چنے گئے۔

اس کے بعد سید شرف الدین صاحب بیرسٹرایٹ لا بانکی پور تقریر کرنے کھڑے ہوئے،

آپ نے فرمایا:۔

"حضرات! تقریباً سات آٹھ برس کا زمانہ ہوا کہ چند اکابر علماء نے مذہب کی دگرگوں حالت دیکھی، ضرورتِ زمانہ کو سمجھا اور ندوے کی بنیاد ڈالی..... جس کی صدائے بازگشت صرف ہندوستان ہی میں نہیں سنی گئی، بلکہ دور دور مصر و عرب اور دیگر ممالک تک سنی گئی"۔

اس کے بعد شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے ایڈیٹر "آبزرور" تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے آپ کی تقریر کے موقع پر انگریز کمشنر اور دیگر حکام موجود تھے لہٰذا آپ نے یہ تقریر انگریزی میں کی۔

تعجب خیز واقعہ

"انیسویں صدی کے اخیر حصے کا ایک نہایت تعجب خیز واقعہ یہ تھا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مذہب کی طرف از سرِ نو ایک رغبتِ خاص پیدا ہو گئی تھی، حالانکہ اسی زمانہ میں یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا تھا کہ مادہ پرستی اور دہریت کی روز افزوں ترقی کے سامنے مذہب کا چراغ گل ہو جائے گا، مذہب کی پرانی اور سال خوردہ چمک دمک زمانہ حال کے علم طبعیات کے ایجادوں کے چکاچوند کر دینے والی روشنی کے مقابلے میں ماند پڑ جائے گی، اور علمی ترقی کا سیلاب پرانے عقائد کو بہالے جائے گا..... یہ خیال بے بنیاد تھا، اور بجائے اس کے کہ مذہب کے فولادی پنجے کی گرفت بنی نوع انسان کے دلوں پر ڈھیلی پڑ جائے، پھر مضبوط ہوتی جاتی ہے.....!!

جب سے دنیا پیدا ہوئی مذہب نے کئی انقلاب دیکھے، وہ بھی زمانہ دیکھا ہے کہ جب ہر طرف اس کا دور دورہ تھا کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، وہ زمانہ بھی

آیا کہ لامذہبی اور بداخلاقی نے وہ زور پکڑا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آگ مذہب کے رفیع مکان کو خاک سیاہ کر کے رہے گی، مگر خدا کی شان ہے کہ راکھ ہو کر بھی مذہب بار بار جی اٹھتا رہا، اور دلوں کی اقلیم پر حکمرانی کے لئے موجود ہے، اخلاق بنی نوع انسان سے ہمدردی و ایثار، عمل یہ سب خوبیاں اس کی دست بستہ کنیزیں ہیں، جب کبھی مذہب نے ترقی کی یہ اس کے ساتھ رہیں، اور جب کبھی اس کا زوال شروع ہوا تو یہ ضعیف ہوتی گئیں۔

ندوے کا منشاء

ندوے کا منشاء یہ ہے کہ اس بیقراری کو جو آج کل ہر تعلیم یافتہ شخص کے دل میں مذہب کی تلاش کے لئے پائی جاتی ہے رفع کرے، سچے اور اصلی اسلام کا وہ درخت جو ہندوستان میں ہماری بے توجہی اور بے پروائی کی وجہ سے سوکھ گیا ہے، اس کو زندگی بخش پانی سے تروتازہ کیا جائے، جو تیرہ سو برس ہوئے، مکہ مکرمہ میں چاہ زمزم کے قریب سرچشمۂ صداقت سے جوش زن ہوا تھا، اور پھر اس تروتازہ درخت کو جس کے پتے طائف کے باغوں کے درختوں کی طرح ہرے بھرے اور جس کی شاخیں میوے سے لدی ہوں، ان تھکی ہوئی اور متلاشی نظروں کے سامنے پیش کیا جائے، یہ ہے وہ اعلیٰ مگر مشکل کام جو ندوۃ العلماء نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

ندوے کا مقصد یہ ہے کہ علم و حکمت کے ذریعہ سے مذہب کو تروتازہ کیا جائے، یہ تجدید ایسی ہے، جو کسی طرح اغراض ترقی تعلیم یا شائستگی یا حسن انتظام ملکداری کے خلاف نہیں ہو سکتی، بلکہ ان اغراض کے حصول کے لئے ہمارے ہاتھوں میں ایک مفید اور زبردست ذریعہ بن سکتی ہے۔

بعض خود غرض لوگ ذاتی کاوشوں اور کینوں کو مذہبی مخالفت کی آڑ میں نکالنا چاہتے ہیں،

ہمیں ان لوگوں کو اسی حقارت سے دیکھنا چاہئے جس کے وہ مستحق ہیں اور ان کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے احکام میں بدظنی پھیلانے کے باعث ایسے لوگ ہی ہوتے ہیں"

ان کی تقریر ختم ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ جلسے کے برخاست ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

اس کے بعد ایک اور جلسۂ عام شب دوشنبہ ۱۷ شعبان ۱۳۱۹ھ ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک منعقد ہوا اس کے صدر نشیں مولانا شاہ محمد رشید الحق صاحب عمادی قادری چشتی سجادہ نشیں خانقاہ پٹنہ تھے۔

اس کے بعد پرجوش دعا پر جلسہ برخاست ہوا، اور اس وقت عجیب عالم تھا، ہر شخص چشم پرنم زار و قطار رو رو کر الوداع کر رہا تھا ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

آخر میں اجلاس نہم کے امرتسر میں ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

قواعد کتب خانہ ندوۃ العلماء اور ایک رسالے کے اجراء کی تجویز

جلسۂ انتظامیہ ۱۹ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ مطابق ۲۲ جولائی ۱۹۰۲ء میں کتب خانہ ندوۃ العلماء کے قواعد پیش کئے گئے جن میں اکیس قواعد درج ہیں، اس کے علاوہ عام قواعد میں قابل ذکر یہ قاعدہ ہے کہ ناظم ندوۃ العلماء یا ان کے حکم سے کوئی عہدیدار ہر ششماہی پر کتب خانہ کا جائزہ لے گا، کتب خانہ کے اوقات موسم گرما میں ۶ بجے صبح سے ۹ بجے تک، پھر ۳ بجے سے ۹ بجے شب تک، موسم سرما میں ۷ بجے صبح سے ۱۰ بجے تک اور ۳ بجے سے ۹ بجے شب تک رہے گا۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی تحریک اور مولانا عبدالحی صاحب بدوگار ناظم کی تائید سے ندوۃ العلماء کے ماہوار رسالے کے اجراء اور انتظام حسب ذیل منظور کیا گیا۔

(الف) ترتیب انتخاب مضامین مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ذمہ کئے گئے۔

(ب) طباعت واشاعت دفتر ندوۃ العلماء سے کی جائے گی۔

(ج) ابتداءً ۵۰۰ رسالے ماہوار چھپوائے جائیں گے۔

(د) شروع میں رسالہ کا حجم ۴۰ صفحے تک ہوگا۔

(ہ) شوال ۱۳۲۰ھ سے رسالہ جاری کیا جائے گا۔

باقی جزئیات مولانا شروانی اور مولانا سید عبدالحی باہمی مشورے سے طے کریں۔

مولانا شبلی معتمد منتخب، مولانا مونگیری کے استعفیٰ کی نامنظوری

جلسۂ انتظامیہ ۹ رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں حسب تحریک مولانا شروانی و تائید مولانا مسیح الزماں خاں صاحب مولانا شبلی نعمانی کا مجلس نصاب میں انتخاب کیا گیا۔

جلسۂ انتظامیہ ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ روز دوشنبہ مطابق ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء میں مولانا غلام محمد صاحب ہوشیارپوری نے تحریک کی کہ مولانا شبلی نعمانی معتمد مجلس دارالعلوم منتخب کئے جائیں، ملا عبدالقیوم صاحب رئیس حیدرآباد نے تائید کی اور بالاتفاق انتخاب منظور ہوا۔

مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری ناظم ندوۃ العلماء نے نظامت سے استعفیٰ پیش کیا کسی نے اس کی تائید نہیں کی اور بالاتفاق نامنظور کیا گیا۔

ہیضہ کی وباء

جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ میں ناظم صاحب ندوۃ العلماء نے یہ تجویز پیش کی کہ گذشتہ ہیضہ کی وباء کی وجہ سے دار العلوم کو شہر سے تین میل دور بستوی کے مقام پر منتقل کیا گیا تھا لیکن وہاں بڑی دشواریاں پیش آئیں، ان وقتوں پر نظر کرکے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کو شاہجہانپور منتقل کر دیا جائے، وہاں کی آب وہوا بھی اچھی ہے اور دار العلوم کی جائداد بھی، نیز مولانا مسیح الزماں خاں صاحب جیسے ہمدرد رکن وہیں ہیں، چونکہ یہ اہم معاملہ ہے لہذا اس تجویز کو بقیہ ارکان کی خدمت میں بھیجا جائے اور کثرت رائے پر عمل کیا جائے۔

مولانا مونگیریؒ کا استعفیٰ پر اصرار

ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ نے بیان کیا کہ کل میں نے استعفیٰ پیش کیا تھا، وہ منظور نہیں ہوا، مگر غور کرنے کے بعد میں اس کو مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو منظور کر لیا جائے، لہذا میں پھر بہ منت وسماجت اس کی منظوری کی درخواست کرتا ہوں۔

تمام ارکان نے بالاتفاق کہا کہ ہم اس کو منظور نہیں کر سکتے، آپ نے ۸ رجب ۱۳۱۳ھ کے جلسے میں اور اس کے علاوہ کئی بار تحریراً اور تقریراً استعفیٰ پیش کیا، اور اپنی علالت اور معذوری ظاہر فرمائی ہے، مگر ہم ہمیشہ آپ کے استعفیٰ کو منظور کرنے سے معذور رہے، کوئی شخص آپ جیسا متدین اور دردمند ندوۃ العلماء کا نظر نہیں آتا جس کو ہم آپ کا قائم مقام کر دیں، یہ تو آپ ہی کا کام تھا کہ اپنا ذاتی مشاہرہ پچاس روپے ماہوار کا ندوۃ العلماء کو دے دیا، اور اب تک ندوہ اس سے

فائدہ اٹھا رہا ہے، علاوہ اس کے کہ آپ جب لکھنؤ میں ندوے کے کام کے لئے مقیم رہے تو اکثر اپنے خورد و نوش کے مصارف بھی برداشت کرتے رہے اور کرایہ آمد و رفت بھی نہیں لیا، ایسے شخص کو ہم چھوڑ نہیں سکتے، آپ نے ۱۳۱۳ھ کے جلسے میں عذر کیا تھا کہ مال کا کام خود نہیں کر سکتے، اس واسطے جلسے نے ایک مجلس مالیات قائم کی اور مولانا خلیل الرحمن پنشی محمد احتشام علی ناظم مال مقرر کئے گئے، اگر ہم کو کوئی شخص نظامت کے لائق میسر آجائے تو ہم آپ کا استعفیٰ قبول کر سکتے ہیں، علاوہ اس کے آپ کی علیحدگی سے بہت سے خطرات پیش نظر ہیں، جس کی وجہ سے آپ کی علیحدگی مناسب نہیں ہے، ندوۃ العلماء ایک دینی مجلس ہے، اس کا نقصان تمام مسلمانوں کا نقصان ہے، ایسی حالت میں شخصی نقصان کا خیال نہیں کیا جا سکتا۔

جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۰۳ء میں مددگار ناظم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کا استعفیٰ پیش کیا اور یہ تجویز ہوا کہ اس جلسے کو مولانا کے مستعفی ہونے کا نہایت افسوس ہے، ظاہر ہے کہ مولانا درحقیقت بانی اور باعث انعقاد ندوۃ العلماء ہیں، اور مولانا نے اس مجلس کے قائم کرنے سے جو احسان اپنی قوم پر عموماً اور طبقۂ علماء پر خصوصاً کیا ہے اس کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا ان کے خلوص اور ہر دلعزیزی کے اعتبار سے عہدۂ نظامت سے ان کی علیحدگی گوارا نہیں ہو سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے بھی جب مولانا نے علیحدگی کا قصد کیا تو بہ اصرار انہیں اس سے باز رکھا گیا، لیکن چونکہ مولانا کو اپنی معذوری کی وجہ سے نظامت سے علیحدگی پر اصرار ہے، حتیٰ کہ استعفیٰ اخبارات میں بھی شائع کرا دیا تو اب بجز اس کے اور کیا چارہ ہے کہ افسوس کے ساتھ یہ استعفیٰ منظور کیا جائے، اور ناظم جدید کا انتخاب جلسۂ عام سالانہ پر ملتوی رہے۔

یہ بھی تجویز ہوا کہ مولانا سید محمد علی کی خدمت میں مجلس انتظامیہ کی طرف سے ان کے

احسانات کے اعتراف کے ساتھ یہ بھی عرض کیا جائے کہ مجلس ندوۃ العلماء کو جو آپ کی ذات سے وابستگی و تعلق ہے اس کے لحاظ سے ضروری ہے کہ آئندہ ناظم کے انتخاب اور نامزدگی کے متعلق اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

مولانا مسیح الزماں خاں صاحب کا قائم مقام ناظم اور مولانا خلیل الرحمن صاحب کا بحیثیت نائب ناظم انتخاب

یہ بھی تجویز ہوا کہ تا انتخاب ناظم مولانا محمد مسیح الزماں خاں صاحب نائب ناظم باختیارات نظامت کام کرتے رہیں گے۔

حافظ محمد اسمٰعیل کی تحریک اور مولانا غلام محمد کی تائید سے مولانا خلیل الرحمن صاحب بھی نائب ناظم منتخب کئے گئے۔

مولانا خلیل الرحمن صاحب کی تحریک اور مولانا مسیح الزماں صاحب کی تائید سے مولانا محمد علی مونگیریؒ باتفاق آراء رکن انتظامی مجلس ندوۃ العلماء منتخب کئے گئے۔

ماہوار رسالہ کے ایڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا شروانی

رسالہ ماہوار ندوۃ العلماء کی تجویز جو پہلی سطور میں گزر چکی ہے اور صرف مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی ایڈیٹر منتخب ہوئے تھے، اب تحریک مولوی عبدالحی صاحب وکیل چندوسی و تائید منشی اظہر علی صاحب وکیل باتفاق آراء، مولانا شبلی نعمانی بھی ایڈیٹر منتخب کئے گئے۔

نواں اجلاس

منعقدہ ــــ امرتسر

روداد اجلاس نہم ندوۃ العلماء منعقدہ امرتسر کی تمہید میں مرتب لکھتے ہیں :۔

"سنہ ۱۳۱۱ھ کا وہ کیسا مبارک دن تھا جس میں ندوۃ العلماء کی بنیاد قائم ہوئی اور دور دور کے علماء، مشائخ، رؤساء اور عامۂ مسلمین تقریباً پانچ ہزار حضرات یکجا ہوئے اور اختلافات باہمی سے قطع نظر کرکے سب نے اپنی پست حالت پر نظر کرکے اپنی دینی و دنیوی بہبودی کے حاصل کرنے پر بہت چست باندھی اور بالاتفاق اس بات کو تسلیم کیا کہ جب تک ہمارے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں مفید تبدیلی نہ ہوگی اور فضیحت کن نزاعیں دفع نہ ہوں گی اس وقت تک دینی اور دنیاوی فلاح کے حاصل کرنے کی کوششیں بے سود رہیں گی، یہی خیال ندوۃ العلماء کی بنیاد کا پہلا پتھر تھا جس نے اب ایک بہت بڑی عمارت کی صورت اختیار کرلی ہے، یہ خیال ایک سال پہلے قائم ہوگیا تھا، مگر شوال سنہ ۱۳۱۱ھ میں وہ ملک کے سامنے پیش کیا گیا، اور ہر طرف اس کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا، تاہم اب تک اس کا اطمینان نہیں تھا کہ یہ تحریک مضبوطی کے ساتھ قائم ہوجائے گی، لیکن خان بہادر منشی اظہر علی صاحب وکیل لکھنؤ کی عالی ہمتی سے دوسرے سال پہلے سال سے زیادہ پرشوکت اجلاس شوال سنہ ۱۳۱۲ھ میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوا، اور

ہر جانب سے نامور علماء و مشائخ شرکت کی غرض سے تشریف لائے، خود فرنگی محل کے معزز علماء نے حقوق مہمان داری ادا کئے ان کے صاحبزادوں کا مہمانوں کا استقبال کرنا اور جناب مولانا محمد نعیم صاحب مرحوم و مولوی شاہ عبدالوہاب صاحب کا مہمانوں کو فرنگی محل میں دعوت دینا، یہ ایسی کیفیتیں تھیں، جو لوگوں کو ہمیشہ یاد رہیں گی، اس اجلاس میں ندوۃ العلماء کے مقاصد وسیع پیمانے پر ظاہر کئے گئے، مگر جو اصول پہلے سال طے ہو چکے تھے، اس میں کچھ ردوبدل نہیں ہوا، اور اس کی اور بھی زیادہ وضاحت کر دی گئی کہ اس مجلس کو امور سیاست (پالیٹکس) سے کسی قسم کی غرض نہ ہو۔

اسی اجلاس میں مولانا شاہ امانت اللہ صاحب مرحوم اور مولانا محمد ابراہیم صاحب متعفد دو نامور عالموں میں صلح ہوئی، جن میں ایک مدت دراز سے کشمکش تھی، اور تقلید و عدم تقلید کے جھگڑے نے ایک مہیب صورت اختیار کر لی تھی، یہ صلح درحقیقت دو آدمیوں میں نہیں ہوئی تھی، بلکہ بلا مبالغہ لاکھوں مسلمانوں میں ہوئی تھی، جو ان کے حلقہ بگوش تھے، اور خدا کا شکر ہے کہ اس صلح کا اثر اب تک قائم ہے۔

تیسرا اجلاس

تیسرا اجلاس شوال ۱۳۱۳ھ میں بمقام بانس بریلی منعقد ہوا، اور باوجود چند در چند مزاحمتوں کے ایسا پرشوکت جلسہ ہوا جو حیرت انگیز ہے، تخمینہ کیا گیا ہے کہ شب کو وعظ کے جلسوں میں آٹھ ہزار آدمیوں سے کم نہیں ہوتے تھے، علاوہ اس کے شہر میں ہمدردی کا ایسا جوش پیدا ہو گیا تھا کہ جلسے کے بعد ہر طبقے کے مسلمان یکے بعد دیگرے دعوت کرنا چاہتے تھے، اور کچھ ایسا سامان تھا کہ مہمانوں کو ایک مہینہ تک فرصت نہیں ہو سکتی تھی جس وقت صدر انجمن

جناب مولانا محمد لطف اللہ صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد، مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء اور ارکان ندوۃ العلماء رخصت ہوئے ہیں، شاہراہ پر لوگوں کے ہجوم سے گزرنا دشوار تھا، بہنگیوں نے اپنی طرف سے دعوت دینے کی یہ راہ نکال لی کہ وہ گاڑیوں کے آگے چھڑکاؤ کرتے جاتے تھے، یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے، اس کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ عام دلچسپی کا اس سے صحیح اندازہ کیا جاسکے، اسی اجلاس میں دارالعلوم کی مفید تجویز منظور ہوئی تھی جو چند سال سے قائم ہوگیا ہے، اور فیاض مسلمانوں کی سیر چشمی کا منتظر ہے۔

چوتھا اجلاس

شوال ۱۳۱۴ھ میں بمقام میرٹھ منعقد ہوا، اور اس میں پنجاب کے علماء و مشائخ خصوصیت کے ساتھ شریک ہوئے، اس اجلاس میں دارالعلوم پر مختلف عنوانوں سے مباحثے ہوئے اور اس کی ضرورت ذہن نشین کی گئی، علاوہ اس کے تعلیم عربی و انگریزی کے متعلق چند مفید تجویزیں منظور ہوئیں۔

اس سے پیشتر قحط و طاعون کے مصائب ملک پر نازل ہو چکے تھے، اسی واسطے ارکان ندوۃ العلماء نے پانچواں اجلاس اس پیمانے پر کرنا مناسب نہیں سمجھا، مگر انتظامی ضرورتوں کے لحاظ سے شوال ۱۳۱۵ھ میں بمقام کانپور جہاں اس وقت ندوۃ العلماء کا صدر دفتر تھا، ایک جلسۂ خاص کیا گیا، اور اس میں یہ طے کیا گیا کہ دارالعلوم لکھنؤ میں قائم کیا جائے، اور بالفعل اس کا درجۂ ابتدائی کھولا جائے، اسی سال بموجب ایکٹ ۲۱ ۱۸۶۰ء کے صاحب رجسٹرار بہادر جائنٹ اسٹاک کمپنی الہ آباد کے دفتر میں ندوۃ العلماء کی باضابطہ رجسٹری کرالی گئی اور ۷ جمادی الآخر ۱۳۱۶ھ کو لکھنؤ میں دارالعلوم کے افتتاح کا جلسہ کیا گیا۔

چھٹا اجلاس

ذیقعدہ ۱۳۱۷ھ میں بمقام شاہجہانپور منعقد ہوا، اس اجلاس میں علاوہ دوسری کارروائیوں کے دارالعلوم کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی تجویز منظور ہوئی، اور اسی وقت تقریباً ۶۰ ہزار روپے کے نقد و جنس و جائداد وصول ہوئی، ندوۃ العلماء کے رکن رکین مولوی مسیح الزماں خاں صاحب استاذ حضور نظام دکن اور مولوی عبدالواجد صاحب رئیس شاہجہانپور نے بہت بلند حوصلگی سے امداد دی۔

مگر اس بیش قرار امداد کی شہرت سے ملک میں ایک غلط خیال بھی پیدا ہو گیا ہے، اور جو لوگ حقیقت کا تجسس نہیں کرتے اور صرف خیالات پر رائے قائم کرنے کے عادی ہیں، وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ندوۃ العلماء کو جو امداد شاہجہانپور سے حاصل ہوئی ہے، اس کو اس نے بے جا طریقہ سے بغیر لحاظ اصول کفایت شعاری کے صرف کر ڈالا ہے، اسی بنیاد پر ارکان ندوۃ العلماء سے ان کو ایک قسم کا سوءِ ظن ہو گیا ہے، ان کے اطمینان کی غرض سے اس موقع پر اس کی تصریح کرنا مناسب ہے کہ یہ امداد نقد کی صورت میں بہت کم تھی، چالیس ہزار روپے ان جائدادوں کی قیمت کا تخمینہ تھا، جو بہ حیثیت وقف ندوے کو دی گئیں، اور دس ہزار روپے اس کتب خانہ کی قیمت کا تخمینہ تھا، جس کو مولوی عبدالرافع خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر نے دیا، اور وہ بفضلہ تعالیٰ محفوظ و مستعمل ہے، اور تقریباً دس ہزار روپے نقد کی صورت میں تھا، مگر وہ مختلف مدوں کا تھا چندۂ میزبانی، چندۂ رکنیت، امدادِ دارالعلوم وغیرہ سب اسی میں شامل تھے، اس کی تفصیل رودادِ اجلاس ششم میں مع جمع خرچ کے موجود ہے۔

ساتواں اجلاس

رجب ۱۳۱۸ھ میں بمقام پٹنہ منعقد ہوا اور بہت پر رونق جلسہ ہوا، اس جلسے میں جدید تعلیم یافتہ گروہ نے علمائے کرام کے خیالات پر واقفیت حاصل کی، اور ارادت مندانہ طریقہ سے ان کے ارشاد و ہدایت پر عمل کرنے کی آمادگی ظاہر کی، اور ایک مدت سے نئے اور پرانے خیال والوں میں جو ایک حد فاصل قائم تھی، مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ پراگندہ ہو رہا تھا، اس نے بہتری کی صورت اختیار کی۔

آٹھواں اجلاس

شعبان ۱۳۱۹ھ میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا، ہمیشہ تین دن تک اجلاس منعقد ہوتے تھے، کلکتے میں چار دن تک جلسے ہوئے، اور کسی جلسے میں چار ہزار مسلمانوں سے کم نہیں شریک ہوئے، مگر افسوس ہے کہ کلکتہ ایسے شہر کی حیثیت پر نظر کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کو کامیابی بہت کم ہوئی۔

نواں اجلاس

امرتسر میں منعقد ہوا، جس کی روداد اب آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، اس روداد کو ملاحظہ کرنے کے بعد معزز ناظرین اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ جلسہ کس قدر کامیابی اور خوش اسلوبی سے ہوا، بہر حال اس وقت تک جس قدر جلسے ہو چکے ہیں، ان کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس خدا ساز تحریک نے بہت سرسبزی اور شادابی حاصل کر لی ہے، اس کی تدریجی رفتار دلوں میں گھر کرتی جاتی ہے، اور اب اس کا وقت آگیا ہے کہ اس کی مفید اور

کارآمد تجویزیں عملی صورت اختیار کریں۔

اس سال اس کے نویں سالانہ جلسے میں دور دراز مقاموں سے علماء کا تشریف لانا اور جلسے کی کارروائیوں میں دلچسپی سے حصہ لینا اور انسدادِ رسوم قبیحہ کی تجویز کا گرمجوشی سے خیر مقدم کرنا اس بات کی کافی شہادت ہے کہ اس کی تدریجی رفتار بہت مناسب اور مصالح وقت کے موافق تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ اس جلسہ میں ہر طرح کی کامیابی ہوئی، اور معزز میزبانوں کی جانفشانی سے مہمانوں کو بہت آسائش رہی کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہوئی، باوجودیکہ ایک ہزار سے زیادہ مہمان امرتسر میں تشریف لائے تھے، اور کلکتے سے لے کر پشاور تک کے معزز علماء و رؤساء نے قدم رنجہ فرمایا تھا، اس قدر مختلف مقامات کے لوگوں کی مہمانداری کرنا کچھ آسان نہیں ہے مگر ہمارے دوستوں نے دل کھول کر مہمانداری کی، اور ہر طرح کی آسائش پہنچانے میں اپنی تکلیف کا مطلقاً خیال نہیں کیا۔

سب سے زیادہ اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ رؤسائے پنجاب نے صرف جسمانی دعوت ہی نہیں دی بلکہ اپنی زندہ دلی کے ثبوت میں روحانی دعوت سے ندوۃ العلماء میں زیادہ اہمیت پیدا کر دی ہے، اور ہماری اخلاقی تحریک میں عملی طور پر سب سے آگے رہنے کی فکر کر رہے ہیں، جو بہت زیادہ قابل قدر ہے۔

ایڈیٹر صاحبان نے بھی بہت دلچسپی لی، ہم کو ان حضرات کا شکر گذار ہونا چاہئے جو ملک کے خیالات پر حکومت کر رہے ہیں، اور ان کی سلطنت بہت وسیع ہے، شیخ عبدالقادر صاحب مالک مخزن اور ایڈیٹر آبزرور، منشی محبوب عالم صاحب اور منشی عبدالعزیز صاحب ایڈیٹر و منیجر "پیسہ اخبار" مولوی انشاء اللہ خاں صاحب ایڈیٹر "وطن" لاہور، منشی فاضل شیخ غلام محمد صاحب

مالک وایڈیٹر وکیل امرتسر منشی سید امین علی صاحب ایڈیٹر "نیر اعظم" مراد آباد منشی فیروز الدین صاحب ایڈیٹر "منشور ہند" لاہور اور شیخ گلزار صاحب ایڈیٹر "گلزار ہند" وغیرہ نامور ایڈیٹروں کا جو خود یا ان کے قائم مقام ہر جلسے میں موجود تھے ہم زیادہ شکر گزار ہیں، اس جلسے میں انجمنہائے اسلامیہ کے وکلاء بھی حسب دستور موجود تھے، بلکہ پنجاب کے نامور انجمنوں کے ناظمان انجمن نے خود قدم رنجہ فرمایا تھا خصوصاً خان بہادر مہر برکت علی خاں صاحب جنرل سکریٹری انجمن اسلامیہ پنجاب، حاجی شمس الدین صاحب جنرل سکریٹری حمایت اسلام لاہور، مولوی مفتی محمد سلیم اللہ صاحب جنرل سکریٹری انجمن نعمانیہ اور شمس العلماء مولوی مفتی محمد عبداللہ صاحب ناظم استشار العلماء نے جلسہ میں شرکت سے رونق دوبالا کر دی تھی، اور ہمارے دیرینہ معاون خان بہادر محمد زمان خاں صاحب نصرت جنگ مدار المہام ٹیکم گڑھ نے بھی اپنی طرف سے مولوی عبد الغفور صاحب مدرس مدرسہ ٹیکم گڑھ کو وکالۃً شریک جلسہ ہونے کے لئے روانہ فرمایا تھا جس سے جناب ممدوح کی توجہ اور مہربانی کا بین ثبوت ملتا ہے، علماء و مشائخ میں دو سو سے زیادہ مقدس اور پاکباز بزرگ رونق افروز تھے، ان کے متبرک ناموں کو دیکھنے سے جو فہرست میں درج ہیں ان کے فضائل و کمالات کا اندازہ ہو سکتا ہے، خصوصیت کے ساتھ اس بات کو ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ اس جلسے میں پشاور اور اس کے گرد و پیش کے علماء و مشائخ کی تشریف آوری سے ندوۃ العلماء کی وسعت کا دائرہ کس قدر بڑھ گیا ہے، اور ان حضرات نے باوجودیکہ اس قسم کی مجلسوں میں پہلی بار شریک ہوئے تھے، ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کے طریقۂ عمل سے ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

زندہ دلان پنجاب کا شکریہ

بہر حال یہ جلسہ کیا باعتبار کثرت شرکاء کیا باعتبار مہمانداری کیا باعتبار کارروائی کے

بہت کامیابی کے ساتھ ہوا، جس کے لئے ہم کو زندہ دلان پنجاب کا شکر گذار ہونا چاہئے کلکتہ کے چہار روزہ سالانہ اجلاس ہی میں اہل پنجاب کی طرف سے مولانا غلام محمد شملوی نے دعوت دی اور مجلس انتظامیہ ندوہ سے تحریک کی کہ سال آئندہ اجلاس ندوۃ العلماء امرتسر پنجاب میں ہو، مجلس انتظامیہ نے اسے قبول کیا اور سال آئندہ کے جلسے کا امرتسر میں ہونا طے پایا۔

اجلاس اول ۱۷ رجب ۱۳۲۰ھ روز پنجشنبہ وقت صبح مطابق ۹ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو منعقد ہوا۔ مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادری اپنی جگہ سے اٹھے اور یہ تحریک کی کہ ندوۃ العلماء کے اجلاس نہم کے لئے مولانا مسیح الزماں خاں صاحب صدر انجمن قرار دیئے جائیں، مولانا قاضی علی احمد صاحب بدایونی نے اس کی تائید کی، اس انتخاب کو تمام حاضرین نے گرمجوشی سے پسند کیا، اور مولانا رونق افروز صدارت ہوئے، جلسہ کا آغاز قاری سید میراں شاہ مجدد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی قرأت سے ہوا، بعد ازیں امرتسر کے نامور رئیس اور انجمن معین الندوہ کے سکریٹری شیخ غلام صادق صاحب آنریری مجسٹریٹ نے رؤساء امرتسر کی طرف سے ممبران ندوۃ العلماء خصوصاً علمائے کرام و مشائخ عظام کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا، اور ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کے مقاصد و اغراض پر ایک مفصل اور بسیط تقریر فرمائی، آپ نے فرمایا کہ:۔

صرف غلط فہمی تھی

"طبقۂ علمائے کرام اور دیگر مسلمانوں میں عموماً اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں خصوصاً ایک بیگانگی کی صورت نظر آرہی تھی اور بجائے اس کے کہ یہ مغایرت دور ہو روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی، دونوں طبقوں میں ادنی اور خفیف باتوں سے ناراضگی پھیلنی شروع ہو گئی تھی، حتی کہ

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدانخواستہ ان دونوں طبقوں کا آپس میں کچھ تعلق ہی نہیں ایسی حالت میں پروردگار عالم نے بہتر سمجھا اور یکایک چند علمائے کرام کے دلوں میں یہ خیال ڈالا کہ ایک ایسی مجلس قائم ہو جو آپسی اختلافات کو مٹا کر ان میں اخوت و بھائی چارگی کا جذبہ پیدا کر دے ندوۃ العلماء انہی خیالات کا ثمرہ ہے اس جلسہ کی وجہ سے ایک طبقے کو اب معلوم ہو گیا کہ ان میں مغائرت یا اختلاف نہیں تھا بلکہ صرف غلط فہمی تھی اور ناحق ایک کو دوسرا اپنے برخلاف سمجھتا تھا میں اس بات کو پروردگار کی طرف سے سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے ہم کو یہ مجلس عطا فرمائی۔

دین و دنیا

ہم مسلمانوں کی حالت ہرگز بہتر نہ ہوگی جب تک ہماری دینی اور دنیوی حالت نہ سنبھلے گی ہماری زندگی بسر کرنے کے لئے دین اور دنیا ایسے ضروری ہیں جیسے کھیتی کے لئے بادل سے مینھ اور سورج سے گرمی ـــــ دین تو لازمی چیز ہے اور اسی کے لئے تو ہم پیدا کئے گئے ہیں مگر ساتھ ہی دنیا بھی اس سے کم لازمی نہیں ہے ـــــ اگر ہم مسلمانان ہند مذہب سے دور پڑے ہوئے ہیں تو میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ ہم اس دنیا سے بھی ہاتھ دھوئے بیٹھے ہوئے ہیں، نماز ہم نہیں پڑھتے، روزہ ہم نہیں رکھتے، زکوٰۃ ہم کیا خاک دیں جب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تو اللہ میاں کو کیا حصہ دیں؟ دنیاوی حالت دیکھئے تو سوداگری ہم میں نہیں، سرکاری عہدے ہمارے پاس نہیں، وکالت، ڈگری، انجینیری، دیگر اقوام اہل ہند کے مقابلے میں ہمارے پاس عشر عشیر نہیں، ہاں چپراسی گری کو چوانی اور جس قدر رذیل کام خواہ ریل میں خواہ سرکاری دفاتر میں، وہ ہمارے حصے میں رہ گئے ہیں کیا ہمارے مذہب نے تجارت حرام کر رکھی ہے؟ ہرگز نہیں، یہ سب ہمارا قصور ہے اذا کان کبر السن

دنیا کو اگر ہم نے چھوڑ دیا تھا تو کاش ہم سب پورے دیندار ہی ہوتے اگر ہم نے دین چھوڑا تھا تو کاش ہم اعلیٰ درجے کے دنیادار ہی ہوتے، مگر افسوس کہ نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم، نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے"

اس کے بعد صدر انجمن نے افتتاحی تقریر فرمائی، افتتاحی تقریر کے بعد مولانا سید عبدالحی صاحبؒ مددگار ناظم نے ندوۃ العلماء کی سالانہ رپورٹ پیش کی جس میں آپ نے فرمایا:۔

ہمارا اعتقاد

"حضرات! ارکانِ ندوۃ العلماء نے اب تک تکفیر و تضلیل کی پرواہ نہیں کی اور نہایت بلند حوصلگی سے سب و شتم کو برداشت کرتے رہے، اور وہ یقیناً اس کو ہمیشہ برداشت کرتے مگر اس بات کو وہ کیونکر برداشت کر سکتے ہیں کہ جن کو فائدے پہنچانے کے خیال سے یہ گالیاں کھاتے ہیں، وہ بعض وقت ان پریشان تقریروں سے متاثر ہوتے ہیں، اس واسطے میں اس بات کو بآواز بلند کہنا چاہتا ہوں کہ جو شخص ضروریات دین کا منکر ہو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور ہمارے اعتقادات وہی ہیں جو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے تھے۔

یہ اعتراض کہ ہم اپنی مجلسوں میں مختلف خیال کے لوگوں کو کیوں جمع کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری حالت اس بات کو مقتضی نہیں ہے کہ باہمی آویزش اسی طور پر رکھی جائے جیسی کہ تھی، اس وقت سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ہم اختلاف و اتفاق کے حدود قائم کریں اور مناظرے کو تحقیقات علمی و مذہبی پر محدود کر کے ان چیزوں کے استحکام کی کوشش کریں جو سب کے لئے یکساں اور مشترک طور پر مفید ہے۔

دنیا میں جتنے کام ہوتے ہیں وہ ایک شخص کے کرنے سے نہیں ہوتے ایک مکان بنوانا ہوتا ہے

تو انجینیر کی، معماروں کی، مزدوروں کی، اور مختلف قسم کے اسباب تعمیرات کی ضرورت ہوتی ہے، مزدور معماروں کا اور معمار انجینیر کا کام نہیں کر سکتے، اور انجینیر روپئے سے مستغنی نہیں ہو سکتا، وہ مکان ہمیشہ عالم خیال کا ایک خواب رہے گا، جب دنیا کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں ایک خفیف ضرورت تعاون و تناصر کی محتاج ہے اور اس میں مختلف مذاق اور مختلف مشرب کے لوگوں کی حاجت ہوتی ہے تو اتنے بڑے کام میں کیونکر اس کی ضرورت نہ ہوگی۔

مفید اصلاحات

ندوۃ العلماء نے سال زیر بیان اپنے ماتحت دار العلوم کی پوری نگرانی اور اس میں نظم و نسق میں مفید اصلاحیں کی ہیں، مثلاً دار العلوم کے متعلق ندوۃ العلماء نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے درجۂ متوسط کے دوسرے سال کی خواندگی کھولنے کی منظوری دی اور اس کا نصاب تجویز کیا، اور مجلس دار العلوم کے ارکان کا از سر نو انتخاب کیا اور سب سے زیادہ مفید انتظام یہ کیا کہ تقسیم خدمت کے اصول پر ارکان مجلس دار العلوم میں سے بعض بعض کو ایک ایک خدمت سپرد کر دی، نصاب درس کی ترتیب و ترمیم کے واسطے اب تک کوئی خاص مجلس نہیں تھی، سال زیر بیان میں اس کام کے واسطے ایک خاص مجلس قائم کی گئی ہے۔

کتب خانے کا بھی کوئی مستقل انتظام اب تک نہیں تھا، اس کا بھی حالت موجودہ کے لحاظ سے معقول انتظام کیا گیا ہے اور ایک علٰحدہ مکان اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے"

رپورٹ ختم ہونے کے بعد شیخ عبد القادر صاحب ایڈیٹر آبزرور لاہور اپنی جگہ سے اٹھے، آپ نے فرمایا:۔

غنیمت ہے

"ندوے کے فرائض و مقاصد و اغراض نہایت ذمہ داری کا اور مہتم بالشان کام ہے، جتنا اہم ہے اتنا ہی دشوار اور دیر طلب، جیسا کہ تمام بڑے بڑے کام ہوا کرتے ہیں، مذہب کا لوگوں کے طبائع پر بڑا زبردست اثر ہوتا ہے، اور یہ طاقت..... ہمارے مقدس علمائے دین کے ہاتھ میں ہے یہی جدھر چاہیں، امتِ محمدیہ کی اس طاقت کو لگا سکتے ہیں، اور جو کام چاہیں اس سے لے سکتے ہیں، ہم دنیا دار لوگ بخوشی ان کے ساتھ مل کر بہبودِ قوم کے لئے سعی اور جانفشانی پر آمادہ ہیں، یہ بات بظاہر دل کو لگتی اور کھٹکتی ہے کہ گذشتہ آٹھ سال کے معقول عرصہ میں ندوے نے کیا... کر کے دکھلایا ہے، لیکن بامعان نظر دیکھیں تو اس اعتراض کی ذرا بھی وقعت باقی نہیں رہتی کیونکہ اصلاحِ قوم اور پھر اصلاح بھی کیسی؟ مذہبی و معاشری کچھ بچوں کا کھیل یا منہ کا نوالہ نہیں کہ دیکھتے دیکھتے ہپ کر جائیں، ابتدا میں ندوے کو جو مشکلات پیش آئیں اور جن دقتوں کا سامنا ہوا ان پر نظر کرتے ہوئے جو کچھ ندوے نے اب تک کیا بس غنیمت ہے۔"

اس کے بعد شمس العلماء علامہ شبلی نعمانیؒ وفورِ شوق اور شدتِ انتظار کی جھرمٹ میں اسٹیج پر تشریف لائے، اور اپنا ترکیب بند ایسے مؤثر اور درد انگیز لہجے میں پڑھا جس کو سنتے وقت سامعین ہمہ تن گوش اور سراپا حیرت بن گئے تھے، اس کے آخری چند اشعار تھے ؎

دریں بسی کہ دریں کار چہ تدبیر بود	دین و دنیا بہم آمیزکہ اکسیر بود
گرچہ ایں مرحلہ دشوار گزار افتادست	پائے را کار دریں راہ بہ خار افتادست
دین و دنیا بہم آمیختن آساں نبود	گوئیا کشتی بہ گرداب دو چار افتادست
نسبت فلسفہ و شرع بداں می ماند	کہ خزاں در عقبِ بادِ بہار افتادست

حل این مشکل اگر خواہی تو از مردہ مجواہ — او کشاید گرہے را کہ بکار افتاد دست

حکمت و شرع درین جا بہم آمیختہ اند — نمک و بادہ درین میکدہ یار افتاد دست

عقل را نیست سر رشتہ ایں جا بہ نقل — پنبہ را آتشی ایں جا بہ شرار افتاد دست

شبلی آہنگ دعا کن کہ سخن گشت دراز

گرچہ دانم کہ قلم سحر نگار افتاد دست

اس کے بعد مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب کی دعا پر اجلاس اول ۱۱ بجے برخاست ہوا۔

دوسرا اجلاس ۱½ بجے سے ۴½ بجے تک روز پنجشنبہ ۶ رجب ۱۳۲۰ھ کو منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا مسیح الزماں خاں صاحب رئیس شاہجہانپور نے کی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رئیس بھیکن پور نے "مسلمانان ہند کی ضرورت" پر اپنا مفید اور قابل قدر مضمون پڑھا، لکھتے ہیں:۔

ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں

"انسان کی ضرورت بلحاظ اس کے حالات کے مختلف ہوتی رہتی ہے، موسم سرما ایک قسم کی ضرورتیں ساتھ لاتا ہے، گرمیوں میں دوسرے قسم کی پیش آتی ہیں، صحت کی ضرورتیں اور ہیں، اور مرض کی اور..... اس زمانہ میں ہماری حالت خصوصی یہ ہے کہ ایک ایسے ملک میں آباد ہیں جس میں مختلف مذاہب کی پابند مختلف قومیں سکونت پذیر ہیں، ان قوموں میں سے اکثر قومیں نہایت کوشش کے ساتھ اپنی ترقی میں سرگرم ہیں، اور جوش ترقی میں دوسری قوموں کے کچل جانے یا پس جانے کی ان کو پرواہ نہیں مسلمان مغربی تعلیم میں اور قوموں سے پیچھے رہ چکے ہیں، اور بلحاظ خیالات کے پستی و بلندی اور وسعت و تنگی کے ان میں صاف اور صریح فرق پایا جاتا ہے، مسلمانوں کی اخلاقی، تمدنی، مذہبی حالت پست ہے، اور روز بروز گرتی جاتی ہے، عموماً قوم کے

خیالات پر افسردگی چھائی ہوئی ہے، اور پست ہمتی اور غفلت اس کی رگ وپے میں سرایت کر گئی ہے، حالات بالا میں سے ہر ایک حالت نے جداگانہ ضرورت مسلمانوں کے واسطے پیدا کی ہے، ان ضرورتوں کی دو بڑی قسمیں ہو سکتی ہیں، دینی اور دنیوی۔

دوسری قوموں کی سرگرم کوشش، ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اگر ان کے قدموں کے نیچے پسنا نہیں چاہتے تو خود بھی میدان ترقی میں مردانہ وار آئیں اور دلیرانہ مقابلہ کریں۔

دینی ضرورت

اب دینی ضرورتوں کو لیجئے، ضرورت کی تنقیح کے واسطے، اول ایک نظر اپنی مذہبی و اخلاقی حالت پر ڈالنی چاہیئے، میں نے مذہبی و اخلاقی حالت کو ایک سلسلہ میں لیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اخلاق سے جدا نہیں، جو احادیث پاکیزگیِ اخلاق کے بارے میں آئی ہیں، وہ صاف کہہ رہی ہیں کہ ایمان و اخلاق اس طرح باہم وابستہ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ "اسلام خلق نیک ہے، کمال ایمان حسن خلق ہے" جب ایمان و اخلاق کا اس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے تو ان دونوں سے ایک ہی سلسلہ میں گفتگو کرنا ضروری ہے۔

اول عبادات کو لیجئے، مقام تأسف ہے کہ کثرت سے مسلمان ایسے ہیں، جو ہر قسم کی عبادات کے تارک ہیں، سنت اور نفل ایک طرف فرض و واجب بھی ادا نہیں کرتے، اب ایک نظر اخلاقی حالت پر ڈال لیجئے۔

ہماری اخلاقی حالت جس درجہ زبوں ہے، اس کے بیان کرنے کے واسطے ایک دفتر درکار ہے، ابتدائے عہد میں مسلمان جیسے پاکیزہ اخلاق اور پاک باطن تھے ویسے ہی افسوس ہے کہ اب ہم برے اخلاق میں بدنام ہیں، حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جتا جتا کر جن اخلاقی

برائیوں سے آگاہ کیا تھا، انھیں میں ہم مبتلا ہو گئے، اور تاکید کہ کے جن بداخلاقیوں سے احتراز کرنے کی ہدایت فرمائی تھی، حیف کہ ہم انھیں میں پھنس گئے، ہمارے ہر طبقے میں جھگڑوں کا طوفان موجزن ہے، جو بہت سی بداخلاقیوں، برائیوں کا پھیلانے والا، اور بہت سی صفات نیک کا ڈبونے والا ہے، بھائیوں کی رسوائی پر خوشیاں منائی جاتی ہیں، موافقوں کے لئے جنت کے دروازے، مخالفوں کے واسطے دوزخ کے پھاٹک کھول دیئے گئے ہیں، پیٹ بڑھ گئے ہیں، کاہلی نے جکڑ لیا ہے، تنگدلی نے حواس کو ایسا مختل کر دیا ہے کہ نا اپنی ہستی، جنچتی ہے نا دوسروں کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے، معاملات کی داستان سنئے، ہم عہد کرتے ہیں توڑنے کو، ہم وعدہ کرتے ہیں خلاف کرنے کو، ہمارے حرکات وسکنات پر خود غرضی فرمانروا ہے، قوم کو، ملک کو، وضع کو، غرض ہم کو جو کچھ مل سکے، اس کو اپنی غرض پر قربان کرنے کو ہم آمادہ ہیں، اخلاص عنقا ہو چکا ہے، نفاق نے دلوں پر سکہ جما لیا، قیامت یہ ہوئی کہ نئے رنگ نے نفاق کو پالیسی کا لباس پہنا کر اور زیادہ خوشنما اور دل آویز بنا لیا، کاہلی کی عادت نے ہم سے ہمت واستقلال کو یک لخت سلب کر لیا ہے، ہمارے ارادوں کو بقا نہیں، ہمارے کاموں میں جان نہیں، ہماری مذہبی واخلاقی حالت نے دل اور دماغ کو عبادات ومعاملات سب ہی کو جادۂ راست سے منحرف کر دیا ہے، بخلاف اس کے ۱۸۵۷ء سے پہلے جو دور ہماری سوسائٹی کا تھا، اس میں انصاف، دلی محبت وضع کی پابندی، راست بازی، قول کا پاس ولحاظ، ادب اور حیاء، متانت اور وقار، اس زمانے سے بہتر زیادہ پایا جاتا تھا، اس زمانے کے بزرگوں میں اخلاق، محبت، مروت، دوستی کا برتاؤ دوستی کا پاس، دلی نیکی، فیاضی، متانت سب ان میں جمع تھے، پہلے سوسائٹی میں راست بازی زیادہ تھی، اب حالت برعکس ہے، کاروبار کے فروغ کے اثر سے بازار میں راست بازی زیادہ ہے، اور سوسائٹی میں بہت کم، پہلے جن دو شخصوں میں دوستی ہو جاتی تھی، تو اس کا نباہ ان کی

ذات تک ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ ان کی اولاد اور عزیزوں تک پہنچتا تھا۔

ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کا احساس کیا

نہ اب وہ زمانہ ہے، نہ اب وہ لوگ جن کی صحبت سے ہم تربیت پاتے تھے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت کے تنزل کا اصلی سبب علمائے ربانی کے اس فیض کا کم ہو جانا ہے جو مسلمانوں کی روح کو تازہ اور دلوں کو زندہ رکھتا تھا مسلمانوں کی دینی و اخلاقی حالت کا سنبھلنا قطعاً تعلیم مذہبی پر موقوف ہے، مادی مذہب اور فلسفے کے پیشوا، ہربرٹ اسپنسر کو آخر کار اپنے مستحکم خیالوں میں ترمیم کر کے اس امر کا اعتراف کرنا پڑا کہ انسان کی بہبودی کے لئے صرف عقلی تعلیم کافی نہیں بلکہ ایسی تعلیم بھی ضروری ہے، جو اس کے اخلاق کو پاک کر سکے لارڈ کرزن نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ "جو تعلیم مذہب سے خالی ہو وہ مثل اس مکان کے ہے، جس کی بنیاد نہ ہو"..... ایسے علماء قوم میں موجود نہ رہے، جو وسیع خیال اور اپنے علم پر قادر اور اپنی ذات سے خوبیِ ایمان کا نمونہ ہوں، ضروریات قومی میں داخل ہے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا ہے، جب تک کہ علماء باہمی نزاعوں کو دور کر کے متفقہ کوشش سے نصاب مروجہ کی ترمیم اور موجودہ عربی طلباء کی تعلیم و تربیت کے طریقے کی اصلاح نہ فرمائیں، ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کا احساس کر کے رفع نزاع باہمی اور اصلاح نصاب تعلیم کو اپنے مقاصد میں شامل کیا ہے، یہ مجلس علماء کی ہے، اور اس کے مقاصد وہ ہیں، جو ہمیشہ سے علماء کے فرائض رہے ہیں، ندوۃ العلماء کے اہم مقاصد میں عربی مدارس کے نصاب مروجہ کی اصلاح کرنا ہے، نصاب تعلیم کا تبدیل کرنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً نہایت ہی مشکل اور دقت طلب ہے، جس کو صرف ایسے علماء کر سکتے ہیں، جو تعلیم کا

تجربہ اور خیالات کی وسعت رکھتے ہوں، طریقۂ تعلیم کا بدلنا اور بھی زیادہ دشوار ہے.....
دارالعلوم اس اصول پر قائم کیا گیا ہے کہ وہ ایسے علماء پیدا کرے گا، جو مذہبی و اخلاقی اصلاح کرنے پر قادر ہوں گے، اور اپنی جیّد استعداد، اخلاقی قوت اور وسعت خیال کی بدولت ہر طبقہ اور ہر گوشہ میں اپنی ہدایت کا عمدہ نمونہ پہونچا سکیں۔

نہ معجون مرکّب نہ جدید فرقہ

ندوۃ العلماء کا دوسرا اہم مقصد علماء کی باہمی نزاع کا رفع کرنا ہے، ندوۃ العلماء کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کل فرقوں کو ملا کر ایک معجون مرکّب بنائے اور نہ وہ اس طرح ایک جدید فرقے کے پیدا کرنے کی فکر میں ہے، ندوہ نے جو معتدل روش اختیار کی ہے، اس سے ایک اور بھی فائدہ حاصل ہوا ہے، وہ یہ کہ جدید تعلیم یافتہ فرقے کی اس بدظنی میں بہت کمی.... پیدا ہو گئی ہے، جو ان کو علماء کی جانب سے تھی، وہ اب ان سے مانوس ہوتے جاتے ہیں، اور ان کی باتوں کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں..... میری اس تمام سامعہ خراشی کا خلاصہ یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو ترقی دینا اس زمانے میں ضروریات قومی میں سے ہے، اسی کے ساتھ یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ تعلیم انگریزی کی راہ میں مسلمان اپنا دین اور مذہب نہ کھو بیٹھیں بلکہ مسلمان مسلمان رہ کر مغربی تعلیم و شائستگی میں ترقی کریں"

ان کے مضمون سنانے کے بعد دعا پر اجلاس اول برخاست کر دیا گیا، اس کے بعد جلسۂ عام ۸ بجے سے ۱۱ بجے شب تک شیخ خیر الدین صاحب کی عالیشان مسجد امرتسر میں منعقد ہوا، ۷ رجب ۱۳۲۰ھ روز جمعہ مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء ۲½ بجے سے ۱۱ بجے تک جلسۂ سوم منعقد کیا گیا، کرسئ صدارت پر مولانا مسیح الزماں خاں صاحب استاذ حضور نظام دکن

جلوہ افروز تھے اس کے بعد حضرت مولانا عبدالحی صاحب نے ایک تجویز پیش کی۔

رسوم قبیحہ کی اصلاح

"منجملہ مقاصد ندوہ کے ایک مقصد رسوم قبیحہ کی اصلاح ہے اس کو زیادہ قوت کے ساتھ عمل میں لانے کے واسطے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ جو علماء ندوہ میں شریک ہوں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں وعظ و نصائح کے ذریعہ سے اس سال شادی کے رسوم میں سے ناچ، گانا، آتش بازی اور غمی کے رسوم میں سے محض نام و نمود کے لئے آسودہ لوگوں کو کھانا کھلانے کی برائیاں عامۂ مسلمین کے ذہن نشین کر کے ان کے ترک کی تاکید کریں، نیز انجمن ہائے معین الندوہ سے درخواست کی جائے کہ وہ بھی رسوم مذکور کے انسداد کی کوشش کریں"۔۔ آپ نے تجویز پیش کرنے کے بعد فرمایا:۔

"رسوم قبیحہ کا مٹانا ندوۃ العلماء کے مقاصد میں داخل ہے یہ یقینی امر ہے کہ اگر علماء و مشائخ اپنے اپنے حدود اثر میں رسوم بد کو مٹانا چاہیں تو خاطر خواہ کامیابی ہو سکتی ہے چونکہ دفعتاً تمام رسوم بد کا اٹھا دینا ہماری قوت سے باہر ہے اس واسطے تبدریج کارروائی کرنا مناسب ہے جو علماء و مشائخ ندوہ میں شریک ہیں اس سال اپنے حلقۂ اثر میں وعظ و نصائح کے ذریعہ سے شادی کے رسوم میں سے رقص و سرود و آتش بازی اور غمی کے رسوم میں سے محض نام و نمود کے لئے آسودہ لوگوں کو کھانا کھلانے کو اٹھا دیں اور انجمن ہائے معین الندوہ بھی اس کی تعمیل کریں، علمائے کرام اپنے مواعظ میں خصوصیت کے ساتھ اس کا لحاظ رکھیں اور صرف مواعظ ہی میں نہیں بلکہ عملی طور پر اس کی کوشش کریں" مولانا قاضی علی احمد صاحب بدایونی اور پیر جماعت علی شاہ صاحب نقشبندی نے بہت خوش اسلوبی کے ساتھ اس تجویز کی تائید کی۔

رسوم نے اخلاق تباہ کر دیئے

اس کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رئیس بھیکن پور نے تجویز کی تائید میں نہایت معقول اور برجستہ تقریر فرمائی، آپ نے اثنائے تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ جو رسوم قبیحہ ہم میں رائج ہیں انھوں نے مختلف قسم کی مضرتیں ہم کو پہونچائی ہیں، برے رسوم کے اثر سے اخلاق تباہ ہو گئے، ان ناشدنی رسوم کی زیر باریوں سے مسلمانوں میں اتنی سکت باقی نہیں رہتی کہ وہ کسی مفید کام میں بیش بہا مدد دے سکیں، سب سے زیادہ زبوں نتیجہ ہماری بری رسم و رواج کا یہ ہوا ہے کہ غیر قوموں کو اس نے خود مذہب اسلام سے بیزار کر دیا، اسلام کی ساری خوبیاں ان کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہیں، پہلے بزرگ اپنی پاکیزہ طرز زندگی سے غیروں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیتے تھے ہم اپنے طرز معاشرت سے ان کو متنفر بنا رہے ہیں۔

اگر تحمل کے ساتھ مسلسل رسوم قبیحہ کی قباحتیں لوگوں کے ذہن نشین کی جائیں تو نتیجہ خاطر خواہ پیدا ہو سکتا ہے، اس بارے میں نمونہ اور مثال بہت زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے، علمائے کرام کا جو اثر قوم میں ہے، وہ اس بارے میں بہت کچھ مفید ہو سکتا ہے، میں اس تجویز سے اتفاق کرتا ہوں کہ جو علماء اس جلسہ میں تشریف فرما ہیں، ان سے استدعاء کی جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس بارے میں کوشش کریں اور جو رسوم زیادہ قبیح ہیں، اولاً ان کے رفع کرنے کی ہدایت فرمائیں، وہ رفع ہو لیں تو اور رسوم کو لیں، اس طرح رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے، اس کے بعد جلسۂ سوم برخاست کر دیا گیا۔

مسلمانوں کی ترقی کا راز ــــــ اخوت

۷ رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء ۲½ بجے سے ۴½ بجے تک جلسۂ چہارم

منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا مسیح الزماں خاں صاحب استاذ حضور نظام دکن نے کی، ابتداء میں مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء نے دارالعلوم کی رپورٹ پیش کی، جس میں کہا گیا کہ اس وقت ایک سو سولہ (۱۱۶) طلباء زیر تعلیم ہیں ان میں بیس (۲۰) طلباء کی کفالت دارالعلوم کرتا ہے، ۳۹ طلباء مستطیع ہیں، بقیہ شہر اور اطراف شہر کے طلباء ہیں۔

حکیم امین الدین صاحب بیرسٹر و گورنمنٹ ایڈوکیٹ شاہ پور تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، آپ نے فرمایا:۔

"میں مسلمانوں کی ترقی کا اصلی سبب اخوت اسلامی کو سمجھتا ہوں..... والٹر نے جب لندن کی سوسائٹی کو بدلنا چاہا تو اس کے خیالات کا سرچشمہ اسلام ہی تھا، افسوس ہے کہ دوسری قومیں تو ہمارے اصول کو اپنا راہنما قرار دیں اور ہم ان سے بھاگیں، علامہ ابن رشد کہتے ہیں کہ "کبھی کسی قوم کو بے وجہ زوال نہیں ہوتا، یہ امر مسلمہ ہے کہ جب سے ہم نے مذہبی تخیل کو چھوڑ دیا اسی وقت سے تنزل شروع ہوا ہے"

انھوں نے تقریر ختم کی اور مولانا محمد شاہ صاحب رئیس و وکیل امرتسر نے تعلیم کے موضوع پر اپنا مقالہ سنانا شروع کیا۔

اپنے سطحی علم کو بحرِ بے پایاں سمجھنا

حضرات! لفظ تعلیم ایک ایسا وسیع اور معنی خیز لفظ ہے اور اتنے انواع و افراد پر حاوی ہے کہ اگر اس کو ہم اصل غرض وجود انسانی کہیں تو بجا ہے، اس موقعہ پر یہ اہم مسئلہ درپیش ہے کہ تعلیم کس نوع کی ہونی چاہیئے..... قدیمی سلسلۂ تعلیم پورا تسلی بخش نہیں اور فی زمانہ کی لائق اور آزمودہ کار اصحاب اسلامی یونیورسٹیاں قائم کرنے میں ساعی ہیں، اور اپنے پُرجوش

خیالات کی ریشہ دوانی کر رہے ہیں، اگر زمانہ مستقبل میں کوئی ایسی یونیورسٹی قائم بھی ہو تو تعلیم کو اتنا محدود نہ کرنا چاہیئے، جس سے طلباء تنگ نظر اور مغرور پیدا ہوں، اگر نوجوان طالب علموں کو علوم دینیہ سے مزین کرنا مقصود ہے تو دیگر مذاہب و عقائد سے واقفیت ضروری ہے، تاکہ خیالات میں وسعت پیدا ہو، میں ایسے ادیب معقول اور وسیع الخیال علماء کو دیکھنا چاہتا ہوں، نہ کہ ایسے اشخاص کو جو نشۂ علم میں سرمست و مغرور ہوں، اور اپنے زعم میں اوروں کو حقیر سمجھیں، اور اپنے سطحی علم کو بحر بے پایاں تصور کریں..... تعلیم اس قسم کی ہونی چاہیئے کہ انکسار پیدا کرے نہ کہ بے جا غرور..... فی زمانہ علوم جدیدہ اس قدر وسیع ہوئے ہیں اور اتنے انواع پر متفرع ہیں کہ کوئی شخص اپنی تمام زندگی میں بھی کسی ایک شاخ میں کامل مہارت پیدا نہیں کر سکتا، جب علم ایسا بحر بیکراں ہے تو بجز..... ماہران علوم مختلفہ و تبادلۂ خیالات مذہبی و علمی پوری تعلیم کا حاصل کرنا امر محال ہے۔

ندوۃ العلماء کا وجود مغتنمات سے ہے

ندوۃ العلماء کا وجود مغتنمات سے ہے، اور اس کا انعقاد عین بروقت ہوا، کیونکہ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ زمانے کے ساتھ نصاب تعلیم بھی بدلتا ہے، یہ سائنس کا عہد ہے، اور ندوۃ العلماء کو یہ امر کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے اور آپ پر فرض ہے کہ علم کلام کو مطابق علوم جدیدہ کریں ورنہ کوئی علمی فائدہ مقصود نہ ہوگا..... کوئی تعلیم کامل نہیں خیال کی جاتی ہے، جب اس کا عمدہ اثر اخلاق پر نہ ہو، حب الوطنی کا ولولہ دلوں میں پیدا نہ ہو، اور ذاتیات محو نہ ہو جائیں، ..... ہماری تعلیم کا نقص ہے کہ لوث ذاتیات سے کبھی پاک نہیں ہوتے ہیں، اس مرض کا علاج مطالعۂ کتب، سیر و سوانح عمری سے ہو سکتا ہے، لارڈ بیکن کا قول ہے کہ علم تاریخ

آئینے کے مانند آپ پر روشن کر دے گا کہ کیوں اور کس طرح سلطنتوں اور قوموں کا زوال ہوا، اس کے کیا اسباب تھے؟"..... ندوۃ العلماء یا اسلامی یونیورسٹی کو چاہئے کہ علم تاریخ کی ترویج انہی اصول پر مبنی رکھے اور ثابت کر دکھائے کہ خیالات وشائستگی کے کیا مدارج ہیں۔

ندوۃ العلماء اپنے مقاصد میں بالکل قاصر رہے گا، اگر علم تاریخ کو جدید طرز پر ترویج دینے میں بے اعتنائی کی گئی، اسلام نے اخوت کی تعلیم دی ہے اور تاریخ جوش اخوت کو موجزن کرے گی، ندوۃ العلماء پر فرض ہے کہ پرانے علوم کو علوم جدیدہ کے ساتھ مربوط کرے، منطق نے اپنا قالب بدلا ہے، ندوۃ العلماء کی خدمت میں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ منطق کا طرز قابل اصلاح ہے۔"

۴½ بجے جلسہ برخاست ہوا پھر آج ہی ۸½ بجے شب سے ۱۱ بجے شب تک شیخ ضمیر الدین صاحب مرحوم کی مسجد میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا۔

ندوۃ العلماء پر قدیم وجدید طبقہ کا اعتراض

۸ رجب ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء — ۷½ بجے سے ۱۱½ بجے دن تک اجلاس منعقد کیا گیا، اس کے صدر نشین مولانا مسیح الزماں خاں صاحب تھے، اس کے بعد ندوۃ العلماء کی ضرورت پر علامہ شبلی نعمانی نے روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:۔

"ندوہ جب اول اول قائم ہوا تو قدیم وجدید گروہ نے اس کو حیرت وتعجب کی نگاہ سے دیکھا، قدیم گروہ کا خیال تھا کہ اگر ندوے کا مقصد علوم قدیمہ کو ترقی دینا ہے تو ہندوستان میں آج سیکڑوں عربی مدارس موجود ہیں، جو اس مقصد کو بخوبی انجام دے رہے ہیں، جدید گروہ کہتا تھا کہ بڑی مشکل، بڑی ہائے پکار سے مسلمان خواب غفلت سے چونکے تھے، اور جدید تعلیم

کی طرف مائل ہوئے تھے، کیا ندوے کی یہ خواہش ہے کہ قدیم تعلیم کے جس شکنجے میں ہم گرفتار تھے، پھر انھیں میں پھنس جائیں، قدیم گروہ کا یہ خیال کہ مدارس موجودہ میں علوم قدیمہ کی تعلیم کافی طور سے ہو رہی ہے، اس لئے ندوے کی کیا ضرورت ہے، صحیح نہیں۔

نئے علم کلام کی ضرورت

ندوے کا مقصد صرف علوم قدیمہ کی تعلیم نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے، آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں جتنے علم پیدا ہوئے سب زمانے کی خاص خاص ضرورتوں سے پیدا ہوئے، مثلاً علم کلام صرف اس لئے پیدا ہوا تھا کہ فلسفۂ یونان کی تعلیم نے ہزاروں آدمیوں کے مذہبی خیالات متزلزل کر دیئے تھے، اسی بنا پر آج بھی چونکہ فلسفۂ جدیدہ کی تعلیم نے ہزاروں آدمیوں کو مذہب کی طرف سے بدظن کر دیا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ فلسفۂ جدیدہ کے مقابلہ میں ایک نیا علم ایجاد کیا جائے، نہ صرف اسی قدر بلکہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جس طرح ہمارے قدماء نے یونان، مصر، ایران اور ہندوستان کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کئے تھے، اسی طرح یورپ میں جو نئے علوم و فنون ایجاد ہوئے ہیں، ہماری زبان میں منتقل کئے جائیں۔

انگریزی داں طبقہ میں ذوق علمی مفقود ہے

عام خیال یہ ہے کہ ہمارے علماء انگریزی تعلیم تعصب کی وجہ سے نہ خود حاصل کرتے ہیں، نہ دوسروں کو اجازت دیتے ہیں، جبکہ ہمارے علماء نے تمام غیر قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے میں اس قدر بے تعصبی اور فیاض دلی ثابت کی ہے کہ اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے، تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی علوم و فنون کے سیکھنے سے ان کو تعصب نے باز رکھا، حقیقت

یہ ہے کہ علماء نے انگریزی تعلیم کا جو نمونہ دیکھا، اور اس تعلیم کا جو سرسری تجربہ ان کو ہوا، اس نے ان کو یقین دلا دیا ہے کہ انگریزی زبان میں دقیق علم اور نازک مسائل کا وجود نہیں بلکہ صرف سرسری اور عامیانہ باتیں ہیں، جو درس و تدریس کے قابل نہیں ہے، علماء کا یہ خیال اگرچہ غلط ہے لیکن اس کا منشاء انتزاع ضرور ہے، انگریزی خوانوں کا جو گروہ ملک میں موجود ہے، اس کا ایک ناواقف شخص اور کیا قیاس کر سکتا ہے، آج ملک میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں انگریزی اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں لیکن کیا ان میں ایک بھی فلسفہ داں ہے؟ منطقی ہے؟ شاعر ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو اس نمونے کو دیکھ کر ہمارے علماء اور کیا قیاس کر سکتے تھے؟ بہت بڑی چیز جو علم کا معیار ہے وہ علمی ذوق ہے، ہمارے علماء علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ انگریزی خواں جماعت میں علمی ذوق بالکل مفقود ہے، اس سے ایک ناواقف شخص خواہ مخواہ یہ قیاس کرے گا کہ انگریزی میں دقیق نازک اور دلچسپ مسائل علمی نہیں ہیں، ورنہ یہ کیونکر ممکن تھا کہ لوگ مدت تک مشغول رہنے کے بعد ایک شخص کو بھی علمی ذوق نہ پیدا ہوتا اس بناء پر ہمارے علماء کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کا صرف طریقہ یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اس زبان میں بھی علوم و فنون لطیفہ موجود ہیں۔

علماء سے گذارش

اب میں علماء سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ یورپ میں بہت سے ایسے علوم و فنون ہیں کہ ہمارے یہاں اس کا نام و نشان نہیں ملتا، خود ہمارے فن ادب میں بھی یورپ والوں کا قدم ہم سے آگے بڑھا ہوا ہے، ہمارے فن ادب میں سب سے قیمتی ذخیرہ شعرائے جاہلیت کا کلام ہے، لیکن ان میں سے ہمارے پاس بہت تھوڑا سا حصہ ہے لیکن یورپ نے صدہا کتابیں اس فن کے متعلق ایسی تلاش کر کے شائع کیں جو بالکل نایاب... تھیں، جب ہمارے علماء پر یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ

ہمارے اسلامی علوم کے متعلق یورپ نے نہایت بیش قیمت تحقیقات کی ہیں تو یقیناً ہمارے علماء یورپ کے علوم و فنون کو بھی اسی ذوق اور سرگرمی سے حاصل کریں گے جس طرح انھوں نے یونانی علوم و فنون کو حاصل کیا تھا، ندوے کے مقاصد میں سے ایک بہت بڑا مقصد یہ ہے کہ یورپ کے سرمایۂ اصلی سے فائدہ اٹھایا جائے اور یہ وہ چیز ہے، جو اور مدارس عربیہ میں موجود نہیں۔

جدید تعلیم نوکری اور غلامی کا ذریعہ

اب میں جدید گروہ کی طرف خطاب کرکے ندوے کی ضرورت ثابت کرتا ہوں، جدید گروہ نے یہ غلط خیال کیا ہے کہ تعلیم کا ایک سنگم تیار کیا جائے، یہ قطعی ہے کہ جدید تعلیم اسلامی علوم اور اسلامی اثر سے بالکل خالی ہے، اس لئے اگر محض جدید تعلیم پر قناعت کی جائے تو مسلمانوں میں قومیت اور مذہب کی روح قائم نہیں رہ سکتی، نہ صرف اس قدر بلکہ جدید تعلیم بجائے خود بھی نوکری اور غلامی کے سوا اور کسی کام کی نہیں، انگلش حکمرانوں نے سیکڑوں بار کہا کہ علم کو علم کے لئے سیکھو، کیا ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک شخص نے بھی علم کو علم کی غرض سے پڑھا یا اب پڑھ رہا ہے، اس فرض کو وہی غریب اور مسکین گروہ ادا کرے گا جس کو آپ پرانی تعلیم والا کہکر یاد کرتے ہیں، اس غریب گروہ نے ہمیشہ علم کو علم کی غرض سے پڑھا ہے اور یہی اب بھی اس خدمت کو انجام دے گا، ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ عربی علوم و فنون آج کل محض بے کار ہیں، اور ان سے دنیاوی معاش کی ضرورت میں کچھ مدد نہیں ملتی ہے، تاہم آج بھی سیکڑوں، ہزاروں طلباء انہی علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں، کیوں ـــــ صرف اس لئے کہ وہ علم کو علم کی غرض سے سیکھتے ہیں، زر و مال اور جاہ و جلال کے لئے نہیں۔

کاروباری گروہ

حقیقت یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کوئی علمی گروہ نہیں بلکہ ایک کاروباری گروہ ہے، اور اسی وجہ سے وہ علم کو صرف اس غرض سے پڑھتا ہے کہ کاروبار میں کام آئے، اس لئے ان کے علم کی تحصیل سے اصل میں کوئی غرض نہیں، علمی گروہ وہ غریب علماء ہیں، جو فاقے کر کے علم کی تحصیل کرتے ہیں، صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اس فرقے کو علوم جدیدہ کی اہمیت اور اس کی ضرورت ذہن نشین کرادی جائے، پھر یہی گروہ ان علوم جدیدہ کو بھی اسی ذوق وشوق اور سرگرمی سے سیکھے گا، جس طرح وہ آج علوم قدیم کو حیرت انگیز کوششوں سے حاصل کر رہا ہے، اور یہی ندوے کی تمام تر اغراض اور تمام تر غایت ہے"

اس تقریر کے بعد ڈاکٹر چراغ الدین صاحب جوہر امرتسری نے اپنا ترکیب بند مؤثر لہجے میں سنایا جس کے چند اشعار ندر قارئین ہیں ؎

ہے خدا کا ایک احسان ہم پہ سوا احسان کا — حافظ و ناصر ہے جو اسلام کا بے انتہا
ندوۃ العلماء ہمارے واسطے قائم ہوا — شہر امرتسر میں ہے جس نے قدم رنجہ کیا
اس کی خاطر ہیں ہمارے دیدۂ و دل فرش راہ — مدتوں سے منتظر تھے اس کے ہم حق ہے گواہ
تھی تنزل کی گھٹا مدت سے جو چھائی ہوئی — کشت اسلامی جو تھی مدت سے کملائی ہوئی
تھی نفاق و بغض کی آفت بلا لائی ہوئی — تھی خصومت باہمی ادبار جو لائی ہوئی
ندوۃ العلماء نے سب کو کر دیا گم آن میں — روشنی پھیلائی اپنی سارے ہندوستان میں

وہ خاص ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کے لئے عدن سے آئے تھے۔

ترکیب بند ختم نہ ہوا تھا کہ مسٹر غلام حسین عارف آنریری مجسٹریٹ کلکتہ نے ایک ہزار روپے

پیش کئے، ان کے دیتے ہی ہر طرف سے لوگوں نے چندہ دینا شروع کیا، مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر "پیسہ اخبار لاہور" چندے کے طریقوں پر گفتگو کرنے والے تھے لیکن مجلس کا رنگ دیکھ کر خاموش ہو گئے، شیخ غلام صادق صاحب سکریٹری معین الندوہ اور بابو نظام الدین صاحب جوائنٹ سکریٹری معین الندوہ نے اپنا چندہ پیش کیا، مسٹر غلام حسین عارف اور خان بہادر خواجہ یوسف شاہ باوجود اپنی پیرانہ سالی کے گلے میں جھولی ڈال کر چندہ لینے کو اٹھے اور ہزاروں روپئے جمع کئے، بعض حضرات نے اپنی قیمتی گھڑیاں نذر کیں، ڈاکٹر عبدالوہاب صوفی ہاسپٹل اسسٹینٹ صومالی لینڈ (افریقہ) نے علاوہ نقد کے اپنا کوٹ، واسکٹ اور ٹوپی اتار دی۔

ایک غریب بڑھیا نے دُوَنّی دی جس کو خان بہادر منشی اطہر علی صاحب نے ایک اشرفی میں خرید لیا اور دُوَنّی کے ساتھ ندوۃ العلماء کی نذر کر دی۔

ساڑھے گیارہ بجے جلسہ برخاست کر دیا گیا۔

ہمیں بے برگ و نوا ہیں

۸ رجب ۱۳۲۰ھ بروز شنبہ ½۲ بجے سے ½۴ بجے تک اجلاس ششم منعقد کیا گیا، اس کے بھی صدر مولانا مسیح الزماں ہی تھے، چند آدمیوں کے تقریر کرنے کے بعد شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر "آبزرور" لاہور تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، آپ نے فرمایا:۔

"میں بالعموم اس حکمت عملی سے کچھ بہت اتفاق نہیں رکھتا کہ ہر وقت زمانہ کی شکایت اور محرومی تقدیر کا گلا کیا جائے، اپنی حالت کی پستی کے مبالغہ آمیز بیانات پیش کئے جائیں اور اس طرح قوم کے حوصلوں کو پہلے سے پست کر دیا جائے، جس قوم کو بجائے شکر کے شکایت کی اور بجائے تحمل کے بے صبری کی عادت ہو وہ بسا اوقات ہم چشموں کی نگاہ میں حقارت سے

دیکھی جاتی ہے..... مگر بعض دفعہ واقعات اپنا اثر بے طرح جماتے ہیں اور کسی طرح ٹالے نہیں ٹلتے، اور دل سے بے اختیار ایک آہ نکل ہی جاتی ہے ؎

جس رنگ میں دیکھو ہمیں بے برگ و نوا ہیں

یہ ایک آہ ہے، جو عجیب انداز سے ہم پر صادق آتی ہے، زمانہ حال کے مسلمانوں کی حالت کے اس قدر مطابق ہے کہ..... دل خود بخود بیٹھا جاتا ہے، یہ قصے تو پرانے ہیں کہ مسلمانوں کی سلطنتیں باستثنائے معدودے چند مٹ گئیں، یا ان کے صاحبان جاہ و مال و منال اس جہاں سے چل بسے ان کے مدرسے خراب و خستہ ہو گئے، اور ان کی خانقاہیں خیر آباد ہو گئیں، اسی طرح یہ شکایت بھی اب کچھ نئی نہیں کہ تعلیم مروجہ میں پیچھے رہ گئے اور لوگ ان سے کہیں آگے نکل گئے، غرض کہاں تک ان داستانوں کو جو مجالس قومی میں بار بار رٹی جا چکی ہیں، آپ کے روبرو دہراؤں مگر جس رنگ میں دیکھو یہ بات سوچنے سے سمجھ میں آتی ہے۔

ریشم کے غلافوں میں طاق نسیاں پر دھرا

اور تو اور مذہب اور اس کی ترقی کے سامانوں میں بھی ہماری بے برگ و نوائی درجۂ کمال کو پہونچ گئی، یہی ایک شاخ ایسی تھی جس میں امید ہو سکتی تھی کہ باوجود عام انحطاط کے مسلمان گرنے نہ پائیں گے کیونکہ وہ عرب کے سرچشمۂ فیض سے بس یہی ایک دولت لازوال لے کر آئے تھے، اگر اس کی وہ حفاظت کرتے تو یہ دولت نہ صرف خود صدمات سے محفوظ رہتی بلکہ ان کی دولت دنیاوی کو بھی بچا لیتی لیکن یہ انہی کا کام تھا کہ اس بڑے دستور العمل کو جو دنیا کے سب سے بڑے ربانی مقنن نے ان کو لا کر دیا تھا، نہایت ادب اور احتیاط سے ریشم کے تہہ در تہہ غلافوں میں بند کر کے طاق نسیاں پر دھر دیا، اس پر عمل کرنا تو درکنار اس کی آیات بینات پر

غور کرنے اور اس کو پڑھنے اور سمجھنے تک کی کوشش چھوڑ دی۔

مجھے سخت ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی ہے کہ ایک معقول جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو جو علوم دین سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ علوم مروجہ سے بھی باخبر ہوں اور حالات زمانہ کی بھی خبر رکھتے ہوں..... اس کے لئے جو وسیلہ مناسب ہو استعمال کیا جائے وہ وسیلہ کیا ہے؟ کوئی ایسی تعلیم گاہ قائم کرنا جو اس مطلب کے لئے مخصوص ہے اور یہ مطلب دارالعلوم مجوزہ ندوہ کے مقاصد میں موجود ہے، مگر اس کے متعلق اتنا جتا دینا ضروری ہے کہ ایک علوم مذہبی کے مدرسہ میں کتب دین..... اور کتب علم ادب عربی و بعض دیگر کتب کا پڑھا دینا ہی کافی نہ ہوگا، اس کے لئے اس فن کی خاص تربیت اور مشق علاوہ نصاب کے ہونی چاہئے..... سب علوم و فنون کے متعلق اہل فن کے لئے تربیت خاص ضروری سمجھی جاتی ہے تو علم الادیان کیوں مستثنیٰ ہو، آپ اگر علم الادیان کو افضل تسلیم کرتے ہیں تو اس کے واسطے دوسرے علوم سے بڑھ کر اہتمام ہونا چاہئے، نہ یہ کہ بالکل اتفاقی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور جید علماء کے نکلنے کی خودرو سبزے کی طرح توقع ہو"

اہم تجاویز

اس اجلاس میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے "ہم کون ہیں" اس موضوع پر اپنے مخصوص اور مؤثر انداز میں تقریر کی، تقاریر کے بعد چند تجویزیں منظور ہوئیں۔

ان تجاویز میں سماجی اصلاح پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا، ندوۃ العلماء کی ان کوششوں کو ملت کی طرف سے مثبت اور عملی تعاون ملتا تو مسلمان خیر امت بن کر برصغیر میں روشناس ہوتے اور اس ملک کی دوسری قوموں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوتے۔

۱۔ تقریبات شادی میں امور محرمہ مثل رقص و سرود و آتش بازی اور موقع غمی میں محض نام و نمود کے لئے اسراف کرنا از روئے شرع ناجائز ہے تمام مسلمانوں کو اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

۲۔ علمائے دین اپنے مواعظ میں ان رسوم کی برائی مسلمانوں کے ذہن نشین فرمائیں ان کو تاکید کریں کہ وہ ان رسوم کو ترک کریں اور ہم بھی انشاء اللہ العزیز اپنے حدود اثر میں ان رسوم کے ترک کی کوشش کریں گے۔

۳۔ منجملہ مقاصد ندوۃ العلماء کے ایک مقصد رسوم قبیحہ کی اصلاح ہے اس کو زیادہ قوت کے ساتھ عمل میں لانے کے واسطے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ جو جو علماء ندوے میں شریک ہوں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں وعظ و نصائح کے ذریعہ سے اس سال شادی کے رسوم میں سے ناچ گانا، آتش بازی، اور غمی کے رسوم میں سے محض نام و نمود کے لئے آسودہ لوگوں کو کھانا کھلانے کی برائیاں عامۂ مسلمین کے ذہن نشین کر کے ان کے ترک کی تاکید کریں، نیز انجمن ہائے معین الندوہ سے درخواست کی جائے کہ وہ بھی رسوم مذکورہ کے انسداد کی کوشش کریں"۔

اس کے بعد دعا پر اجلاس نہم برخاست کر دیا گیا، اور آئندہ سال یعنی اجلاس دہم مدراس میں ۱۴ شوال ۱۳۲۱ھ سے ۱۷ شوال ۱۳۲۱ھ تک ہونا قرار پایا۔!!

ماہنامہ "الندوہ"

تحریک ندوۃ العلماء کے ترجمان ماہنامہ "الندوہ" کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۶ء مطابق جمادی الاولی ۱۳۲۴ھ منظر عام پر آیا، رسالے کے دو ایڈیٹر تھے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا شبلی نعمانی۔

اس ماہنامہ میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے اس رسالہ نے طبقۂ علماء کے جمود میں حرکت پیدا کی، ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، انھیں جدید مباحث سے روشناس کرایا، اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقوں، زبان و اسلوب کے نئے انداز اور پیرائے سے متعارف کرایا..... "الندوہ" کا اثر نوجوان علماء اور منتہی طلبہ پر پڑا، اور انھوں نے اس کے طرز نگارش، اسلوب بیان کو قبول کیا، چند ہی شماروں کے بعد الندوہ نے اپنی افادی حیثیت اہل نظر سے منوالی۔

"الندوہ" کے تیار کردہ نوجوان اہل قلم

خود دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء کو اس سے بہت فائدہ پہونچا، اس دور کے جن ندوی فضلاء نے تصنیف و تحریر کے میدان میں ممتاز مقام حاصل کیا ان کی تحریر کی ابتداء اسی دبستان میں ہوئی، استاذ الاساتذہ مولانا سید سلیمان ندوی کا علم حدیث پر ایک مضمون ان کے زمانۂ طالب علمی میں "الندوہ" میں شائع ہوا تو اسے پڑھ کر خواجہ الطاف حسین حالی نے مولانا شبلی نعمانی کو لکھا "سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی بار پیش کیا ہے "فبارک اللہ فیھا وفی طلبتھا وفی تعلیمھا" مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت تعلیم ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی پیدا نہیں کرسکی[1]

---

[1] الندوہ۔ ربیع الآخر ۱۳۲۲ھ

مولانا عبدالسلام ندوی، اکرام اللہ خاں ندوی، عبدالرحمٰن نگرامی ندوی، ضیاء الحسن علوی ندوی، خواجہ عبدالواجد ندوی، وغیرہ علمی دنیا میں "الندوہ" کے ذریعہ سے معروف ومتعارف ہوئے۔

الندوہ نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو مستقبل میں علم وفن ادب وصحافت اور معاشرت وسیاست کے میدان میں ممتاز مقام پر فائز ہوئے، ان میں اہم مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا آزاد الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ندوہ میں قیام مولانا شبلی کی تربیت اور اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت کی بدولت وہ برابر ترقی کرتے گئے، الندوہ میں ان کے مضامین نے انھیں پورے ملک میں شہرت بخشی ۱۹۰۶ء میں وہ "وکیل" امرتسر سے وابستہ ہوگئے، ۱۹۱۲ء میں انھوں نے اپنا شہرۂ آفاق ہفت روزہ "الہلال" نکالا، اتحادِ اسلامی اور سیاسی نظریات میں ان پر مولانا شبلی کے فیض صحبت کا اثر آخر تک نمایاں رہا۔

مولانا عبداللہ عمادی کی علمی شخصیت میں نکھار ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ میں قیام اور الندوہ کی ادارت سے پیدا ہوا، یہاں سے "وکیل" امرتسر "زمیندار" لاہور اور "الہلال" کلکتہ کے حلقۂ ادارت سے موصوف وابستہ رہے، پھر عرصے تک دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے مترجم اور وہاں کے علمی حلقوں کے رکن رکین رہے، ۱۹۰۶ء میں اپنی تعلیم کے آخری سال میں مولانا سید سلیمان ندوی "الندوہ" کی ادارت میں شریک رہے، مولانا عبدالسلام ندوی رفیق دارالمصنفین بھی عنفوان شباب میں الندوہ کے نائب مدیر رہے، انھوں نے اپنا پہلا مضمون تناسخ پر ۱۹۰۶ء میں لکھا تھا، مولانا شبلی اس مضمون سے بہت خوش ہوئے، اکتوبر ۱۹۰۶ء کو اپنے ایک خط میں مہدی افادی کو لکھتے ہیں: "ہمارے یہاں یعنی ندوے میں عبدالسلام نہایت قابل

لڑکا ہے، جو غالباً خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا۔" پھر ۳ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو انھیں لکھا:۔
"عبدالسلام نہایت ہونہار ہے، وہ پورا مصنف ہوسکتا ہے اور ہوگا، انگریزی نہیں جانتا لیکن پڑھ رہا ہے، ندوہ اس قسم کے جواہر کو چمکانے والا ہے۔"

"الندوہ" کے مختلف ادوار

الندوہ کا پہلا دور مئی ۱۹۱۲ء میں ختم ہوا، اس دور کے ایڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا شروانی تھے، اس کے بعد الندوہ کی ادارت کی ذمہ داری دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک مدرس مولانا عبدالکریم صاحب کے سپرد ہوئی، چند مہینوں بعد مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی نے "الندوہ" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی، اور آخر دسمبر ۱۹۱۶ء میں یہ ماہنامہ بند ہوگیا، ۲۲ سال بعد جنوری ۱۹۴۰ء سے مولانا سید سلیمان ندوی کی نگرانی اور سرپرستی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت میں پورے آب و تاب کے ساتھ اس کا دوبارہ اجرا ہوا، آخر ۱۹۴۲ء میں یہ دور ختم ہوگیا، اس کے بعد الندوہ کا خلاء علمی دنیا میں برابر باقی ہے۔

الندوہ کے علمی نتائج

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "الندوہ نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کئے وہ حسب ذیل ہیں:۔

"۱۔ اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا۔
۲۔ جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا۔
۳۔ علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا۔

۴۔ عربی خواں طلباء میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا۔

۵۔ اسلام اور تاریخ اسلام پر سے بہت سے اعتراضات کو دفع کیا۔

۶۔ قوم میں ندوے کے مقاصد کی تبلیغ کی، اصلاح نصاب کی ضرورت سمجھائی اور عربی تعلیم کی اہمیت ذہن نشین کی۔[1]

اجلاس امرتسر میں دستور العمل میں ترمیم

اجلاس امرتسر کے بعد مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء کے کئی جلسے ہوئے ایک جلسہ میں دستور العمل میں ترمیم کی گئی۔

۱۔ اب تک ندوۃ العلماء میں جو حضرات دو روپیہ یا اس سے زائد چندہ دیتے تھے وہ رکن سمجھے جاتے تھے اب اس میں یہ ترمیم کی گئی کہ رکن ندوۃ العلماء وہ شخص ہوگا جس کو مجلس انتظامیہ منتخب کرے اور اس میں ندوۃ العلماء کے مقاصد سے دلچسپی اور ہمدردی کے علاوہ درج ذیل صفات ہوں۔

(ا) طبقۂ علماء اور مشائخ میں سے ہو۔

(ب) انگریزی یا فارسی یا ریاضی، طب یا قانون میں مہارت رکھتا ہو۔

(ج) تقریر یا تحریر میں شہرت رکھتا ہو۔

۲۔ ندوۃ العلماء کی تین مجلسیں تشکیل دی گئیں مجلس انتظامی مجلس خاص مجلس عام ان تینوں مجلسوں کی حیثیت اور ذمہ داری کی تفصیل رپورٹ میں پیش کی گئی۔

۳۔ اصلاح رسوم کی کوششیں سود مند رہیں، ۲۴ علمائے کرام نے ۶۱ مقامات پر

---

[1] حیات شبلی ص ۴۴۷

اس تحریک کو عمل میں لانے کی کوشش کی، اور لوگوں سے عہد و پیمان لئے جن علماء کرام نے اس سلسلہ میں جد و جہد کی ان میں مولانا پیر احمد علی شاہ صاحب رئیس ہوتی مردان، مولانا عبدالسلام رفیقی نور پوری، قاری عبدالسلام صاحب پانی پتی، مولوی محمد ابراہیم صاحب رئیس ویو نپسل کمشنر کرنال، مولانا غلام محمد ہوشیار پوری اور مولانا غلام محمد صاحب شملوی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر اور لائق تحسین ہیں۔

پنجاب کے مؤقر اخبارات کا تعاون

پنجاب کے مؤقر اخبارات "وکیل" اور "وطن" نے ایسے متعدد واقعات شائع کئے ہیں جن میں مختلف مقامات کے لوگوں نے مسرفانہ غیر شرعی رسوم ختم کر کے جو روپے بچے اس کو اسلامی انجمنوں کے نذر کیا، یہ ندوۃ العلماء کی بہت بڑی کامیابی ہے۔

۴۔ سال رواں ندوۃ العلماء نے اپنے وکلاء کے ذریعہ بھی اس کام کو انجام دیا، مولانا غلام محمد صاحب شملوی نے خاص اس خدمت کے لئے مہینوں دورے کئے، اور اصلاح رسوم اشاعت اسلام اور ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کے تعارف کا کام کیا۔

دسواں اجلاس

منعقدہ مدراس

مخالفت کے طوفان سے گذرتے ہوئے

ندوۃ العلماء کی تاریخ میں سب سے سخت مرحلہ اور زبردست مخالفت سے مدراس کے اجلاس میں گزرنا پڑا، ندوۃ العلماء کے اجلاس دہم منعقدہ مدراس کی روداد میں اس سخت امتحان اور زبردست مخالفت کی مفصل روداد درج ہے، اس روداد کی تمہید میں لکھا ہے:۔

"ندوۃ العلماء کی تحریک کا ملک میں مدتوں سے غلغلہ بلند ہے اور ہندوستان سے لے کر عرب اور مصر و شام تک کے علماء کرام نے اس کے اغراض و مقاصد سے اتفاق ظاہر فرمایا ہے، مگر ہر کام کتنا ہی مناسب اور مستحسن ہو اس کے مخالف بھی پیدا ہو جاتے ہیں، ندوۃ العلماء کی بھی مخالفت شروع ہوئی، اور بریلی کے جلسہ سے اس میں برگ و بار پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ شرکائے ندوۃ العلماء کی تکفیر کی گئی، اور وجوہِ تکفیر وہ ظاہر کئے گئے جن سے ارکان ندوۃ العلماء کے دل و زبان آشنا نہیں، ارکان ندوۃ العلماء نے مباحثہ میں پڑ کر آتش مخالفت کو مشتعل کرنا پسند نہیں کیا۔

شروع ۱۳۳۲ھ میں مولوی غلام محمد صاحب شملوی بتقریب اشاعت مقاصد و اغراضِ ندوۃ العلماء... حیدرآباد گئے تھے، وہاں سے مدراس بھی گئے، ان کے جانے سے مدراس میں ندوۃ العلماء کی طرف مسلمانوں کے خیال نے رجوع کیا، اور معین الندوہ نام سے مجلس قائم کی،

جس کے ناظم مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب نقوی فخری منتخب ہوئے اور جناب خان بہادر عبد العزیز بادشاہ صاحب ٹرکس قنصل جنرل دولت عثمانیہ صدر انجمن منتخب ہوئے، شہر کے اکثر عمائد و ارکان نے اس مجلس کی ممبری قبول فرمائی، مگر اس بات کا سخت افسوس ہوتا ہے کہ مدراس کے چند علماء نے مجلس سے کنارہ کشی ظاہر فرمائی اور باوجود اصرار بلیغ کے وہ اپنے انکار پر قائم رہے، جو مخالفت آغاز تحریک سے شروع ہو گئی تھی وہ روز بروز بڑھتی گئی، یہاں تک کہ اس نے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی، اور ندوۃ العلماء کی تاریخ میں نئے ابواب اضافہ کر دیئے۔

۲ شوال ۱۳۲۱ھ کو ناظم ندوۃ العلماء مع دیگر علماء اور ارکان مدراس روانہ ہوئے، ارکان انجمن معین الندوہ نے ریلوے اسٹیشن پر استقبال شائستہ کے ساتھ خیر مقدم فرمایا، اور جناب خان بہادر مولوی غلام محمد صاحب ناظم معین الندوہ نے خیر مقدم میں ایک مختصر مگر پُر مغز تقریر فرمائی۔

دو چار روز اطمینان و سکون کے ساتھ مختلف مقامات پر وعظ و بیان ہوتے رہے، مگر اس کے بعد مخالفت میں تیزی شروع ہوئی اور سرعت کے ساتھ شہر و اطراف میں پھیل گئی، اس کا احساس اس وقت ہوا، جب کہ مخالفین کی جانب سے سنگباری، فوجداری اور جلسوں کو درہم برہم کرنے کی کارروائی شروع ہو گئی، ارکان ندوۃ العلماء کو ہراس نہیں تھا، وہ بدستور اپنے کام میں مصروف تھے اور جہاں تک ممکن تھا، شہر کے ذی علم لوگوں سے ملنے اور ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کو سمجھانے میں انھوں نے پہلو تہی نہیں کی، البتہ اس بات پر خوشی ہے کہ عالی جناب شمس العلماء مولانا رکن الدین سید محمد القادری صاحب سجادہ قطب ویلور نے التفات نامہ کے ذریعہ سے ارکان مجلس کی ہمت بڑھائی اور

وعدہ فرمایا کہ وہ دعا اور توجہ سے ہمیشہ مدد دیں گے۔

.....جناب شمس العلماء مولانا رکن الدین سید محمد القادری صاحب سجادہ قطب ویلور بہ نفس نفیس بوجہ علالت تشریف نہ لاسکے، مگر جناب ممدوح نے اپنے صاحبزادے جناب مولوی سید عبداللطیف صاحب قادری اور برادر نسبتی جناب مولوی سید حمید ولی اللہ صاحب قادری اور اپنے مدرسہ کے صدر مدرس جناب مولوی محی الدین صاحب کو جلسہ میں شرکت کے لئے روانہ فرمایا اور یہ حضرات آخر تک رونق افروز جلسہ رہے۔

سجادہ صاحب قطب ویلور کی ندوہ کی حمایت میں پیش کش

سجادہ صاحب قطب ویلور نے اپنے خط میں تحریر فرمایا کہ:۔

"....اس مبارک مجلس کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے فخر جانتا ہوں اور میرے لئے اس کی خدمت گزاری باعث سعادت اور اسلام اور اسلامیوں کی ترقی کی دیرینہ آرزو کے پورا کرنے اور ہونے کی توقع بتلا رہی ہے۔

.....اہل ندوہ کے مقاصد کو دیکھا تو اکثر باتیں اور ارادے جو جناب ابی وشیخی قدس سرہٗ کے تھے یاد آرہے ہیں.... فقیر کارساز حقیقی کی درگاہ میں دست بدعا ہے کہ اس کا آغاز وانجام دونوں بخیریت عدگی کے ساتھ کرے"

جناب ممدوح کی ہمت افزائی سے ارکان کو بہت تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے طے کیا کہ ندوۃ العلماء کا اجلاس مدراس میں منعقد ہو۔

خواجہ حسن نظامی کی دلچسپ تقریر

اب تک ندوۃ العلماء کے اجلاس شمالی ہند ہی میں ہوتے رہے تھے البتہ پہلی بار

مدراس میں دسواں اجلاس منعقد ہوا، وہاں ندوے کی مخالفت کے ماحول میں خواجہ حسن نظامی نے ایک دلچسپ تقریر کی جس میں فرمایا:۔

"آج ایک گالی نامہ شائع ہوا ہے جس میں نام بنام شرکاء ندوۃ العلماء کو گالیاں دی گئی ہیں، میں سمجھتا تھا کہ ان میں میرا نام بھی ہوگا مگر باوجود تلاش کے نہیں ملا، مجھ کو اپنی بدنصیبی پر حسرت ہوئی لہذا میں دو روپیہ چندہ رکنیت کے طور پر پیش کرتا ہوں تاکہ میرا نام اگر اس وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہے کہ میں ندوے کا رکن نہیں ہوں تو اب شامل کر لیا جائے"۔

اجلاس کا وقت و مقام

یہ اجلاس تین دن یعنی یکشنبہ ۱۴ر شوال ۱۳۲۱ھ ۳ر جنوری ۱۹۰۴ء ۱۰ سے ۲ بجے تک اجلاس اول ـــــ اور روز دوشنبہ ۱۵ر شوال ۔ ۴ر جنوری ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک اجلاس دوم ـــــ اور اجلاس سوم روز سہ شنبہ ۱۶ر شوال ۵ر جنوری ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک منعقد ہوتا رہا اور یہ تمام اجلاس اسپرنگس گارڈن واقع تنیام پیٹھ مدراس منعقد ہوئے۔

اجلاس کی صدارت جناب مولانا قاضی علی احمد صاحب رئیس بدایوں کی تحریک اور جناب محی الدین خان بہادر داماد پرنس ظہیر الدولہ مرحوم کی تائید سے جناب مولانا ابو محمد عبدالحق صاحب حقانی دہلوی نے فرمائی۔

اہم شرکاء

مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلویؒ، مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب چشتی قادریؒ، مولانا شاہ ابوالخیر صاحب فصیحی غازی پوریؒ، مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارنپوریؒ

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی؟ مولانا حکیم عبدالحی صاحب مدد گار ناظم ندوۃ العلماء، الحاج عبدالقیوم صاحب معتمد دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد، مولانا قاضی علی احمد صاحب بدایونی، ابوبکر بن شہاب علوی حضرمی مدرس دارالعلوم حیدرآباد، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر "آبزرور" یہ ان حضرات کے اسماء گرامی تھے، جو بہ نفس نفیس اجلاس میں تشریف لائے اور اکثر نے اپنی قیمتی وعظ و نصائح سے سامعین کو مستفید فرمایا۔

اس اجلاس کے موقع پر مجلس انتظامیہ کی خصوصی نشستیں بھی ہوئیں، مولانا محمد علی مونگیریؒ مولانا عبدالحی صاحب، مولانا شبلی اور دیگر ارکان میں کھل کر دو بدو گفتگو ہوئی، باہمی غلط فہمیاں رفع ہوئیں، نصاب تعلیم کا مسئلہ طے ہوا کہ مولانا شبلی، مولانا عبدالحی اور مولانا عبدالقیوم حیدرآبادی مل کر بنائیں۔

چونکہ سال گزشتہ ناظم ندوۃ العلماء نے اپنی کوئی تجویز رپورٹ میں پیش نہیں کی تھی، اس لئے پہلے سال گذشتہ کی چند تجاویز پھر سال زیر بیان کی تجاویز ملاحظہ فرمائیے۔

اجلاس مدراس میں منظور شدہ تجاویز

۱۔ رسوم مضرہ کے مٹانے کی کارروائی سال گزشتہ میں جس قدر ہوئی وہ کافی نہیں، لہذا یہ جلسہ چاہتا ہے کہ علماء، مشائخین، اسلامی انجمنیں خصوصاً انجمن ہائے معین الندوہ سرگرمی سے اپنے اثر کو کام میں لائیں، اور اپنی مساعی جمیلہ کے نتائج کو ترغیب و تشویق کی غرض سے اشاعت کے لئے ندوہ بھیجیں۔

۲۔ جو غلط رسوم اور غیر شرعی طریقے معاشرت میں داخل ہو گئے ہیں، ان کی اصلاح کے لئے ایک مکمل دستور العمل بنایا جائے کہ شادی اور غمی کی فلاں فلاں رسوم ترک کی جائیں،

اوران کی بچت میں سے کوئی حصہ قومی اغراض مثل تعلیم عام یا پرورش ایتام یا اشاعت اسلام کے مصرف میں لایا جائے۔

۳۔ ہر سال کم سے کم پانچ امدادی وظائف تعلیم صنعت و حرفت و تجارت کی غرض سے مسلمان طلباء کو دیئے جائیں۔

۴۔ چونکہ سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا اہتمام نہیں ہے، اور انگریزی مدارس کے طلباء کو اپنے مذہبی فرائض پر آگاہی اور اخلاق کی درستی کا موقع نہیں ملتا ہے، اس لئے نہایت ضروری ہے کہ سرکاری مدارس کے طلباء کو مذہبی عقائد سکھانے اور ان کے ایمان و اخلاق درست رکھنے کے لئے ایک معلّم رکھا جائے۔

۵۔ یہ جلسہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ قرآن پاک کی آیاتِ کریمہ کو نمونہ کی غرض سے کارڈوں یا اخباروں کے پلندہ میں رکھ کر تقسیم کیا جاتا ہے، اس میں بہت بے ادبی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے، اور اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اردو عبارت کو خط نسخ میں رکھ کر نمونہ دکھا دیں۔

۶۔ یہ جلسہ انجمن معین الندوہ سے درخواست کرتا ہے کہ دو واعظ احاطۂ مدراس میں دورہ کرنے کے لئے مقرر کرے تاکہ وہ قصبات اور دیہات میں جاکر مسلمانوں کو اسلام کے احکام کی تلقین کریں۔

۷۔ چونکہ کتابی تعلیم کسب معاش کا ذریعہ نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ مدارس عربیہ میں صنعت و حرفت کی تعلیم داخل کی جائے۔

۸۔ انگریزی خواں طلباء کو انگریزی سیکھنے کا انتظام کرایا جائے ــــ یعنی فارغ التحصیل عربی طلباء کو وظیفہ دے کر انگریزی اور انگریزی فارغ التحصیل طلباء کو عربی پڑھائی جائے۔

۹۔ مولانا سید محمد علی مونگیریؒ عہدۂ نظامت سے مستعفی ہوگئے ہیں، ان کی خدمات سابقہ کے اعتراف کے ساتھ یہ جلسہ ان کے استعفیٰ کو قبول کرتا ہے، اور مولانا محمد مسیح الزماں صاحب کی نظامت کو تین سال کے لئے منظور کرتا ہے جن کو جلسۂ انتظامیہ ندوۃ العلماء نے اس عہدے کے واسطے منتخب فرمایا ہے۔

۱۰۔ تمام قوموں میں مذہبی اغراض کے لئے قومی سرمایہ ہر ایک فرد سے سالانہ اور مواقع شادی اور غمی پر جداگانہ لیا جاتا ہے، اس طرح ہم کو بھی ہر مقام پر اس کا انتظام کرنا چاہیئے، مقامی خصوصیات کے لحاظ سے بااثر حضرات اس کی کوشش کریں۔

۱۱۔ چونکہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت افسوسناک ہے، لہٰذا مسلمان لڑکوں کو دینی تعلیم انشاء اور املاء اور حساب و کتاب اور جسمانی ورزش کی تعلیم دینے کے لئے مقتدر مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کے والدین کو قومی معاہدے اور پنچایت کی رو سے پابند کریں۔

رپورٹ مولانا عبدالحی صاحبؒ

یکشنبہ ۱۴ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۳ جنوری ۱۹۰۴ء ۱۰ بجے سے ۲ بجے تک بمقام اسپرنگس گارڈن واقع تینام پیٹھ مدراس میں ہوا، آج کے جلسے کی صدارت مولانا ابو محمد عبدالحق صاحبؒ صدر اجلاس ہی نے فرمائی، مولانا عبدالحی صاحبؒ مددگار ناظم نے پچھلے سال اور سالِ زیر بیاں کی رپورٹ سنانی شروع کی۔

خطرناک رجحان

"ارکانِ ندوۃ العلماء! باوجود اس کے کہ چند دنوں سے جا بجا عربی مدارس کھلتے جاتے

ہیں، علوم وفنون اس درجہ انحطاط پذیر ہوتے ہیں کہ آئندہ زمانہ کی خطرناک حالت کا اندازہ کرتے ہوئے دل تھرا اٹھتا ہے۔

اول۔ انقلاب زمانہ کی وجہ سے ابنائے ملک کی طبیعتیں ایسی بدل گئی ہیں کہ وہ عربی اور اسلامی علوم کی جانب متوجہ نہیں ہوتے، خود مدارس اسلامیہ کے بانیوں اور مہتمموں کی اولاد انگریزی مدارس میں تعلیم پا رہی ہے۔

دوم۔ زمانے کی ضرورتوں نے ہر شخص کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو انگریزی پڑھوائے، جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ بچے اپنے دین ومذہب سے ناآشنائے محض رہ جائیں، اور حکمائے یورپ کے عقلی قیاسوں کو مذہب کی تنقید کا اصلی معیار قرار دیں یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ کو علماء پر اعتماد باقی نہ رہا، قدماء کی تصانیف ان کے نزدیک معتبر نہیں ہیں، فلاسفۂ یورپ ہمارے مذہبی مسائل پر رائے دیں تو اس پر ان کو جلد اعتماد ہو جاتا ہے، لیکن حکمائے اسلام کی تحریر پر ان کو شبہ باقی رہتا ہے، علماء کی تحقیر عربی علوم کا استہجان ان کے بلند حوصلگی کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔

سوم۔ علمائے کرام کی یہ حالت ہے کہ وہ علوم وفنون میں ترقی کرنے اپنے مبلغ استعداد کو بڑھانے ضروریاتِ زمانہ سے واقفیت پیدا کرنے اور متفقہ قوت سے کام لینے کی طرف بالکل متوجہ نہیں..... وہ اس بات سے مطلقاً ناآشنا ہیں کہ مغربی علوم وفنون اور یورپین مذاق وخیال نے مسلمانوں کو کس قدر مبہوت کر دیا ہے، اور اسلام کے اصول و فروع کے اندر کتنے شکوک ان کے دلوں میں بٹھا دیئے ہیں۔

چہارم۔ علماء کی جماعت میں ربط واتحاد کا کوئی خاص سلسلہ نہیں، نہ ان میں باہمی خط وکتابت ہے نہ کوئی تعارف کا کوئی سلسلہ ہے، جو عالم جہاں کام کر رہا ہے، تنہا اپنے

خاص خیال کے موافق کر رہا ہے اور علماء سے مشورہ اور استصواب نہیں ہو سکتا، چند اہلِ دل علماء کو اس بات کا خیال پیدا ہوا کہ ہم اپنی پراگندہ قوت کو مجتمع کریں، پہلے اپنی اصلاح کریں، پھر اس کے بعد مسلمانوں کو سنبھالنے کی کوشش کریں، اسی جگہ سے ندوۃ العلماء کے قائم کرنے کی تحریک پیدا ہوئی، اور ۱۳۱۱ھ میں بمقام کانپور اس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔

مقاصدِ خمسہ

ندوۃ العلماء نے اپنے مقصود اصلی میں کامیاب ہونے کے لئے پانچ شکلیں اختیار کی ہیں، میں ان مقاصد خمسہ کو مختصر عرض کرتا ہوں۔

۱۔ ترقیِ تعلیم۔ وہ تنزل جو زمانے کے انقلاب اور ہماری بدقسمتی سے علوم اسلامیہ میں ہو گیا ہے، اور روز بروز ہوتا جا رہا ہے وہ کسی طرح روکا جائے، پھر اس میں برگ و بار پیدا کئے جائیں، اور جو علوم عرصہ سے ہمارے نصاب میں داخل نہیں ہیں، اور جن کے نہ جاننے سے تعلیم یافتہ گروہ علمائے حال کو بُری نظروں سے دیکھتا ہے، اضافہ کئے جائیں تاکہ علماء اس خدمت کو انجام دے سکیں، جو ایک زمانہ میں ہمارے اسلاف نے انجام دی ہے، اسی خیال پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔

۲۔ طریقۂ تعلیم کی اصلاح۔ ہماری ناواقفیت کا صرف نصاب و درس ہی ذمہ دار نہیں بلکہ طرزِ تعلیم ایسا ناقص ہو گیا ہے کہ جس کو قائم رکھ کر کبھی اس بات کی توقع نہیں ہو سکتی کہ طلبہ میں علو حوصلہ، بلند نظری، مذاقِ صحیح، زمانے کی ضرورتوں سے واقفیت پیدا ہو اور ملک و قوم میں وہ ہر طرح کا اعتبار پیدا کر سکیں۔

۳۔ رفعِ نزاعِ باہمی۔ اس سے مقصود ان بیہودہ نزاعوں کا روکنا ہے جس کی

وجہ سے مسلمانوں کے مختلف گروہ میں نہایت شرمناک جھگڑے اور فساد برپا رہتے ہیں۔

۴۔ درستیٔ اخلاق: آج مسلمانوں کے اخلاق ایسے بگڑے ہوئے ہیں کہ اکثر برائیوں میں نظیر پیش کی جاتی ہے، صاحب اخلاق ہونے کے اب یہ معنی سمجھے جاتے ہیں کہ نمائش اور تصنع سے کام لیا جائے، بداخلاقی روز بروز بڑھتی جاتی ہے، جھوٹ، غیبت، فریب، خود غرضی، ایذا رسانی اور بدمعاملگی کا رواج ہمارے اندر بڑھتا جاتا ہے، لہٰذا ندوۃ العلماء کا یہ مقصد ہے کہ وہ واعظین کے ذریعہ سے اس خرابی کو بھی دفع کرنے کی کوشش کرے۔

۵۔ مسلمانوں کی بہبودی عام:۔ اس مقصد کے ضمن میں بہت سی چیزیں آسکتی ہیں مثلاً مسلمانوں کو کسب معاش کے جائز اور عمدہ وسائل کی طرف متوجہ کرنا اور رسوم قبیحہ سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرنا وغیرہ۔

رسوم قبیحہ کی اصلاح

حضرات! اجلاس نہم مقام امرتسر میں سب سے زیادہ اہم اور شاندار وہ تجویز منظور ہوئی تھی، جو رسوم قبیحہ کے متعلق تھی، یعنی رسوم قبیحہ کی اصلاح کرنا اس کی عملی کارروائی گذشتہ زمانوں میں بھی کی گئی ہے تاہم اس کو زیادہ قوت کے ساتھ عمل میں لانے کے لئے یہ طریقہ قرار دیا گیا کہ جو جو علماء ندوے میں شریک ہوں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں وعظ و نصائح کے ذریعہ سے اس سال شادی کے رسوم میں سے ناچ، گانا، اور آتش بازی اور غمی کے رسوم میں سے محض نام و نمود کے لئے آسودہ لوگوں کو کھانا کھلانے کی برائیاں عامۂ مسلمین کے ذہن نشین کرکے ان کے ترک کی تاکید کریں، میں نہایت خوشی سے آپ کو اس کی اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ یہ تجویز بالکل بے اثر نہیں رہی اسی کا اثر ہے کہ بعض عالی حوصلہ حضرات نے اپنے یہاں کی تقریبوں میں رسوم قبیحہ کو اٹھا کر جو روپیہ اس طریقہ سے بچا اس کو انجمن ہائے اسلامیہ کے

نظر کر دیا ایسے واقعات کو بھی میں اسی سلسلہ میں شمار کر سکتا ہوں، اور ندوۃ العلماء کی بہت بڑی کامیابی سمجھتا ہوں اس ضرورت پر لحاظ کر کے باوجود کمی سرمایہ کے جلسۂ انتظامیہ منعقدہ ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ نے یہ فیصلہ کیا کہ ممالک متحدہ سے کام شروع کیا جائے اور چار عالم اس کام پر مقرر کئے جائیں۔!

قحط رجال

ندوۃ العلماء کو دو چیزوں کی اس وقت ضرورت ہے سب سے بڑی ضرورت روپے کی ہے جس کا بار ہمارے فیاض مسلمانوں پر ہے اور دوسری ضرورت آدمیوں کی ہے اور افسوس ہے کہ اس قحط الرجال میں یہ ضرورت بھی کچھ کم نہیں، کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ہزارہا عالم ہیں اور صدہا واعظ اور مدرس ہیں اور ہر سال مدارسِ اسلامیہ سے کھیپ کی کھیپ نکلتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ جب مدرس کی ضرورت ہوتی ہے تو نہیں ملتا ہے، جب واعظ کی ضرورت ہوتی ہے تو نہیں ملتا ہے، اتالیق کی ضرورت ہوتی ہے تو ندارد، اب کیسا رونے کا مقام ہے کہ حالت یہ ہے اور ہمارے علماء کو اس کا احساس بھی نہ ہو، اور اس حالت کو دیکھ کر جب کسی کے دل میں درد پیدا ہو اور اس سلسلے میں کچھ کام کرنا چاہے تو ہمارے احباب اس کے سر ہو جائیں اور دم لینے کی مہلت نہ دیں!

اس کے بعد تجویز اول کی تائید کرتے ہوئے مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری نے ایسے جوش اور برجستگی سے تقریر کی جس سے تمام حاضرین متاثر ہوئے آپ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ:۔

ایسی بلندی، ایسی پستی

"ہم مسلمانوں کی سابقہ حالت جب کہ ہم زیر اثر احکام و ضوابط اسلام تھے من کل الوجوہ کیا باعتبار عبادات و عادات و تہذیب و اخلاق اور کیا بحیثیت زہد و تقوی و اصولِ

تمدنی، ایسی دلربا اور نورانی تھی جس کا نظارہ اسلام کے مخالفین کی نگاہ کو چکا چوند میں ڈال دیتا تھا، اور ہماری قوم تمام اوصاف حمیدہ اور اخلاق برگزیدہ عبادت، علمیت، سخاوت، شجاعت، دیانت، صداقت، استقامت، اخوت، مروت، مواسات، عدل و حیاء، احسان رحم، صنعت و حرفت، تجارت وغیرہ میں ضرب المثل تھی، اور ہماری مجالس شرک و بدعت و اسراف بے جا اور تمام عیوب سے پاک و صاف تھیں، اور شائستگی اور ہنرمندی اور نیک صحبتی اور اچھی ہم نشینی سے مملو اور ہمارا ہر فرد نیک ولولہ اور فکر عقبیٰ میں سرشار اور اخوت ایمانی اور محبت دلی سے ایک دوسرے پر شیدا اور جاں نثار تھا، اور جب سے ہم نے بدنصیبی سے دامن دین متین کی اطاعت کا چھوڑ دیا اور اغیار کی صحبت اور رسوم اور نفسانی خواہشوں کے زیر اثر ہو گئے، تب سے ہماری سب تقریبیں شادی اور غم کو اور ہم خود کو رسوم کفریہ منکرہ اور بدعات ضالہ اور شنیعہ نے احاطہ کر لیا ہے، اور ہمارے وہ سب کمالات ضائع ہو گئے جن کے بیان سے روئے قلم سیاہ اور صفحۂ کاغذ کوتاہ ہے۔

ہم مسلمان وہ قوم ہیں کہ جن کی کتاب پاک جامع علوم و معاش اور مزکّی تمام عیوب ہے، اس میں ایسی مجالس کے قریب جانا بھی منع ہے کہ جس میں ایک فاحشہ مسماۃ کو جو واجب القتل ہے، عزت دینی اور اس کی خوش الحانی آواز سے سب کے کانوں کو ناپاک کرنے اور اس کی حرکات اور انداز شہوت انگیز کو خود توجہ سے دیکھنا اور دوسروں کو دکھانا ہو، چہ جائیکہ ہم ایسی مجالس کی اپنے مکانوں میں بنیاد ڈالیں۔

آتش بازی کا جلانا اور چھوڑنا اور بلا وجہ ایسی کارروائی کرنا اسراف بے جا میں داخل ہے، علمائے کرام نے ایسے اسراف کو حرام لکھا ہے، رسوم منکرہ اور بدعات شنیعہ، شادی اور غمی کی تقریبوں میں خصوصاً بلکہ رسوم کفریہ بھی عموماً قوم میں عام ہیں، چونکہ یہ رسوم منکرہ

اور بدعات شنیعہ کے بتقریب شادی وغمی کے قوم میں بمنزلہ امراض عامہ اور زمزمہ کے عام ہو رہی ہیں، اور ہر اطراف واکناف ہند میں مدت مدید سے شائع ہیں، علمائے دین اور مشائخ ملت بمنزلہ حکیم حاذق اور ڈاکٹر بالیاقت کے ہیں، اور انجمن ہائے اسلامی جو ہر شہر اور قصبہ میں ہیں، بفضلہ تعالیٰ قائم ہیں، روز افزوں اور زیادہ ہوتی جاتی ہیں، بمنزلہ شفاخانہ کے ہیں، پس ایسے امراض عامہ کے علاج کو صرف ندوۃ العلماء کے مجلس مبارک پر منحصر نہ رکھنا چاہئے، لہٰذا سب علمائے کرام اور مشائخ عظام اور انجمن ہائے اسلامی کو عموماً اور انجمن ہائے معین الندوہ کو خصوصاً توجہ دلاتی ہے، وہ حضرات سب کے سب کمال سرگرمی سے اپنے اثر کو کام میں لائیں اور سعی مردانہ، اور کوشش بزرگانہ سے ان رسوم مضرہ کو مٹائیں، اگر جمیع علماء اور مشائخ اور انجمن ہائے اسلامی اور معین الندوہ نے اپنے اپنے زیر اثر حلقہ میں لگاتار توجہ مبذول فرما کر کوشش کی تو عنقریب وہ وقت آئے گا کہ ہماری قوم کے سب کے سب اور ہندوستان کے مسلمان رسوم مضرہ سے پاک وصاف ہو جائیں گے"، ان کی تقریر کے بعد اجلاس اول برخاست کر دیا گیا۔

مختلف اجلاس

روز دوشنبہ ۱۵ رشوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۴ء ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک اجلاس دوم منعقد ہوا، اس جلسہ کے صدر بھی جناب مولانا عبدالحق صاحب دہلوی تھے، اور یہ اجلاس اسپرنگس گارڈن میں ہوا، اس کے بعد ایک عرب صاحب نے تبرکاً قرآن کی چند آیات تلاوت کیں، اس کے بعد چند تجویزیں منظور ہوئیں، اور چند شعراء نے منظوم قصائد میں ندوۃ العلماء کی تحسین وتائید کی، مولوی ابراہیم خان صاحب کی طویل نظم کے چند شعر

خدا ہر دم بڑھائے اقتدار ندوۃ العلماء ۔۔۔ رہے ارشاد اور توفیق یار ندوۃ العلماء

مسلمانوں کی عظمت اور مسلمانوں کی ہمدردی ۔۔۔ شعار ندوۃ العلماء وثار ندوۃ العلماء

جہاں تک خطۂ مدراس کو نازش ہو زیبا ہے ۔۔۔ کہ جس پر سایہ افگن ہیں خیار ندوۃ العلماء

اس کے بعد سامعین حضرت مولانا شاہ محمد سلیمان چشتیؒ کا بڑی شدت سے انتظار کرنے لگے کیونکہ وہ آج تصوف کے موضوع پر تقریر کرنے والے تھے، مولانا نے اپنی تقریر شروع کی، سامعین کی ہچکیاں بندھ گئیں، مولانا کی بھی شدت جذبات اور آہ و بکا و گریہ و زاری سے آواز رندھ گئی، لہذا تقریر پوری نہ ہو سکی اور سامعین تشنہ لب ہی رہے اس کے بعد چند اور مقرروں نے تقریریں کیں اور دعا کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

روز شنبہ ۱۶ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۵ جنوری ۱۹۰۴ء مقام اسپرنگس گارڈن ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک اجلاس سوم منعقد ہوا، مولانا عبدالحق صاحب دہلوی کی تحریک اور قاضی علی احمد صاحبؒ کی تائید سے آج مسند صدارت پر مولانا سید عبداللطیف صاحب رونق افروز ہوئے، سب سے پہلے قاری سید میران شاہ صاحب نے کلام مجید کی چند آیتیں مصری لہجہ میں ——— تبرکاً تلاوت فرمائیں، اس کے بعد مولانا محمد غوث سعید صاحب ڈگار پرائیویٹ سکریٹری مدار المہام سرکار عالی نے تمسک بالکتاب والسنہ پر اپنا مضمون سنایا، اس کے بعد جناب ملا عبدالقیوم صاحب معتمد دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد دکن نے تقریر کی، اس کے بعد مولانا قاضی علی احمد صاحبؒ بدایونی کے تقریر کرنے کے بعد جلسۂ سوم برخاست ہوا۔

ندوۂ اعظم، علمائے عزیز

روز چہار شنبہ ۱۷ شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۶ جنوری ۱۹۰۴ء ۹ بجے سے ۲ بجے تک

مقام مدراس یتیام پیٹھ اسپرنگس گارڈن میں اجلاس چہارم منعقد ہوا، مولانا غلام محمود صاحب فیجر سرحن جنرل آفس مدراس کی تحریک اور جناب احمد محی الدین بہادر رئیس مدراس کی تائید سے شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی ناظم سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد صدر نشین منتخب ہوئے اس کے بعد شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر آبزرور لاہور شوق اور بے تابی کے جھرمٹ میں اسٹیج پر تشریف لائے، آپ نے "ہمارا دارالعلوم اور عالم خیال" کے موضوع پر تقریر فرمائی، آپ نے عالم تصور میں اس مثالی درس گاہ کا نقشہ کھینچا جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا تخیل تھا۔

علامہ شبلی نعمانی اور دوسرے علمائے کرام کے تقریر کرنے کے بعد جناب ابوبکر بن شہاب حضرمی نے ایسے جوش اور خلوص کے ساتھ دعا فرمائی کہ حاضرین جلسہ میں جو لوگ عربی زبان سے ناآشنا تھے ان پر بھی ایک قسم کی کیفیت طاری تھی، ہر طرف سے آمین کے نعرے بلند ہو رہے تھے، اجلاس میں مولوی حکیم عبداللہ صاحب جنیکر رئیس بمبئی کا عربی قصیدہ بھی پڑھا گیا، ایک شاعر نے قطعۂ تاریخ انعقاد اجلاس ندوۃ العلماء نکالی ؎

للہ الحمد بمدراس شدہ	جلسۂ اقدس ندوہ تجویز
ہاتفم سال گذشتہ گفتا	ندوۂ اعظم علمائے عزیز

۱۳۲۱ھ

INDEX

اشاریہ

"تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول"

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

شخصیات

الف

(حضرت) ابوبکر صدیق رضؓ ۱۸۵

(حضرت) ابوعبیدہؓ ۷۹، ۱۴۱

(مولوی) ابراہیم خاں ۳۲۷

(مولانا ابومحمد) ابراہیم آروی ۱۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۳۴، ۲۰۲، ۲۸۱

ابن رشد ۱۲۵، ۱۴۷، ۲۹۹

ابن سینا ۱۰۶

(منشی سید) ابن علی ۲۸۶

(مولانا) ابوبکر بن شہاب علوی حضرمی ۳۱۹، ۳۲۹

(مولانا) ابوالحسن علی ندوی ۹، ۱۶، ۲۶، ۳۲، ۴۳، ۴۵، ۵۸، ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۹۷، ۱۳۳، ۱۷۸، ۳۱۲

(مولانا شاہ) ابوالخیر فصیحی غازیپوری ۲۰۸، ۲۱۲، ۲۴۵، ۲۶۴، ۳۱۸

(مولانا) ابوالقاسم ہنسوی ۸۸

(مولانا) ابوالکلام آزاد ۳۱۱

ابونصر فارابی ۱۰۶، ۱۴۶

(مولوی حکیم) ابویحیی محمد شاہجہانپوری ۲۲۸

(منشی) احتشام علی کاکوروی ۱۳، ۱۴، ۲۱۰، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۷۸

(مولانا حکیم) احسان علی مرادآبادی ۱۹۰

(ڈاکٹر) احمد امین ۷۹

(مولوی حکیم) احمد جیتکر ۲۳۹

احمد حسن خاں شاہجہانپوری ۲۳۷

(مولانا) احمد حسن کانپوری ۹۶، ۱۰۴، ۲۱۶، ۲۲۲، ۲۴۸

(مولانا سید) احمد حسین رائے بریلوی دیکھئے عبدالحی حسنی

(سرسید) احمد خاں ۳۸، ۴۲، ۴۵–۵۳، ۵۹، ۱۰۸، ۱۱۳، ۱۱۵، ۲۳۲

(مولوی) احمد رضا خاں بریلوی ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۷۲–۷۴، ۱۷۷

(حضرت سید) احمد شہید ۲۷–۳۲، ۲۵–۲۹، ۳۶، ۴۶، ۲۱۵، ۲۱۷

(مولانا) احمداللہ عظیم آبادی ۳۶

(مولانا پیر) احمد علی شاہ ۳۱۴

(مولانا) احمد علی محدث سہارنپوری ۱۳۲، ۱۵۵

(خان بہادر) احمد محی الدین ۳۱۸، ۳۲۹

ارسطو ۷۵، ۱۴۶

(مولوی) اسحاق جلیس ندوی ۱۴

(مولانا شاہ) اسحاق محدث دہلوی ۲۱۵، ۲۱۶

(مولانا شاہ) اسماعیل شہید ۲۶، ۲۱۵، ۲۱۷

(مولوی سید) اشفاق حسین ۱۵۸

(شیخ) اصغر علی تاجر عطر ۲۱۳

(منشی) اظہر علی کاکوروی ۱۳، ۱۱۷، ۱۳۱، ۱۳۳
۱۳۴، ۱۳۸، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۸۹، ۱۹۸، ۲۰۸
۲۱۰-۱۴، ۲۱۸
۲۲۵، ۲۲۶، ۲۳۷، ۲۵۹، ۲۷۹، ۲۸۰
۳۰۶
(مولانا) اعظم حسین صدیقی خیرآبادی ۱۸۶، ۲۰۶
(سر) آغا خاں ۵۱
(مولانا) افہام اللہ لکھنوی ۱۲۴، ۱۲۸
اکبرالہ آبادی ۴۹، ۵۰، ۶۱، ۶۲
(مولانا) اکرام اللہ خاں ندوی ۳۱۱، ۳۱۲
(علامہ) اقبال ۲۴، ۹۲
(حافظ) الٰہی بخش ۱۱۴
(ملکۂ) الزبتھ ۲۰
(مولانا) الطاف حسین حالی ۴۹، ۵۱، ۵۳
۱۰۶، ۲۶۰، ۳۱۰
(آنریبل) الفنسٹن ۳۷
(کپتان) الگزنڈر اسمتھ ۳۷
(حکیم) امام الدین خاں ۲۳۴
(مولانا شاہ) امانت اللہ فصیحی غازیپوری ۱۲۵
۱۲۶، ۱۲۹، ۱۳۳، ۲۰۲، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۴۵
۲۶۴، ۲۸۱
(منشی) امتیاز علی ۲۱۰، ۲۳۶
(منشی) امداد حسین اخگر ۱۹۰
(ڈپٹی کلکٹر مولوی) امداد العلی ۴۹
(حضرت حاجی) امداد اللہ مہاجر مکی ۱۲، ۱۰۲
۱۳۴، ۱۷۶، ۱۹۷، ۲۲۲، ۲۴۳، ۲۴۸
(نواب) امیر خاں ۲۶، ۲۹
(نواب سید) امیر حسن خاں سی آئی ای ۲۶۲
۲۶۳، ۲۶۶
(جسٹس سید) امیر علی ۵۰، ۲۶۴
(حکیم) امین الدین شاہ پوری ۲۹۹
(مولوی) انشاء اللہ خاں ۲۸۵
اورنگ زیب عالمگیر ۲۰، ۲۱، ۳۷
ایڈورڈ تھامپسن ۳۵

(ب)

(مسٹر) بارتھلمیو ۱۸
(قاضی ابوبکر) باقلانی ۱۴۷
(مولانا) بحرالعلوم دیکھئے عبدالعلی
(منشی) بدرالدین ۱۰۷
(مولانا) بدرالدین حیدر ۲۶۳
(پنڈت) برج موہن دتاتریہ کیفی ۳۸
برگ ایڈمیز ۲۲
(مولانا) بزرگ علی ۲۱۵
(مولوی) بشیرالدین ۱۰۳
بشیر احمد کاکوروی ۲۴۴
(شیخ) بوعلی ۶۸
بہادر شاہ ظفر ۳۱، ۳۳
(لارڈ) بیکن ۳۰۰
(مسٹر) بیگالن ۱۹

(ت)

(مولوی) تاج الدین احمد ۲۲۱
(مولانا سید شاہ) تجمل حسین ویسنوی ۹۶

(راجہ) تصدق رسول خاں ۱۳۱، ۲۱۱
(علامہ) تفتازانی ۶۹
(سر) تھامس میزو ۴۱

ٹ ث

ٹیپو سلطان ۲۵-۲۱، ۲۹
(مولانا) ثناء اللہ امرتسری ۱۳، ۹۶، ۳۰۸

ج

جان لارنس ۳۳
(مولانا) جسیم الدین مونگیری ۱۹۰
(ملا) جلال ۶۶
(پیر) جماعت علی شاہ نقشبندی ۲۹۷
(شہنشاہ) جہانگیر ۲۰

چ

چارلس دوم ۲۰
(ڈاکٹر) چراغ الدین جوہر امرتسری ۳۰۵
چنگیز ۳۳

ح

(مولانا) حالی دیکھئے الطاف حسین
(ملا) حسن ۶۵
(قاری سید) حسن ۱۹۱
(نواب) حسن خاں مرادآبادی ۲۴۰
(سید) حسن شاہ لکھنوی ۲۱۱
(خواجہ) حسن نظامی ۱۹-۳۱۷
(مولانا) حفیظ اللہ ۱۲۸، ۱۳۲، ۱۷۴، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۳، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۷۱، ۲۹۹
(ملا) حمد اللہ ۶۵
(مولانا) حمید الدین ۱۷۵
(سلطان) حیدر علی ۲۱، ۲۳، ۲۹
(مولوی سید) حیدر ولی اللہ قادری ۳۱۷
(مرزا) حیرت دہلوی ۸۹، ۱۷۴

خ

(حضرت) خالد بن ولیدؓ ۷۹، ۱۴۱
خالدہ ادیب خانم ۷۵
(مسٹر) خلیل احمد ۲۷۱
(مولانا) خلیل الرحمٰن سہارنپوری ۱۳، ۱۳۲، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۰-۲۰۸، ۲۱۳، ۲۳۶، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۷۸، ۲۷۹، ۳۱۸
(حکیم) خورشید علی لکھنوی ۲۴۱
(شیخ) خیر الدین ۲۹۶

د ذ

(مہاراجہ) دولت رائے سندھیا ۲۸
(مولوی) ذکاء اللہ ۳۴، ۳۸، ۵۱

ر ز

(لارڈ) رابرٹس ۳۵
(نواب حافظ) رحمت خاں ۳۷
(مولانا مفتی) رحیم بخش ۱۵۶، ۲۰۷-۲۰۸
(پروفیسر) رشید احمد صدیقی ۵۰
(مولانا) رشید احمد گنگوہی ۶۴، ۱۷۷
(مولانا شاہ) رشید الحق دیکھئے محمد رشید
(علامہ سید) رشید رضا مصری ۶۸، ۶۹، ۹۱

(مولانا شاہ) رفیع الدین ۲۱۵
(شمس العلماء مولانا) رکن الدین سید محمد القادری ۳۱۶، ۳۱۷
رنجیت سنگھ ۲۹، ۳۱
(مولانا) رونق علی ۲۰۸
(میر) زاہد ۶۶

س

سراج الدولہ ۲۱، ۲۲، ۲۵
سرسید دیکھئے احمد خاں
(راجہ) سیسینڈی ۲۲۶
(مولوی) سعد الدین ۱۸۹
(مولانا شاہ) سلامت اللہ ۱۳۳
(مولانا شاہ) سلیمان چشتی قادری پھلواروی ۱۲، ۹۶، ۱۰۳، ۱۱۲، ۱۲۳، ۱۲۷-۱۲۵، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۵۶، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۵، ۲۱۲، ۲۲۰، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۲، ۲۶۴، ۲۶۶، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۸۷، ۲۹۱، ۳۱۸، ۳۲۸
(علامہ سید) سلیمان ندوی ۱۳، ۹۵، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۴۶، ۲۵۰، ۳۱۰، ۳۱۲
(سلطان) سلیم عثمانی ۲۳
سنجر طہرانی ۲۵۵
SMITH (BOSWORTH) ۳۴

ش

(شہنشاہ) شاہجہاں ۲۰
(علامہ) شبلی نعمانی ۱۲، ۵۰، ۵۱، ۵۳، ۶۷، ۷۲، ۷۳، ۷۷-۷۵، ۸۰، ۹۲-۹۰، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۲۱، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۷۵، ۱۸۲، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، ۲۰۸، ۲۲۰، ۲۴۳-۲۴۱، ۲۴۵، ۲۵۰، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۶، ۲۶۹، ۲۹۱، ۳۰۱، ۳۰۹-۱۲، ۳۱۹، ۳۲۹
(مولوی سید) شرف الدین بیرسٹرایٹ لا ۲۴۶، ۲۵۰، ۲۵۲، ۲۵۶، ۲۶۶، ۲۷۱، ۲۷۲
(مولوی) شمس تبریز خاں ۱۵
(منشی) شمس الدین سکریٹری مدرسہ عثمانیہ ۲۲۱
(منشی) شمس الدین اعجاز رقم ۱۲۱
(حاجی) شمس الدین ۲۸۶
(مولوی سید) شمس الہدیٰ ۲۶۲
(مولانا) شفقت اللہ بدایونی ۱۶۰، ۱۶۶
شیر سنگھ ۳۱
(مسٹر) شیلڈن ۳۹

ص ض

(مفتی) صدر الدین آزردہ ۱۶۱، ۲۳۴
(نواب سید) صدیق حسن خاں ۱۳
(شیخ) ضمیر الدین ۳۰۱
(مولانا) ضیاء الحسن علوی ندوی ۳۱۱

(ط) (ظ)

(مولوی) طفیل الدین بدایونی ۲۳۹
(مولوی سید) ظہور احمد ۱۳
(مولانا سید) ظہور الاسلام فتحپوری ۱۲، ۹۶، ۱۰۷، ۱۳۲، ۱۵۶، ۱۷۷، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۶، ۲۴۵
(پرنس) ظہیر الدولہ ۳۱۸

(ع)

(حضرت) عمر فاروق رضؓ ۷۹، ۱۴۱، ۱۸۵
(حضرت) عثمان غنی رضؓ ۱۸۵
(حضرت) علی مرتضیٰ رضؓ ۱۸۵
(حضرت) عمرو بن العاص رضؓ ۷۹، ۱۴۱
(شاہ) عالم ۲۵
(مولوی حکیم) عبدالباری نگرنہسوی ۲۲۲
(مولانا) عبدالباری فرنگی محلی ۲۱۲
(مولانا) عبدالجبار عمرپوری ۱۲۸، ۱۹۰، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۴
(مولانا ابو محمد) عبدالحق حقانی دہلوی ۱۳، ۶۷، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۲۱، ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۳۴، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۶، ۱۸۳، ۱۸۷، ۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۵، ۲۱۶، ۲۵۹، ۲۶۵–۶۷، ۲۶۹، ۲۷۲، ۳۱۸، ۳۲۷، ۳۲۸
(مولانا قاضی) عبدالحق ۲۴۳
(مولانا حکیم سید) عبدالحی حسنی ۱۳، ۵۸، ۶۴، ۶۷، ۶۹، ۸۳، ۸۶، ۱۰۷، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۶، ۱۶۵، ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۸۰، ۱۸۴، ۱۸۸، ۱۹۹، ۲۰۶، ۲۰۸–۱۰، ۲۱۳، ۲۱۷، ۲۲۰، ۲۲۴، ۲۲۶، ۲۳۶، ۲۴۰–۴۲، ۲۵۰، ۲۶۶، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۸۹، ۲۹۷، ۳۱۹، ۳۲۱
(مولانا) عبدالحی دہلوی ۲۶
(مولانا) عبدالحی وکیل چندوسی ۲۴۱، ۲۷۹
(مولانا) عبدالحی فرنگی محلی ۱۲
عبدالرافع ڈپٹی کلکٹر ۱۷۷، ۲۱۲، ۲۴۰، ۲۸۳
(مولانا حکیم) عبدالرب دہلوی ۲۶۶
(قاری) عبدالرحمٰن ۲۴۸
(مولانا قاری) عبدالرحمٰن محدث پانی پتی ۱۳۳
(مسٹر ابوالفضل) عبدالرحمٰن ۲۶۶
(مولانا) عبدالرحمٰن نگرامی ندوی ۳۱۱
(مولوی) عبدالرحیم (واعظ) ۲۳۸
(مولانا) عبدالرحیم صادقپوری ۳۶
(شیخ) عبدالرحیم کلکٹر ۲۳۶
(مولانا) عبدالرؤف فرنگی محلی ۲۱۱، ۲۱۳
(قاری) عبدالسلام پانی پتی ۳۱۴
(مولانا) عبدالسلام رفیقی نورپوری ۳۱۴
(مولانا) عبدالسلام ندوی ۳۱۱
(مولانا) عبدالسلام قدوائی ندوی ۳۱۲
(مولانا) عبدالشکور فاروقی کاکوروی ۲۱۳، ۲۲۰
(نواب) عبدالشکور خاں ۲۳۷
(مولانا شاہ) عبدالعزیز دہلوی ۲۶–۲۴، ۴۲، ۴۸، ۱۶۱، ۱۷۷، ۲۱۵، ۲۱۶
(مولانا) عبدالعزیز فرنگی محلی ۲۴۴

(مولوی حکیم) عبدالعزیز لکھنوی ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۱۴
(منشی) عبدالعزیز ۲۸۵
(خان بہادر) عبدالعزیز شاہ ۳۱۶
(مولانا) عبدالعلی آسی مدراسی دیکھئے محمد عبدالعلی
(ڈاکٹر حکیم سید) عبدالعلی ۱۳
(ملک العلماء مولانا) عبدالعلی بحرالعلوم ۶۵، ۱۶۱، ۲۱۲، ۲۴۳
(مولوی) عبدالغفور ۲۸۶
(مولانا) عبدالغنی خاں دیکھئے محمد عبدالغنی
(مولانا شاہ) عبدالقادر ۲۶
(شیخ) عبدالقادر لاہوری ۲۵۰، ۲۷۳، ۲۸۵، ۲۹۰، ۳۰۶، ۳۱۹، ۳۲۹
(شیخ) عبدالقادر جرجانی ۶۸
(مولانا حافظ) عبدالقادر ۱۲۸
(مولانا) عبدالقادر بدایونی ۱۷۳، ۱۷۷
(شیخ) عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا ۲۵۴
(مولانا) عبدالقدیر بی، اے ۲۶۶
(مولانا) عبدالقیوم حیدرآبادی ۱۳۳، ۲۷۶، ۳۱۹، ۳۲۸
(مولانا) عبدالکریم ۳۱۲
(مولانا) عبداللہ آروی ۱۲۸
(مولانا) عبداللہ انصاری ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۲۶، ۱۲۹، ۱۴۲، ۱۶۰، ۱۶۶، ۱۸۹
(مولوی حکیم) عبداللہ جیتکر ۳۲۹
(مولانا) عبداللہ عمادی ۳۱۱
(مولانا مفتی) عبدالباری ۲۴۳
(مولانا مفتی) عبداللطیف سنبھلی ۲۰۹، ۲۱۶، ۲۲۰، ۲۴۳
(مولانا سید) عبداللطیف قادری ۳۱۷، ۳۲۸
(مولانا حافظ ابوالغناء) عبدالمجید ۲۱۲
(مولانا) عبدالمجید فرنگی محلی ۱۲۱، ۲۱۱
(مولوی) عبدالواحد خاں نقشبندی ۲۳۷، ۲۴۰-۴۲، ۲۸۳
(خواجہ) عبدالواحد ندوی ۳۱۱
(مولانا) عبدالواحد کانپوری ۱۰۷
(مولانا) عبدالوہاب آروی ۱۲۸، ۱۶۰
(مولانا شاہ) عبدالوہاب فرنگی محلی ۱۲۳، ۲۸۱
عزیز لکھنوی ۱۳۲
(مولانا حافظ) عزیزالدین دہلوی ۱۶۰، ۱۸۳
(قاضی) عضدالدین ۱۲۵
(حضرت شاہ) علم اللہ حسنی ۱۴
(مولانا قاضی) علی احمد محمداللہ شاہ بدایونی ۱۸۹-۲۶۶، ۲۸۷، ۲۹۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۸
(سید) علی اسلم پھلواروی ۲۲۲
(مولوی) علی بخش ۴۹
(مولانا شاہ) علی حبیب پھلواروی ۲۵۰
(حسام الملک نواب سید) علی حسن خاں ۱۳-۸۹
(مفتی) عنایت احمد ۹۵، ۱۰۴، ۲۱۵
(مولانا) عین الحق پھلواروی ۲۵۰
(مولانا) عین القضاۃ ۲۱۲

(غ)

(نواب) غازی الدین حیدر ۱۹۵
(مرزا) غالب ۲۳۴، ۳۵، ۲۳۴
(امام) غزالی ۱۲۵، ۱۶۳
(مسٹر) غلام حسین عارف ۲۶۴، ۳۰۵
(مولانا) غلام الحسنین کنتوری ۱۰۴
(مفتی) غلام رسول امرتسری ۹۰، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۸۵
(شیخ) غلام صادق امرتسری ۲۸۷، ۳۰۶
(مولانا) غلام محمد شلوی ۱۳، ۲۴۲، ۲۸۷، ۳۱۴، ۳۱۵
(خان بہادر مولوی) غلام محمد راسی ۳۱۶
(مولانا) غلام محمد فاضل ہوشیارپوری ۱۲۸، ۱۶۰، ۱۶۳، ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۵، ۲۶۴، ۲۷۶، ۲۷۹، ۳۱۴، ۳۲۵
(مولانا) غلام محمود ۳۲۹
غلام یحییٰ ۶۵

(ف)

(حکیم) فارابی دیکھئے ابو نصر
(مولانا) فتح محمد نائب لکھنوی ۱۰۷، ۱۳۲، ۲۱۳، ۲۴۲
(مولانا حکیم) فخر الحسن گنگوہی ۹۶
(امام) فخر الدین رازی ۱۶۳
(مولانا حکیم) فخر الدین نقوی فخری ۳۱۶
فرعون ۶۸
(نواب خواجہ) فرید الدین خاں ۴۵
(حافظ) فصیح الدین سوداگر ۱۸۶
(خان بہادر مولوی) فضل امام ۲۵۲
(سید) فضل حق آزاد ۲۵۵
(مولانا) فضل حق رامپوری ۱۲۸، ۱۶۱
(ابو القاسم) فضل رب عرشی سنائی ۱۲۷، ۱۶۰، ۱۸۹
(مولانا) فضل رحمٰن گنج مرادآبادی ۱۲، ۹۷، ۱۳۳، ۳۱۶
(منشی) فیروز الدین ۲۸۶
(آنریبل) ایف۔ وارڈن ۳۷

(ق)

(حاجی شیخ) قادر بخش ۱۵۹، ۲۱۱، ۲۱۳
(مولانا) قادر بخش سہسرامی ۱۹۰
(علامہ) قطب الدین رازی ۱۰۶

(ک گ)

(لارڈ) کرزن ۲۹۵
(لارڈ) کلائیو ۲۲، ۴۰
(مسٹر) کوپرنیکس ۱۸
کولمبس ۱۸، ۱۹
(مسٹر) گری ۲۱۴
(شیخ) گلزار ۲۸۶
(مسٹر) گیلی لو ۱۸

(ل)

(لارڈ) لٹن ۵۰
(استاذ العلماء مولانا محمد) لطف اللہ علی گڑھی ۱۱

۸۹، ۹۷-۹۵-۵، ۱۰۳-۱۰۷، ۱۳۳
۱۳۴، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۷۹، ۱۸۶، ۱۹۱، ۲۱۶
۲۸۲

(۴)

سیدنا ونبینا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ۲۷
۶۳، ۸۵، ۹۲، ۱۲۶، ۱۴۷، ۱۸۵، ۲۵۳، ۲۶۴
۲۷۱، ۲۹۳

(قاضی) مبارک ۶۵

(ملا) مبین ۶۵

متی بن یونس ۱۴۶

(حضرت امام ربانی) مجدد الف ثانی ۱۷۷

(منشی) محبوب عالم ۲۸۵، ۳۰۶

(میر) محبوب علی خاں ۱۳۴

(نواب) محسن الملک ۵۰، ۵۱، ۱۰۸، ۱۱۳
۱۳۴، ۱۳۵، ۲۳۹، ۲۴۴

(مولوی) محمد ابراہیم کرنالی ۳۱۴

(مولوی) محمد ابراہیم لاہوری ۲۲۲، ۲۳۸

محمد احسان خاں ۲۳۸

(مولانا) محمد ادریس نگرامی ۲۱۳

(شاہ) محمد اسحاق ۱۶۱

(مولانا حکیم) محمد اسحاق خاں دربھنگوی ۲۵۰

(قاری) محمد اسماعیل دہلوی ۱۸۸

(مولانا حافظ) محمد اسماعیل شاہجہانپوری ۲۲۷
۲۳۶، ۲۷۹

(مولانا) محمد اشرف علی تھانویؒ ۹۶

(شاہ) محمد آفاق مجددی ۲۱۶

(مولوی) محمد اکبر ۸۶

(مولانا) محمد انوار اللہ خاں ۱۳۳

(مولانا حکیم) محمد ایوب پھلواروی ۱۷۴، ۲۱۳

(خاں بہادر) محمد برکت علی خاں ۲۸۶

(مولانا) محمد جعفر تھانیسری ۳۶

(نواب صدر یار جنگ مولانا) محمد حبیب الرحمن خاں شروانی
۱۳، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲
۱۳۴، ۱۵۵، ۱۶۰، ۱۸۴، ۲۰۵، ۲۰۷-۱۰
۲۱۶، ۲۲۲، ۲۳۰، ۲۳۷-۲۳۵، ۲۴۵
۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۸، ۲۷۶، ۲۷۹، ۲۹۲
۲۹۸، ۳۰۹، ۳۱۲

(مولانا) محمد الحسنی ۸۱، ۸۸، ۱۰۰

(مولانا) محمد حسین آزاد ۳۸

(مولانا حافظ شاہ) محمد حسین الہ آبادی ۱۳، ۹۶
۵-۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۱، ۱۲۲، ۱۲۸، ۱۳۲، ۱۳۴

(مولانا) محمد حسین بٹالوی ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۷

(منشی سید) محمد حسین بھڑوچی ۱۲۲

(مولانا ابوالفیض) محمد حسن فیضی ۲۲۲، ۲۳۸

(مولوی) محمد خالد ۲۵۲

(سلطان) محمد خاں ۳۰

(مولانا) محمد خلیل احمد ۹۶

(مولوی) محمد داؤد ۲۰۸

(مولانا شاہ) محمد رشید الحق عمادی قادری ۲۴۸
۲۵۸، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۵

(خان بہادر) محمد زماں خاں نصرت جنگ ۲۸۶

(حاجی) محمد سعید خاں سوداگر ۲۳۷
(مسٹر) محمد سلیمان بانکی پوری ۲۲۲، ۲۳۸
(مولانا شاہ) محمد سلیمان پھلواروی دیکھئے سلیمان پھلواروی
(خواجہ) محمد سلیمان تونسوی ۱۷۰
محمد سلیم الزماں خاں ۱۷۰، ۱۷۱
(مفتی حکیم) محمد سلیم اللہ ۲۲۱، ۲۸۶
(مولانا) محمد شاہ امرتسری ۲۹۹
(مولانا سید) محمد شاہ محدث رامپوری ۱۰۵، ۱۰۷
۱۲۱، ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۶۰–۶۲، ۱۶۶، ۱۹۳
(مولوی) محمد شریف غازیپوری ۱۸۴
(مولانا ابوالخیر) محمد صدیق ۲۶۶، ۲۷۱
(مولانا) محمد طیب ۲۴۴
(مولانا) محمد عادل ۱۰۷، ۱۳۳
(مولانا حکیم) محمد عبدالباری عظیم آبادی ۱۰۶
(حافظ) محمد عبدالحق ۱۲۲
(مولانا شاہ) محمد عبدالرزاق ۱۳۳
(مولانا) محمد عبدالعلی آسی مدراسی ۱۰۶، ۱۲۱
۱۲۲، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۲۰
(مولانا) محمد عبدالغنی خاں مؤرشید آبادی ۹۶
۱۰۶، ۱۰۷، ۱۳۲
(مفتی) محمد عبدہ ۶۸، ۶۹، ۷۴
(مولانا) محمد عبداللہ انصاری دیکھئے عبداللہ
(مولوی مفتی) محمد عبداللہ ۲۸۶
(مولانا مفتی) عبداللہ ٹونکی لاہوری ۱۰۶
(چودھری) محمد عظیم ۱۳۱
(مولانا) محمد علی ۱۷۴
(مولانا سید) محمد علی مونگیری ۱۰، ۱۲، ۱۵، ۷۹–۸۱
۸۸، ۹۶، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۷، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۲۱
۱۲۴، ۱۲۷، ۱۳۲، ۱۳۵–۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰
۵۶–۱۵۲، ۱۶۷، ۱۷۴، ۱۸۰، ۱۹۸، ۱۹۹
۱۰–۲۰۶، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۳، ۲۴۰، ۲۴۲
۲۵۹، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۲، ۳۱۸،
۳۱۹، ۳۲۱
(مولانا) محمد غوث سعید ۳۲۸
(مولانا) محمد فاروق چریاکوٹی ۶۵، ۱۲۸، ۲۲۰
۲۴۱، ۲۴۴، ۲۵۰، ۲۵۶، ۲۷۱
(مولانا) محمد قاسم نانوتوی ۳۸، ۴۴، ۴۶
۱۰۲، ۱۱۲، ۱۳۲، ۱۷۷، ۱۸۹، ۱۹۵
(مولانا) محمد قمرالزماں ۱۹۵
(شاہ) محمد مجیدالزماں ۱۷۰
(مولوی) محمد محمود ۲۲۲
(مولوی) محمد نسیم ایڈووکیٹ ۱۳، ۲۱۳
(شمس العلماء مولانا) محمد نعیم فرنگی محلی ۱۲۱، ۱۳۳
۲۴۳، ۲۸۱
محمد نعیم خاں ۲۳۷
(مولانا) محمد واصل ۱۹۵
(خواجہ) محمد یوسف ۱۶۱
(مفتی) محمد یوسف ۶۵
(مولانا) محمد یونس خاں ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۵۵
۱۰–۲۰۸
(مولانا) محمد یونس رئیس دتاولی ۱۰۶

(جسٹس سید) محمود ۱۰۸، ۱۳۵
(شیخ الہند مولانا) محمود حسن ۴۴، ۴۸، ۹۶
محمود خاں شاہجہانپوری ۲۳۷
(مولانا حافظ) محی الدین صوفی ۱۳۰
(مولوی) محی الدین ۳۱۷
(مولوی) مدن ۶۵
(مولانا) مسعود علی ندوی ۱۳
(مولانا) مسیح الزماں خاں شاہجہانپوری ۱۲
۱۲۳، ۱۳۴، ۱۹۸، ۱۲-۲۰۷، ۲۱۹، ۲۲۲
۲۳۶، ۲۳۷، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۷۷، ۲۷۹
۲۸۳، ۲۸۷، ۲۹۲، ۲۹۶، ۲۹۹، ۳۰۱،
۳۰۶، ۳۲۱
(نواب) قار الملک مولوی) مشتاق حسین ۱۹۱
۱۹۲، ۲۲۵، ۲۴۱
(مولانا سید) مشتاق علی (مبلغ ندوۃ العلماء) ۱۰۰
۳-۱۰۱، ۱۵۶، ۲۰۸
(مولانا) مشتاق علی فیض آبادی ۱۳۲
(شیخ) مشیر حسین ۲۱۳
مصطفیٰ احمد الزرقاء ۷۱
(مولانا) مملوک العلی نانوتوی ۴۶، ۱۹۵
(مولانا سید) مناظر احسن گیلانی ۴۴
(مولانا) منصور علی خاں ۱۳۸
(مولانا) منور علی شاہ ۱۷۶، ۲۱۳
(مولانا شاہ) منیر الدین اسلام پوری ۲۵۰
۲۶۶، ۲۶۹
مہدی افادی ۳۱۱
(قاری سید) میران شاہ ۲۸۷، ۳۲۸
(لارڈ) میکالے ۳۹، ۴۱
(مسٹر) میکڈانلڈ ۲۵۹

(ن)

(مولانا) ناظر حسن دیوبندی ۱۸۹
(مولانا) نانوتوی دیکھئے محمد قاسم
(ڈپٹی) نذیر احمد ۲۹، ۱۳۸، ۵۰، ۵۱
(مولانا) نذیر احمد خاں رامپوری ۱۷۳
(مولانا سید) نذیر حسین ۸۸
نپولین ۲۱، ۲۲، ۷۵
(خان بہادر چودھری) نصرت علی ۱۳۰
۱۳۴، ۲۱۱
(مولوی) نصیر الدین حسین بیرسٹر ۲۵۰، ۲۵۲، ۲۵۸
(حضور) نظام دکن ۱۲۷، ۱۸۹، ۱۹۸، ۲۸۳
۲۹۶، ۲۹۹
(بابو) نظام الدین ۳۰۶
(منشی) نظام الدین ۲۳۹
(مولوی شاہ) نظام الدین احمد بجھری ۲۴۱
۲۵۰، ۲۵۲، ۲۶۳
(ملا) نظام الدین سہالوی لکھنوی ۷۱، ۱۳۳
۱۴۷، ۱۶۱
(جنرل) نل ۲۴
(مولوی) نور الدین ۱۲۲
(مولوی) نور محمد ۱۵۶

(مولانا) نور محمد پنجابی ۹۶، ۱۲۸، ۲۱۶
(حاجی) نور محمد زکریا ۲۷۰
(مولانا حافظ) نیاز احمد ۱۰۶
نیوٹن ۱۸

(و)

(مولوی) واجد علی ۲۵۲
واسکوڈی گاما ۱۸، ۱۹
(مسٹر) والٹر ۲۹۹
(مولانا) وحید حسن ۲۶۶
(نواب) وقار الملک دیکھئے مشتاق حسین
(ملکۂ) وکٹوریہ ۴۴
(شہنشاہِ روس) ولاڈیمر ۹۱
(حضرت شاہ) ولی اللہ دہلوی ۲۵، ۱۶۱، ۱۷۷، ۲۱۵، ۲۱۷
(مولانا) ولی اللہ لکھنوی ۱۲۴
(سر) ولیم ڈگبی ۲۲
(سر) ولیم میور ۵۰
(سر) ولیم ہنٹر ۳۶

(ہ)

(مسٹر) ہارڈلیکس موٹر ۳۷، ۲۱۴
(مسٹر) ہربرٹ اسپنسر ۲۹۵
(مسٹر) ہسٹنگز ۴۰
ہلاکو ۳۳
ہمایوں کبیر ۳۷
(راجہ) ہندو راؤ ۲۸

(ی)

(مولانا) یحییٰ علی ۳۶
(مولوی) یعقوب علی ۱۲۶
یعقوب کندی ۱۰۶
(مولوی) یوسف حسن ۲۲۲
(خان بہادر خواجہ) یوسف شاہ ۳۰۶

کتابیات

آبزرور (اخبار) ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۷۳، ۲۸۵، ۲۹۰، ۳۰۶، ۳۱۹، ۳۲۹
امام الحجۃ علی مخالفی الندوۃ ۱۷۴، ۱۷۷
احیاء العلوم ۸۲، ۱۴۸
اردوئے معلّٰی ۳۵
ارشاد الکملاء ۱۷۴
اسباب بغاوت ہند ۴۸
اسرار البلاغۃ ۶۹
اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں ۶۵
اعجاز القرآن ۱۴۷
امرت بازار پتریکا (اخبار) ۲۴۷
انجیل ۶۸

ایساغوجی ۶۶
INDIAN MUSALMANS ۳۶
بہار نیوز بھاگلپور (اخبار) ۲۴۷
بیضاوی ۶۶، ۷۳
پرانے چراغ ۱۴، ۱۶
پیسہ اخبار لاہور ۲۸۵، ۳۰۶
تحفۂ محمدیہ ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷
تحقیق وانصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا ۳۲
مقدمہ
ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش ۷۵، ۷۶
تعمیر حیات (اخبار) ۱۴
تفسیر حسینی ۱۹۳
تفسیر حقانی ۱۸۳
توریت ۶۸
تہافۃ الفلاسفہ ۱۴۷
تہذیب الاخلاق (رسالہ) ۴۷
تہذیب ۶۶
الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ۶۵، ۷۱
جذوہ لرجوم أحزاب دار الندوہ ۱۷۴
جلالین ۶۶، ۷۳
حاشیہ عبدالعلی ۶۵
حاشیہ قاضی مبارک ۶۵
حبل المتین ۹۱
حمد اللہ (رسالہ) ۶۵، ۶۶
حیات حافظ رحمت خاں ۳۷
حیات شبلی ۱۳، ۹۷، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۱۷
۲۴۶، ۲۵۰، ۳۱۳
حیات عبدالحی ۱۳، ۵۸، ۶۰، ۱۳۵، ۱۷۸
در مختار ۱۹۳
دلائل الاعجاز ۶۹
دلی کالج میگزین ۳۸
دہلی اور اس کے اطراف ۸۷
دیوان متنبی ۲۴۹
THE OTHER SIDE OF THE MEDAL ۳۵
راہِ نجات ۱۹۳
الرفیق (رسالہ) ۱۳۵
سفرنامہ روم ومصر وشام ۷۶، ۷۸
سلّم ۶۵، ۷۱
سوانح قاسمی ۴۴، ۴۵، ۶۴
سیرت سید احمد شہیدؒ ۲۶، ۲۷، ۲۸
سیرت فریدیہ ۴۵
سیرت مولانا محمد علی مونگیری ۱۳، ۸۲، ۸۸
۹۷، ۱۰۰، ۱۷۳
شرح تجرید ۱۴۷
شرح سلّم العلوم (بحر العلوم) ۶۵
شرح سلم ملا حسن ۶۵
شرح سلم قاضی مبارک ۶۵
شرح سلم ملا مبین ۶۵
شرح مقاصد ۱۴۷
شرح مواقف ۱۴۷

شمیہ ۶۷
صحاح ستہ ۲۱۵
صدر یار جنگ (سوانح) ۱۳
صغری کبریٰ ۶۶
عروج سلطنت انگلشیہ ۳۴
علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۱۴، ۱۱۵
علی گڑھ میگزین ۴۶، ۵۰
عوارف المعارف ۸۲، ۱۴۸
غلام یحییٰ (رسالہ) ۶۵، ۶۶
قاضی مبارک (رسالہ) ۶۵، ۶۶
قال أقول (رسالہ) ۶۶
قانون تہذیب وانحطاط ۲۲
قطبی ۶۶، ۶۷
القول الفاصل بین الحق والباطل ۱۷۴
قیصر التاریخ ۳۴
کتاب الجزیہ ۶۸
گلزار ہند (اخبار) ۲۸۶
LIFE OF LORD LAWRENCE ۳۴
مجموعہ لکچرز واسپیچز نواب محسن الملک ۱۱۳
مختصر ۶۶
مختصر علامہ تفتازانی ۶۹
مخزن (رسالہ) ۲۸۵
مراسلات سنت وندوہ (رسالہ) ۱۷۵
مسلمانوں کا روشن مستقبل ۵۳
مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش ۴۵، ۵۱، ۷۱
مشیر ہند (اخبار) ۲۸۶
مضامین اربعہ ۱۲۵
مضامین ثلاثہ ۶۸
مطوّل ۶۶
معارف العوارف ۔ دیکھئے الثقافۃ الاسلامیہ
مفتاح سکاکی ۶۹
مقاصد ندوۃ العلماء اور اس کی مخالفت (رسالہ) ۹۰، ۱۷۴، ۱۷۵
مقامات حریری ۷۲، ۲۲۹
ملا جلال (رسالہ) ۶۶
ملا حسن (رسالہ) ۶۵، ۶۶، ۷۲
المنار (رسالہ) ۹۱، ۹۲
موج کوثر ۵۱
المؤید (رسالہ) ۱۳۵
میر زاہد رسالہ ۶۵، ۶۶
میر زاہد (رسالہ) ملا جلال ۶۶
میر قطبی ۶۶
میزان منطق ۶۶
نجم الاخبار ۷۳
الندوہ (رسالہ) ۶۷، ۱۲ ـ ۳۰۹
نزہۃ الخواطر ۶۴
نفحۃ الیمن ۷۳
نیر اعظم مراد آباد (رسالہ) ۲۸۶
وطن لاہور (اخبار) ۲۸۵، ۳۱۴
وکیل امرتسر (اخبار) ۲۴۷، ۲۸۶، ۳۱۱، ۳۱۴

مقامات

(الف)

اٹاوہ ۱۰۱، ۱۰۳

اٹلی ۳۹

آرہ ۱۲۲، ۲۰۲، ۲۶۳

اسپرنگس گارڈن (مدراس) ۳۱۸، ۲۹-۳۲۷

اسپین ۱۹

اسلام پور ۲۵۰، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۹

اسکاٹ لینڈ ۴۰، ۱۶۷

اعظم گڑھ ۱۶۸

آفاق باغ (لکھنؤ) ۲۱۱

افریقہ ۷۵، ۲۵۵، ۳۰۶

افغانستان ۲۵، ۲۷، ۳۰

اکوڑہ ۳۰

آگرہ ۱۷۰، ۲۶۳

الہ آباد ۲۸۲

الموڑہ ۲۰۷

انڈونیشیا ۵۷

امرتسر ۱۶۸، ۱۹۶، ۲۴۷، ۲۶۳، ۲۷۵، ۲۸۰
۸۷-۲۸۴، ۲۹۶، ۲۹۹، ۳۱۳، ۳۲۴

امروہہ ۳۹، ۲۲۱، ۲۴۱

امریکہ ۱۹، ۴۰، ۱۶۷

انگلستان۔ انگلینڈ ۲۳-۲۰، ۳۹، ۴۱، ۴۸

انور گنج (کانپور) ۱۷۱

آئرلینڈ ۴۰، ۱۶۷

اودھ ۱۳، ۱۳۴، ۱۴۲، ۱۵۸، ۲۲۸، ۲۳۵
۲۵۰، ۲۵۹، ۲۶۳

ایٹہ ۲۰۵

ایران ۳۰۲

ایشیا ۲۴، ۶۴، ۷۵

(ب)

بارہ بنکی ۱۵۵، ۱۷۱، ۲۱۵

بارہ دری (لکھنؤ) ۱۲۰، ۱۵۸

بالاکوٹ ۳۱

بانس بریلی ۱۳۵، ۱۵۳، ۱۵۴، ۲۸۱، ۳۱۵

بانکی پور ۱۸۳، ۲۲۲، ۲۳۸، ۲۴۵، ۲۴۶
۲۵۱، ۲۵۸، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۷۲

بدایوں ۱۶۸، ۲۲۱

بردہ حسن باڑی (لکھنؤ) ۲۱۱

ہدایہ ۸۷

ہدایۃ الاولیاء ۱۷۳، ۱۷۴

ہندوستانی مسلمان ۴۳

ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات (رسالہ) ۶۷

الہلال (اخبار) ۳۱۱

بریلی ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۲
۱۷۶، ۲۲۱، ۲۲۷، ۲۴۰
بستولی ۲۷۷
بغداد ۱۷۵، ۲۵۵
بکسر ۲۴
بلوچستان ۳۰، ۱۶۷
بمبئی ۲۰، ۲۴، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۷۵، ۱۹۸
۲۳۹، ۳۲۹
بنارس ۳۹، ۵۰
بنگال ۲۲ — ۲۰، ۲۷، ۴۰، ۲۶۲
بہار ۱۹۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۰
بھاگلپور ۲۴۷
بھڑوچ ۱۲۲
بھوپال ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۸۹، ۲۱۰، ۲۳۶، ۲۴۲
بھیکن پور ۱۳۴، ۲۳۰، ۲۴۷، ۲۹۲، ۲۹۸

(پ)

پانڈیچری ۱۹
پانی پت ۲۲۶، ۲۶۲
پٹنہ ۳۶، ۱۰۱، ۱۸۳، ۱۹۶، ۲۲۲، ۲۲۶، ۲۴۴
۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۶، ۲۵۸
۲۶۳، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۷۵، ۲۸۳
پرتگال ۱۹، ۲۰
پشاور ۳۰، ۱۸۶، ۲۸۵، ۲۸۶
پلاسی ۱۹، ۲۲، ۲۴، ۲۵
پٹنہ (علی گڑھ) ۲۱۵
پنجاب ۲۵، ۲۷، ۲۹، ۳۸، ۴۰، ۱۶۷
۱۸۳، ۱۹۰، ۲۲۲، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۶۳
۲۸۲، ۲۸۵ — ۸۷، ۳۱۴
پورٹ انڈمان ۳۶
پھلور ۲۲۶
پیلی بھیت ۲۲۱

(ت ٹ)

تبت ۱۶۷
ترکی ۲۳، ۲۴، ۲۷، ۷۶، ۹۸
تعلیہ ۱۹
تھانیسر ۳۶
تینام پیٹھ ۳۱۸، ۳۲۹
ٹھٹھ (سندھ) ۳۷
ٹیکم گڑھ ۲۸۶

(ج)

جالندھر ۱۹۶، ۲۲۶
جبل پور ۱۶۸، ۱۹۰
جدہ ۱۰۱
جنت البقیع (مدینہ منورہ) ۲۵۹
جھانسی ۱۰۱، ۱۰۲
جہانگیر آباد ۱۳۱، ۲۱۱

(چ)

چاٹگام ۲۶۲
چندوسی ۲۴۰
چندونگر ۱۹

چین ۱۹

(ح خ)

حجاز ۶۹، ۸۳، ۱۰۲

حیدرآباد۔ دکن ۲۵–۲۱، ۱۰۷، ۱۱۵، ۱۲۷، ۱۳۴، ۱۵۳، ۱۶۰، ۱۷۹، ۱۸۶، ۲۵۹، ۲۷۶، ۳۱۵، ۳۱۹، ۳۲۹

خاتون منزل (لکھنؤ) ۲۱۲

خمرہ پور ۲۳۷

(د ڈ)

دائرہ شاہ علم اللہ ۱۶، ۲۶

دتاولی ۱۵۵

درخیبر ۹۳۰

دربھنگہ ۱۵۵، ۱۷۶، ۲۱۳

دکن دیکھئے حیدرآباد

دمشق ۶۵، ۷۱

دہلی ۲۷–۲۴، ۲۹، ۳۳، ۳۵، ۳۸، ۴۴، ۴۸–۴۵، ۸۶، ۸۹، ۱۰۷، ۸۳، ۸۹–۱۸۷، ۹۴–۱۹۲، ۲۰۵–۷، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۲۵، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۵۹

دیوبند ۴۶–۴۳، ۵۵، ۶۱، ۱۰۱، ۱۲۲، ۲۱۵، ۲۱۷

دیوہ ۲۱۵

ڈھاکہ ۳۹، ۱۱۵، ۲۶۲

ڈیرہ غازی خاں ۲۲۲

(ر)

راجپوتانہ ۲۹، ۴۰، ۱۶۷

راس کماری ۱۶۷

رامپور ۱۰۱، ۱۲۸، ۱۶۲، ۲۳۳، ۲۴۴

رائے بریلی ۱۴، ۱۶، ۲۹، ۳۱، ۱۵۵، ۱۶۸

روس ۹۱

روم ۷۶، ۷۸، ۹۱، ۱۰۲

روہیلکھنڈ ۲۴، ۳۷، ۱۵۸، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۴۰

ریواڑی ۱۸۳

(س)

(صوبۂ) سرحد ۳۰–۲۷

سرنگاپٹنم ۲۳، ۲۵

سلام پور ۲۲۶

سلطانپور ۱۶۸

سمنہ ۱۰۰

سندھ ۳۰، ۳۷

سندیلہ ۱۳۳، ۲۱۱، ۲۵۹

سنگاپور ۱۶۷

سورت ۲۰

سون (ندی) ۲۴۵، ۲۴۶

سہارنپور ۲۱۷

(ش ص)

شام ۷۱، ۷۶، ۷۸، ۹۱، ۱۰۲، ۱۳۵، ۱۷۵، ۳۱۵

شاہ پور ۲۹۹

شاہجہاں آباد ۲۰۶

شاہجہانپور ۱۹۸، ۲۲۰، ۲۲۴–۲۲۲، ۲۲۸–۲۴۲، ۲۳۶–۲۴۲، ۲۵۰، ۲۵۷، ۲۷۷، ۲۸۳، ۲۹۲

شاہی مسجد لاہور ۲۷

شملہ ۱۹۰، ۱۹۶، ۲۴۲، ۲۶۳

صادق پور ۳۶

صومالی لینڈ ۳۰۶

(ع غ)

عالم اسلام ۹، ۴۳، ۵۲، ۵۴، ۵۸-۵۶، ۶۲-۶۰، ۷۰، ۷۶، ۷۸، ۷۹، ۹۲-۸۸، ۱۴۰، ۱۴۸، ۲۲۰

عدن ۳۰۵

عراق ۶۹

عرب ۱۳۵، ۲۷۳، ۳۰۷، ۳۱۵

عظیم آباد ۱۹۶، ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۶۳

علی گڑھ ۴۶، ۵۲-۴۸، ۵۵، ۵۹، ۸۹، ۹-۷، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۶۱، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۳۹، ۲۹۵

غازیپور ۱۷۸، ۱۸۳، ۱۸۴

غرناطہ ۲۵۵

(ف)

فتحپور ہنسوہ ۱۵۵، ۱۶۸

فرانس ۱۹، ۲۲، ۳۹

فرنگی محل ۶۴، ۱۳۳، ۲۲۸، ۲۴۳، ۲۸۱

فیض آباد ۲۱۱

(ق)

قازان ۹۱

قرطبہ ۲۵۵

قسطنطنیہ ۶۹، ۷۵، ۷۶، ۹۱

قطب ویلور ۳۱۶، ۳۱۷

قلزم ۶۸

قنوج ۳۹

قیصر باغ (لکھنؤ) ۱۲۰، ۱۵۸

(ک)

کاکوری ۲۲۵، ۲۴۴

کامران ۱۰۱

کانپور ۱۰، ۹۵، ۱۰۳، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۲۲، ۱۵۸، ۱۷۱، ۱۷۶، ۱۹۶، ۱۹۸، ۲۰۹، ۲۱۳، ۲۱۶، ۲۲۴، ۲۲۷-۲۸، ۲۸۴

کرناٹک ۱۹، ۲۱-۲۳

کرنال ۱۸۳

کشمیر ۳۱، ۱۱۵

کلکتہ ۲۰، ۲۷، ۳۸، ۶۶-۱۶۲، ۱۷۱، ۱۸۴-۸۷، ۳۰۵، ۳۱۱

کوئٹہ ۱۶۷

(گ)

گجرانوالہ ۲۲۶

گدیہ ۲۱۳

گردولی ۱۹۶

گنج مرادآباد ۲۱۶

گنگا (ندی) ۲۴۵، ۲۴۶

گوالیار ۲۸

گوڑگانواں ۱۸۳

گولہ گنج (لکھنؤ) ۲۱۲، ۲۲۹، ۲۳۱
گونڈہ ۲۴۰

(ل)

لال قلعہ (دہلی) ۴۶
لاہور ۲۷، ۳۰، ۳۶، ۳۸، ۱۳۰، ۱۸۳، ۱۸۷
۲۲۱، ۲۲۸، ۲۴۴، ۲۶۳، ۲۸۵، ۲۸۶
۲۹۰، ۳۰۶، ۳۲۹
لشکر گدا (بہار) ۱۹۶
لکھنؤ ۱۲، ۱۴، ۲۶، ۲۹، ۳۹، ۱۱۶، ۱۱۷
۱۲۶، ۱۳۱، ۱۵۳، ۱۵۸، ۱۷۶، ۱۸۷، ۱۹۴
۱۹۸_۱۳، ۲۰۵، ۲۱۷، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۸
۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹
۲۸۰، ۲۸۲، ۳۱۱
لندن ۲۰، ۲۲، ۳۲، ۳۹، ۲۹۹

(م)

مارواڑ ۳۰
مارہرہ ۲۱۵
مالوہ ۲۹
مٹیا محل (دہلی) ۱۸۸
مدراس ۲۰، ۲۴، ۴۰، ۳۰۹، ۱۹_۳۱۵
۳۲۸، ۳۲۹
مدینہ منورہ ۱۰۱، ۱۰۲، ۲۵۴، ۲۵۹
مرادآباد ۳۹، ۲۲۱، ۲۴۰، ۲۸۶
مراکش ۵۷
مسولی پٹنم ۲۰
مصر ۲۲، ۶۸، ۷۶، ۷۸، ۷۹، ۹۱، ۹۸، ۱۰۲
۱۳۵، ۱۵۷، ۱۹۲، ۲۷۳، ۳۰۲، ۳۱۵
مصری پور ۲۳۷
مکۂ معظمہ ۱۰۱، ۱۰۲
ملایا ۱۶۷
ملکہ پور ۱۰۱
مونگیر ۱۹۰، ۲۶۳
میرٹھ ۸۹، ۱۷۹، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۵، ۱۹۶
۲۰۳، ۲۳۶، ۲۸۲
میسور ۲۱، ۲۴

(ن و)

نجیب آباد ۱۰۱، ۱۰۲
نگینہ ۱۰۱
نیل (دریا) ۶۸
نینی تال ۱۹۱
وادی کافقان ۳۱
وزیرآباد ۲۲۶

(ہ)

ہگلی ۲۰
ہندوستان۔ کتاب کے اکثر صفحات میں
ہوتی مردان ۳۱۴
ہوشیارپور ۱۹۶

(ی)

یوپی ۳۲، ۳۸
یونان ۷۳، ۱۱۴، ۱۹۵، ۳۰۲

متفرقات

یورپ ۲۲-۱۷، ۴۰، ۵۶، ۵۷، ۷۴، ۷۵
۸۹، ۹۰، ۹۵-۴، ۳۰۲، ۳۲۲

مدارس و تعلیمی ادارے:

اسلامیہ اسکول جبل پور ۱۹۰
اورینٹیل کالج لاہور ۲۴۴
ایم۔اے۔او ہائی اسکول ۵۰، ۱۰۳
پریسیڈنسی کالج کلکتہ ۲۶۶، ۲۷۱
پریسیڈنسی کالج لاہور ۳۸
جامع ازہر قاہرہ ۶۹، ۷۷، ۷۸، ۹۱، ۱۴۸
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۴۸
دارالعلوم حیدرآباد ۳۱۹
دارالعلوم دیوبند ۴۳، ۴۶، ۵۵، ۶۴، ۱۰۳
۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۷
دارالعلوم ندوۃ العلماء ۱۲، ۸۰، ۸۱، ۹۶،
۱۱۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۵۰-۵۳، ۱۶۲، ۱۶۳
۱۸۷، ۱۹۲، ۱۹۴-۷، ۲۰۵، ۲۱۰-۳۱
۲۳۵، ۲۴۵-۴۱، ۲۵۱، ۲۵۶، ۲۵۷،
۲۶۳، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۶، ۲۸۲، ۲۸۳
۲۸۷، ۲۸۹، ۲۹۶، ۲۹۹، ۳۰۸، ۳۱۰
۳۱۲، ۳۲۳، ۳۲۹
دہلی کالج ۳۸، ۴۶
علی گڑھ کالج ۴۸، ۵۰، ۵۱، ۵۳، ۱۲۸، ۱۶۲
گورنمنٹ اسکول شاہجہانپور ۲۴۲
گورنمنٹ اسکول کانپور ۲۰۹، ۲۲۵
گورنمنٹ کالج بانکی پور ۲۴۵
مدرسہ احمدیہ آرہ ۱۲۲، ۱۲۸، ۲۰۲، ۲۶۳
مدرسہ اسلامیہ ڈیرہ غازی خاں ۲۲۲
مدرسۂ اسلامیہ دیوبند ۱۲۲
مدرسۂ اسلامیہ فتحپور ۹۶
مدرسۂ امدادیہ دربھنگہ ۱۷۶
مدرسۂ ٹیکم گڑھ ۲۸۶
مدرسۂ سلیمانیہ (ترکی) ۷۵
مدرسۂ عالیہ رامپور ۱۲۸، ۲۴۴
مدرسۂ عبدالرب دہلی ۱۸۹
مدرسۃ العلوم علی گڑھ ۴۸، ۴۹، ۵۲، ۵۵، ۱۰۲
مدرسۂ فاتح (ترکی) ۷۵
مدرسۂ فیض عام کانپور ۱۰، ۹۵، ۹۷، ۱۰۰
۱۰۳، ۱۰۵، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۲۴
مدرسۂ معینیہ درگاہ شریف اجمیر ۱۹۵
مدرسۂ نعمانیہ ۲۲۱
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۵۱، ۲۳۸، ۲۹۴
مظاہر علوم سہارنپور ۲۱۷
یتیم خانہ اسلامیہ اسکول انور گنج ۱۷۱

تحریکات وجماعتیں:

ایسٹ انڈیا کمپنی ۲۰، ۲۴، ۲۵، ۳۹

تبلیغی جماعت ۱۵۶

تحریک آزادی ہند ۵۱

تحریک خلافت ۵۱

تحریک دیوبند ۲۱۵

شدھی سنگٹھن تحریک ۹۴

علی گڑھ تحریک ۵۲-۴۹، ۶۰، ۶۱، ۱۳۴

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ ۱۰۸، ۱۰۹، ۲۲۸، ۲۳۲، ۲۵۸

ندوۃ العلماء (تحریک) تقریباً پوری کتاب میں

انجمنیں واشاعتی ادارے:

اصح المطابع ۲۲۰

انجمن استشار العلماء ۲۸۶

انجمن اسلامیہ امرتسر ۱۶۸، ۲۶۳

" " بدایوں ۲۸۷

" " بریلی ۱۶۸

" " بمبئی ۱۵۸

" " پنجاب ۱۷۵

" " جبل پور ۲۸۶

انجمن آل ہاشم رائے بریلی ۱۶۸

انجمن انوار محمدیہ امرتسر ۱۹۶

انجمن تعلقداران اودھ ۱۳، ۱۱۷، ۱۲۴، ۲۲۵، ۲۵۹

انجمن حامئ ندوۃ العلماء سلطانپور ۱۶۸

انجمن حمایت اسلام لاہور ۱۳۰، ۲۲۱، ۲۲۸، ۲۶۳، ۲۸۶

" " مونگیر ۱۹۰

" " بیوگان بارہ بنکی ۱۷۱، ۱۹۶

انجمن خادم علوم اسلامیہ ۲۲۱

انجمن معین الندوہ اسلام پور (پٹنہ) ۲۲۶

" " اورنگ آباد (گیا) ۲۰۴

" " پانی پت ۲۲۶، ۲۶۳

" " بانکی پور ۱۸۳، ۲۲۲، ۲۳۸، ۲۴۸، ۲۶۳

" " پٹنہ ۱۸۴، ۲۲۲

" " پھلور ۲۲۶

" " جالندھر ۲۲۶

" " دہلی ۱۸۳

" " ریواڑی ۱۸۳

" " شاہجہانپور ۲۲۲، ۲۲۶، ۲۴۲

" " شملہ ۲۴۳، ۲۶۳

" " عظیم آباد ۱۹۶

" " غازیپور ۱۸۳

" " کرنال ۱۸۳

" " کلکتہ ۲۶۳

" " لاہور ۱۸۳

" " مدراس ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۲۰

انجمن معین الندوہ مونگیر ۲۶۳
" " میرٹھ ۲۳۶
" " وزیرآباد ۲۲۶
انجمن نعمانیہ لاہور ۲۸۶،۲۶۳
دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۳۲۸،۳۱۹
دارالمصنفین اعظم گڑھ ۳۱۱،۶۵
مجلس تحقیقات ونشریات، رام لکھنؤ ۱۵
مجلس معین الندوہ بہار ۱۹۶
المجمع العلمی دمشق ۶۵
محمڈن یونین کلکتہ ۲۶۶
یتیم خانہ اسلامیہ کانپور ۱۷۱،۱۹۶،۲۰۴،۲۱۰
۲۲۶

معابد ودیگر متفرقات:

برنیری ٹرین چرچ (اسکاٹ لینڈ) ۱۴۰،۱۶۷
بیت اللہ شریف ۲۷،۲۵۹
رومن کیتھولک چرچ (آئرلینڈ) ۱۴۰،۱۶۷
غدر ۱۸۵۷ء ۲۳۲
کوٹلا والی مسجد (دہلی) ۸۹
میتھوڈیسٹ چرچ (امریکہ) ۱۴۰،۱۴۱،۱۶۷